تنہا

(ناول)

سلمیٰ اعوان

دوست پبلی کیشنز

اسلام آباد - لاہور - کراچی

ضابطہ

ISBN: 978-969-496-354-9

کتاب	:	تنہا
مصنفہ	:	سلمیٰ اعوان
موسم اشاعت	:	2009
سرورق	:	خالد رشید
مطبع	:	ورڈ میٹ، اسلام آباد
قیمت	:	350.00روپے

دوست پبلی کیشنز پلاٹ110، سٹریٹ15، I-9/2 ، پوسٹ بکس نمبر2958، اسلام آباد

فون: 051-4102784-5 E-mail: dostpub@comsats.net.pk

اُن بنگالی نوجوانوں کے نام

جنہیں پاکستان سے پیار تھا اور جو اُس

کی سالمیت کے لئے کٹ کٹ مرے۔

ایک شکایت ایک حکایت

انسانوں کی طرح کتابوں کا بھی نصیب ہوتا ہے۔ بعض کتابیں بڑی بخت آور ہوتی ہیں، ادھر لکھی گئیں اُدھر چھپ کر قارئین سے داد یا بیداد وصول کرنے منظر پر آ گئیں۔

اس لحاظ سے بیچاری ''تنہا'' کا کھاتا بڑا کربناک ہے۔ جون 1970ء میں ڈھاکا یونیورسٹی سے واپسی کے بعد اسے لکھنا شروع کیا۔ جنوری 1972ء میں یہ سنگِ میل پبلی کیشنز کے پاس گئی۔ جناب نیاز صاحب نے مسودہ میرے ہاتھوں میں واپس پکڑاتے ہوئے کہا۔

''بی بی! جیل جانے کا ارادہ نہیں میرا۔''

میں ہنسی۔ چلیے، مجھے بھجوا دیں وہاں۔ جیل جانا کون سا گھاٹے کا سودا ہے۔ ناموری ہو جاتی ہے۔ مگر نیاز صاحب مجھے یہ ناموری دینے کے حق میں نہ تھے۔ میرا سو اصرار اور ان کا ایک پکا انکار۔ بات کیسے بنتی۔

مسودہ جناب سعید لخت صاحب کے پاس پہنچا۔ انہوں نے مسودے کے نشان زدہ حصوں پر انگلی رکھی اور بولے۔ ''بس ان ان حصوں کو کاٹ دیں۔ فیروز سنز آپ کی کتاب چھاپ دے گا۔''

اس لمحے جناب سعید لخت مجھے اس سردار جی کی مانند نظر آئے تھے جس کے ہاتھ میں کرپان ہو اور جس نے ایک ہی وار میں حاملہ ماں کے پیٹ سے اُس کے بچے کو نکال کر تلوار کی سان پر چڑھالیا ہو۔

میں نے کچھ کہے بغیر مسودے کو سمیٹا اور اٹھتے ہوئے صرف اتنا کہا۔ ’’لخت صاحب! آپ کی تجویز پر عمل کرنے سے خون جگر بہہ جائے گا، فضلہ باقی بچے گا اور مجھے قاری کو فضلہ نہیں دینا۔‘‘

میرے قدموں نے اب مکتبہٗ جدید کی سیڑھیاں چڑھیں۔

علاؤالدین مظہر صاحب مرحوم نے ٹوپی میں چھپے آدھے ماتھے سے نیچے لشکارے مارتی آنکھوں سے مجھے دیکھ کر کہا۔

’’واللہ! کیا خوبصورت لکھا ہے۔‘‘

میرا دل منڈیر پر چکریاں کاٹتے اصیل مرغ کے پروں کی مانند پھول گیا۔ پر چند ہی لمحوں بعد یہ بھیگے پرندے کی مانند سکڑ گیا تھا۔

علاؤالدین مظہر صاحب رازدارانہ انداز میں بولے تھے۔

’’اپنے رامے صاحب حکومت میں ہیں نا!‘‘

میں نے بہتیرا کہا کہ اس میں حکومت کو ناراض کرنے والی کوئی بات نہیں، پر سُنے کون۔؟

اب میرا رابطہ مکتبہٗ عالیہ والوں سے ہوا۔ جمیل صاحب نے بڑی جی داری سے کہا۔

’’بڑی پیاری چیز ہے۔ ہم اس کا ایک لفظ نہیں کاٹیں گے۔ خوبصورتی سے پرنٹ کریں گے۔ تقریب رونمائی میں محمود علی (مشرقی پاکستان والے) کو بلائیں گے۔‘‘

چار چھ ماہ میں چکر لگتا۔ پتہ چلتا کاتب بڑا بیمار ہے۔ اس کا بیٹا ہسپتال میں ہے۔ اس کی بیوی فوت ہوگئی ہے۔ اس کی والدہ بیچاری پر فالج کا اٹیک ہوگیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

’’اللہ!‘‘ میں نے کہا۔ ’’کتاب بڑی منحوس لگتی ہے۔ کاتب کے تو خاندان کو لے ڈوبی

ہے، اب کہیں پبلشر کی باری نہ آ جائے۔''

1972ء سے 1977ء تک کے فاصلے میں کتابت کا جانکسل مرحلہ طے ہوا۔ کچھ آس بندھی، ستمبر کے آغاز میں پوچھا کہ کتاب تیار ہوگی؟ جواب ملا۔ ''کمال ہے! آپ نہیں جانتیں مارشل لاء لگ گیا ہے۔ بھلا کتاب کیسے چھپ سکتی ہے۔''

''حد ہے بھئی! مارشل لاء نے اُسے کیا کہنا ہے؟'' میں نے غصے سے کہا۔

''صاحب! ہم نے کاروبار تباہ نہیں کروانا۔'' جواب ملتا ہے۔

1980ء میں میں نے مسودہ مکتبہ عالیہ والوں سے لیا۔ 1981ء میں یہ اُردو ڈائجسٹ کے مدیر الطاف حسن قریشی کے پاس پہنچا۔ انہوں نے بھی صفحات دیکھے، پڑھے اور قدرے تذبذب کے بعد کہا۔

''تھوڑا سا انتظار کرلیں۔''

پروردگار! سچ لکھنا کیا اتنا بڑا جرم ہے؟'' میں نے اپنے آپ سے کہا۔

1982ء میں ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی سے بات ہوئی۔ انہوں نے حامی بھرلی۔

پھر کتاب چھپ گئی۔ بارہ سال بعد خدا نے روڑی کی سُن لی تھی۔

نامور ادیبوں، صحافیوں اور پڑھے لکھے لوگوں نے کتاب کی بہت پذیرائی کی لیکن اس احساس کا اظہار کم وبیش ہر فرد نے کیا کہ کاش یہ کتاب سقوطِ ڈھاکہ کے فوراً بعد چھپتی۔ اب آپ ہی مجھے بتائیں کہ میں کسے الزام دوں؟

نئے ایڈیشن میں بہت سی چیزوں کا اضافہ ہوا۔ اِسے نئے رنگ و آہنگ سے سجانے کی پوری کوشش کی گئی۔ عشرت سلیم کی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے اس کی اعرابی غلطیوں کی طرف توجہ کی۔

سلمٰی اعوان

اعوان ٹاؤن

ملتان روڈ لاہور: 042-5412848

0301-4038180

لخت لخت

ریس کورس روڈ پر ڈھاکا کلب مسکراتا ہے۔ کارڈ روم سے باہر آ کر یہاں سیڑھیوں پر ٹھہر کر ایک ٹک میں نے ماحول کے سحر کو دیکھا ہے۔ نیلگوں مدھم روشنی میں ڈوبے لاؤنج میں میزوں کے گرد بیٹھے خوش پوش لوگ پینے پلانے اور خوش گپیوں میں مگن ہیں۔ چاق و چوبند بیرے سروس کے لیے مستعد ہیں۔ اندر ایک انجانے پُراسرار سے گیت کی دُھن مدھم سروں میں بج رہی ہے۔ میری واقف بنگالی فیملی بال رُوم میں سیمبا ناچ ناچنے کے بعد پورٹیکو کے قریب کھڑی اب کچھ لوگوں سے محو گفتگو ہے۔ میں قریب پہنچتی ہوں۔ کاک ٹیل کا گلاس ہاتھ میں پکڑے مسز خان سے باتیں کرتا وہ لمبا تڑنگا نوجوان مجھ سے مخاطب ہوتا ہے۔

''لاہور خوبصورت جگہ ہے میں وہاں گیا تھا۔''

''اچھا''۔ میں کہتی ہوں۔

''میں نے واہگہ سیکٹر میں شہداء کی یادگاریں بھی دیکھی ہیں۔'' میں نے پھر مختصراً ''اچھا'' کہا ہے۔

بلوچ رجمنٹ کے نوجوانوں کا یہ پیغام پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے کہ ''عزیز ہم وطنو! جب آپ پاکستان کے مختلف علاقوں میں جائیں تو ہمارے بارے میں یہ بتانا نہ بھولیں کہ ہم نے اپنا آج آپ کے کل کے لیے قربان کر دیا ہے۔''

میں دلچسپی اور اشتیاق سے اس کی طرف دیکھتی ہوں اور پوچھتی ہوں۔ ''تو پھر آپ یہ پیغام لوگوں کو بتا رہے ہیں نا۔''

''اوہو! نہیں۔'' وہ کندھے اُچکاتا ہے۔ گردن سے کہیں نیچے پہنچے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ ''میں دراصل اس وقت امیچور تھا۔ بلوچ رجمنٹ ہمارے لیے نہیں ویسٹ پاکستان کے لیے شہید ہوئی تھی۔''

میں نے ہونٹوں کو سی لیا ہے کہ اس شاندار عمارت میں جہاں صرف قہقہے ہی سُنائی دیتے ہیں۔ اُونچے اُونچے بولنا اور سیاسی بحثیں کرنا بے حد معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ میری آنکھیں گیلی ہیں کہ میرا بس اُن پر ہی چلتا ہے۔

○○○

وہ مجھ سے کہتی ہے ''تم نے سُنا ہے؟ شری متی جی نے کہا ہے کہ جنت میں فرشتے کیوں لڑتے ہیں؟''

میں نے رنج سے اُسے دیکھا ہے اور سر جھکا لیا ہے۔ باہر آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے، بنگلہ اور اُردو پر جھگڑا ہو گیا ہے، مسلمان کا گلا مسلمان کاٹ رہا ہے۔

مجھے دربان پیغام دیتا ہے کہ آپ سے ملنے کوئی آیا ہے۔ میں نے حیرت سے سوچا ہے کہ اس قیامت کے سمے کون ہو سکتا ہے۔ ریسپشن رُوم میں تیرہ چودہ سالہ لڑکا مجھے نظر آتا ہے جو کہتا ہے ''میری ماں آپ کے ساتھ پڑھتی ہیں، مسز نیلما ابراہیم، انہوں نے مجھے بھیجا ہے کہ میں آپ کو یہ دے آؤں۔ معلوم نہیں حال میں آپ کو کھانے کو کچھ ملا ہے یا نہیں؟''

میں لفافے کو بغور دیکھتی ہوں، میرے سینے میں جذبات کا طوفان اُمنڈا ہے۔ باہر اور اندر کا یہ تفاوت میرے حساس ذہن کے ٹکڑے کر گیا ہے۔ میں نے اُمنڈتے آنسوؤں کو پی لیا ہے، پر میرا جی چاہا کہ میں اس خاکی لفافے کو سارے ڈھاکے میں گھما دوں۔

○○○

یہاں بیت المنیراہ میں مَیں حمیدہ پاپیا کے گھر کے سامنے پریشان کھڑی اُس سائیکل رکشے والے کو دیکھ رہی ہوں جو مجھ سے اُلجھ رہا ہے اور غصے سے کہہ رہا ہے کہ وہ ڈیڑھ روپے سے ایک پائی بھی کم نہیں لے گا۔ ’’ہم جانتے ہیں‘‘ وہ کہتا ہے۔

’’تُم پچھمی پاکستانی ہماری ساری پٹ سن سمیٹ کرلے جاتے ہو۔ ہماری چینگڑی ماچھ کا غذائیت سے بھرا سرتک نہیں چھوڑتے ہو، تم لوگ ظالم ہو۔‘‘

میرے حلق میں کڑواہٹ ہی کڑواہٹ ہے۔ دُکھ سے میں نے سوچا ہے کہ یہ سادہ لوح جاہل انسان جس کی دولت چینگڑی مچھلی ہے، کل اِس کا سر کھانے والے کا سر نہیں چھوڑے گا تو اور کیا کرے گا؟

○○○

کوریڈور کے آخری کونے میں کھڑی میں زار زار روتی ہوں۔ شدت گریہ سے میری آنکھیں جلنے لگی ہیں۔ عبدالمالک زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا ہے عبدالمالک جو میرا رشتہ دار نہیں، میرا عزیز نہیں، جس سے میں ابھی تک ملی بھی نہیں۔ پر وہ میری متاع تھی۔ میری قوم کی گراں قدر متاع کہ وہ دُشمنانِ دین و وطن عناصر کے خلاف سیسہ پلائی دیوار بنا ہوا تھا۔ اِس دیوار کو ٹی۔ ایس۔ سی سینٹر میں عوامی لیگی غنڈوں نے توڑ ڈالا تھا۔

حُب الوطنی کے چند دیوں میں سے ایک اور بجھ گیا ہے۔ اندھیرے بڑھ رہے ہیں۔ معلوم نہیں یہ کس کس کو نگلیں گے؟

○○○

1947ء میں وہ روتی تھی، تب اس نے کہا ’’سوتیا! تُم ایک دن یہ ضرور سنوگی کہ ٹکڑے کرنے والوں کے ٹکڑے کر دیے گئے ہیں۔ شکست سے سبق سیکھنا پڑتا ہے اور ہم نے سیکھنے کا عزم کرلیا ہے۔‘‘

اور آج میں روتی ہوں۔ ڈھاکا چھن گیا ہے۔ زندگی کے معمولات میں کوئی فرق نہیں۔ میں نے اپنے دائیں بائیں دیکھا ہے۔ یہاں کوئی نہیں جو مجھے یہ کہے کہ روتی کاہے کو ہو؟ عزم ہونا چاہیے۔ ٹوٹے ہوؤں کو جوڑا بھی جاسکتا ہے۔ میرا باپ اور میرا اکلوتا بھائی اپنے کاروبار میں بے طرح منہمک ہیں اور منگیتر پرموشن کے امتحانوں کی تیاری میں۔

○○○

وہ اپنے آراستہ پیراستہ گھر میں کسی مہارانی کی طرح رہتی تھی۔ وہ جو ماچھ بھات کھاتی تھی۔ ابوالاعلیٰؒ کی کتابوں کو اٹک اٹک کر پڑھتی تھی۔ نواکھالی کی کٹھن بنگلہ بولتی تھی۔ وہ جو روٹی کھانے، لسّی پینے اور پنجابی بولنے والوں سے بہت پیار کرتی تھی، وہ جسے لاہور آنے کی بہت تمنا تھی۔

میری آنکھیں ڈبڈبا اُٹھی ہیں کہ میں نے اُسے لاہور کے ایک ٹوٹے پھوٹے گھر میں ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر ہاتھ سے پنکھا جھلتے دیکھا ہے۔ آنسو اُس کی آنکھوں سے خشک ہیں۔ ایک نظر اُس نے کھڑکی سے باہر اُگے سبزے پر ڈالی ہے اور کہا ہے۔

''لاہور تو میں آنا چاہتی تھی پر ایسے نہیں جیسے آئی ہوں۔''

وہ پھر خاموش ہے دیر بعد اُس نے کہا ہے۔ ''تم میرے جذبات کو شاید سمجھ ہی نہ سکو۔ زمین کا وہ ایک خاص قطعہ جس میں وہ صدیوں سے رہتا چلا آیا ہو، جس سے اُس کے ذہنی و جذباتی رشتے وابستہ ہوں اور وہ اُسے اپنا اور بالکل اپنا سمجھتا ہو۔ پر ایک دن ایکا ایکی اُس کے سارے رشتے اُس سے ٹوٹ جاتے ہیں اور اپنی جان بچانے کے لیے اُسے ان دیکھی جگہوں کی طرف بھاگنا پڑتا ہے۔''

اور میں نے رندھے گلے اور برستی آنکھوں سے سوچا ہے کہ اگر میرے ساتھ ایسا ہو......

میرے دل کی گہرائیوں سے صرف یہ دعا نکلی ہے۔

''یہ ٹکڑا میرے معبود! ابد تک قائم رہے۔''

وہ فوجی افسر اس سمے سخت الجھن میں تھا کہ الف ب سے کوری اپنی اس بھاوج، جسے وہ بھاوج تو کم اور ماں زیادہ سمجھتا ہے، کو کیوں کر سمجھائے کہ پھول دار گلابی ٹیونک کو دونوں ہاتھوں سے مسلتی یہ لڑکی پرابلم چائلڈ ثابت ہو رہی ہے اور ڈنڈا سوٹا اس کے لیے بیکار ہے۔

کھرے بان کی چارپائی پر بیٹھی، وہ بھی جن کے کندھے ذمہ داریوں کے بوجھ تلے جھکے ہوئے تھے، اپنی سوچ میں کسی حد تک حق بجانب تھیں۔ اب اگر انہوں نے ''ڈیوی'' کو پڑھا ہوتا تو یقیناً اپنی لڑکی کی الٹی پلٹی حرکتوں سے اس حد تک ہراساں نہ ہوتیں۔

انہوں نے اپنے دیور کو ایک نظر دیکھا۔ وہ خاکی وردی میں ان کے سامنے تیار کھڑا تھا۔ انہیں یاد آیا کہ اسے ڈیوٹی پر جانا ہے۔ تب وہ ٹھیٹ پنجابی لہجے میں محبت سے بولیں۔

''جاؤ اللہ کی حفاظت میں۔ کام پر وقت سے پہلے پہنچتے ہیں۔''

ڈیوڑھی کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے کہا...... ''بی بی جان! اسے مارنا نہیں!''

انہوں نے رُخ پھیر کر کچھ فاصلے پر کھڑی اپنی لڑکی کو دیکھا جو ٹیونک کو بلاوجہ ہی مسلے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں طمانیت تھی۔ ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ۔ اور وہ انہیں اس سکون

سے دیکھ رہی تھی جیسے اس کی ماں اس کے چچا سے ہمسایوں کے کسی شیطان بچے کا ذکر کر رہی ہو یا پھر روزمرہ کی طرح آٹے گھی کی مہنگائی کا رونا رو رہی ہو۔

وہ غصے سے تلملائیں اور بولیں...... ''محسن! میں کہوں تم لوگوں کے انہی چونچلوں نے تو اس کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ دماغ خراب تو ہونا ہی ہے ابھی کا۔ اسکول میں باجہ بجتے دیکھتی ہے تو کہتی ہے میں نے ویسا ہی خریدنا ہے۔ ہمسایوں کے ہاں کتا دیکھ آتی ہے تو پاؤں پسار لیتی ہے کہ مجھے یہ بھی چاہیے۔ اس گھر میں یہ کیا انوکھا پڑھنے لگی ہے۔ تم لوگ بھی تو بچے تھے۔ تم لوگوں نے بھی تو پڑھا ہے۔ ایک یہ ہے کہ فرمائشیں ہی ختم نہیں ہوتیں۔ آج اسے یہ چاہیے کل وہ۔ ہر وقت ناچتی تھرکتی رہتی ہے۔ کسی پل چین نہیں۔ جانے اللہ نے کیا پارہ بھر دیا ہے۔ اِس کو مار، اُس کو پیٹ، سارا محلہ نالاں ہے۔ لو! یہ کاپی دیکھ لو۔ پرسوں ہی لا کر دی تھی نا تم نے؟ کیا حشر کر ڈالا ہے اس کا۔ باوا سر پر نہیں اور بیٹی یوں پیسہ اڑاتی ہے جیسے وہ کوئی خزانہ چھوڑ گیا ہو۔''

وہ جاتے جاتے واپس پلٹا اور جب اس نے کاپی دیکھی تو حیران رہ گیا۔ نئی کاپی کا گتہ ڈھلک ڈھلک پڑ رہا تھا۔ اندر چند ہی ورق تھے، باقی سب پھاڑے ہوئے تھے۔

''ارے بیٹے یہ کیا کیا؟''......اس نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے قریب کیا۔

اور اپنے چچا کے پاس آ کر وہ شوخی سے مسکرائی اور اطمینان سے بولی! چاچو جانی......

''مجھ سے اچھا نہیں لکھا جا رہا تھا۔''

وہ ہنس دیا۔ جھک کر اس نے اس کے شہابی رخساروں پر باری باری پیار کیا اور بولا...... ''یہ بہت بری بات ہے۔''

شدید غصے کے باوجود اس کی بھاوج بھی مسکرا دیں اور بولیں...... ''بس اب جاؤ کیسے نہ بگڑے گی وہ۔''

اور جب اس کا وہ گھنگریالے بالوں والا چچا اسے گھر سے اگلے موڑ پر اتار کر آگے بڑھ گیا تو وہ وہاں کھڑی اُسے اُس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ اور اس کی گہری ہری سائیکل

اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی۔

گھر واپس آتے ہوئے اس نے ہر روز کی طرح یہ سوچا...... کہ اس کی بی بی جان اور ماں جی کیسی ہیں۔لٹھ لیے ہر وقت اسی کے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔

یوں اس بارہ سالہ لڑکی کی بعض عادتیں تھیں بھی بہت نرالی۔

گھر کے بیرونی تھڑے پر بیٹھ کر جب وہ اپنی ماں اور دادی کو جی بھر کر کوس چکی تو اٹھ کر اندر آ گئی۔

صفائی ہو چکی تھی۔ برآمدہ چمک رہا تھا، مہترانی نے پُچارا شاید ابھی ابھی پھیرا تھا تبھی ہلکی ہلکی ٹھنڈک کا احساس ہو رہا تھا۔خنکی کی لہر تلوؤں کو چھوتی ہوئی سارے بدن میں پھیل گئی تھی۔

سامنے آنگن میں بچھا جہازی پلنگ خالی تھا۔ نیلے اور سفید چیک کی شکنوں سے بھری چادر یہ بتا رہی تھی کہ وہ بھاری بھرکم وجود ابھی یہاں سے اٹھ کر گیا ہے۔

وہیں فرش پر وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی یوں جیسے کوئی سنگھاسن پر آسن جمائے ہو۔

''مزہ آئے جو اس ٹھنڈے ٹھنڈے فرش پر ٹانگیں پسار کر سویا جائے۔''......اس نے سوچا۔ پر اگلے لمحے وہ خود سے کہہ رہی تھی......''توبہ میری جویوں میں کہیں سو جاؤں اور وہ دونوں مجھے دیکھ لیں جو اس وقت اندر بیٹھی پنکھے کی ہوا کھا رہی ہیں تو بس میرا فضیحتا ہی کر ڈالیں۔ یہ ماں جی تو اور بھی عجیب ہیں۔ ہر وقت چیختی رہتی ہیں۔گلا بھی نہیں دکھتا ان کا۔اور وہ ہماری بی بی جان جانے ان سے اتنا کیوں ڈرتی ہیں، کوئی بات ہے بھلا!''

دھوپ کافی نیچے اتر آئی تھی۔اس نے بیزاری سے منڈیر کو دیکھا......''لو اب حبس ہی حبس ہو جائے گا۔یہ گرمی بھی ایک مصیبت ہے۔''

تبھی وہ چونکی۔اس نے باورچی خانے کی طرف دیکھا جہاں سے خاص قسم کی خوشبو نکل کر انگنائی میں پھیل رہی تھی۔اپنی طرف آتی مہک کو اس نے لمبے لمبے سانس لے کر نتھنوں میں

سمیٹنے کی کوشش کی۔

''مچھلی پک رہی ہے۔ آج کیا نذرل چچا آنے والے ہیں؟ محسن چچا نے تو بتایا ہی نہیں۔''

اس کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ وہ تھی بھی تو بہت ندیدی اور اب یہاں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اسے اُٹھ کر باورچی خانے کا ایک چکر لگانا چاہیے شاید کچھ کام بن جائے۔ پر وہ اٹھتے اٹھتے بھی بیٹھ گئی۔ کچن کی جالی سے ایک سفید دوپٹہ لہرایا تھا، اس کے منہ میں دوڑتا پھرتا ڈھیر سارا پانی دوپٹے کی ایک ہی جھلک سے بہت نیچے اتر گیا تھا۔ افسردگی سے اس نے اپنے سامنے دیکھا اور بولی۔ ''میں تو یونہی بھلی۔ مچھلی کا ایک قتلہ مانگوں اور بی بی جان کی کھٹی میٹھی باتیں سنوں۔''

کچھ دیر وہ وہاں بیٹھی رہی، پھر اٹھ کر ساتھ والوں کے گھر چل دی۔ چلو کچھ دیر جیکی سے کھیلا جائے! اس نے سوچا۔

اس گھرانے کے کسی بھی فرد سے اسے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ بس یہاں ایک چیز اس کے لیے بہت پُرکشش تھی اور وہ سنہرے بالوں اور چمکتی آنکھوں والی جیکی تھی۔ اسے اپنے گھر رکھنے کے لیے اس نے بہت واویلا مچایا پر اس کی ایک نہ چلی۔ ماں جی کیسے تڑخ کر بولی تھیں۔ ''لو اور سنو! اب یہ کتے بلیاں پالے گی۔ آج تک اس گھر میں ایسے نکمے شوق کسی نے کیے نہیں۔''

''نی کڑیے!''

وہ اس کی ماں سے مخاطب ہوئیں...... ''لاڈ پیار میں اس کا ستیاناس نہ کر!''

وہ تھوڑی دیر بولتی رہیں۔ پھر جانے کیا سوچ کر اسے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ دونوں مٹھیوں سے گیلی آنکھوں کو مسلتے ہوئے اس نے اپنے کندھے اچکائے، کسی قدر غصے سے انہیں دیکھا جو آدھے پلنگ پر بیٹھی تھیں اور منہ پھیر کر بولی:

''میں نہیں آتی!''

بی بی جان نے بازو سے پکڑ کر ان کے قریب پائنتی پر ٹکا دیا۔ اس نے اٹھنا چاہا تو ان کا ایک دو ہتڑ اس کی پیٹھ پر پڑا...... ''بیٹھتی ہو کہ نہیں'' ......وہ بولیں۔

تب ماں جی نے بہت پیار اور نرمی سے اسے سمجھانا شروع کیا۔

''دیکھو بیٹے کتا نجس چیز ہے۔ مسلمانوں کو اسے اپنے گھروں میں نہیں رکھنا چاہیے۔ یہ اگر گھر میں رہے تو رحمت کے فرشتے اور دولت نہیں آتی۔''

''لو کیسی بے ڈھنگی بات ہے۔ اس نے اپنے دل میں سوچا اور پھر بی بی جان کی طرف دیکھتے ہوئے پھٹ سے بولی۔ ''آپ جھوٹ بولتی ہیں ماں جی! فوزیہ اور خالد کے گھروں میں بھی تو کتے ہیں پر ان کے ہاں کاریں ہیں، نوکر ہیں اور بھی ڈھیر ساری چیزیں ہیں۔ ہمارے ہاں کیا ہے؟''

عینک کے دبیز شیشوں سے اسے بہت تشویش سے دیکھا گیا۔ یوں جیسے کہا جائے کہ اتنی گستاخی، اتنی بدتمیزی۔ پھر جیسے انہوں نے آنکھوں سے فکرمندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تو تارے دکھائے گی ایک دن۔ لڑکی ذات کا کیا کام بڑوں کے سامنے یوں پٹر پٹر بولنا۔''

اور بی بی جان نے غصے میں آ کر اس کی خوب ٹھکائی کی۔

وہ جیکی کو اپنے گھر تو نہ لا سکی پر اس سے کھیلنا بھی ختم نہ ہوا۔ جب بھی موقع ملتا ہمسایوں کے گھر چلی جاتی۔

اس وقت بھی وہ اس سے کھیلنے یہاں آئی تھی۔ پر یہ آرزو پوری ہوتی نظر نہ آ رہی تھی۔ امرود کے درخت کے نیچے بیٹھا گڈو اپنی چھوٹی بہنوں اور جیکی کے ساتھ اون سم سنڈے مارننگ (On some Sunday morning) کھیل رہا تھا۔

''ارے تو میں اس سے نہیں کھیل سکوں گی۔'' ...... پاؤں غصے سے فرش پر پٹختے ہوئے وہ خود سے بڑبڑائی۔

تب ایک دم اس کا جی چاہا کہ وہ اس بونگے گڈو کے دو جھانپڑ لگائے اور جیکی کی زنجیر

پکڑ کر باہر بھاگ جائے۔

پر وہ سخت بددل ہوئی۔ جب اسے یاد آیا کہ یہ کمبخت گڈو گلا بھی تو اتنا پھاڑتا ہے۔ جو اس نے یوں کیا تو وہ چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لے گا۔ اور وہ اس کے لمبے لمبے ہاتھ پاؤں والے بھائی تو پلک جھپکتے میں اسے پکڑ لیں گے۔

نہیں بابا۔ ابھی صبح صبح تو اتنی جھڑکیاں کھائی ہیں۔ بی بی جان کو علم ہو گیا تو گھر میں گھسنے نہیں دیں گی۔

تب اس نے شریف بچوں کی طرح خاموشی سے واپس جانے کا ارادہ کیا۔

پر وہ جاتے جاتے رکی۔ فوزیہ نے اسے ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے دیکھ لیا تھا اور آواز بھی دے ڈالی تھی۔

فوزیہ ان دنوں کسی میوزک ماسٹر سے پیانو بجانا سیکھ رہی تھی۔ جس کا ذکر اس نے اترا اترا کر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی یہ اتراہٹ اسے زہر لگی۔

''اللہ کرے تم تو مر ہی جاؤ۔ یہ سب کچھ تم مجھے جلانے کے لیے سنا رہی ہو کیونکہ تمہیں معلوم ہے کہ مجھے بھی پیانو سیکھنے کا بہت شوق ہے اور میرے گھر والے مانتے نہیں۔ بھاڑ میں جاؤ تم اور جہنم میں جائے تمہارا پیانو۔ مجھے کیا سنا رہی ہو'' اس نے کڑھ کر اپنے آپ کو کوسا اور ساتھ ہی اپنے گھر والوں کو بھی ''کیتے بور ہیں اللہ۔ یہ ماں جی اور بی بی جان تو ایک عذاب ہیں۔ میری تو ہر بات سے انہیں چڑ ہے۔ کوئی پوچھے پیانو بجانا بری بات ہے۔ کتنا اچھا لگتا ہے جب مس ولسن اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے بجاتی ہیں۔ بس سو جانے کو جی چاہتا ہے۔''

وہ اکتائی اور جانے کے لیے اٹھ گئی۔

اور جب وہ دیوار پھاند کر اپنے حصے میں آئی تو اسی مخصوص خوشبو نے اسے بے کل سا کر دیا۔ باورچی خانے کی پچھلی کھڑکی سے اس نے چور آنکھوں سے اندر کا جائزہ لیا بی بی جان نہیں تھیں۔ ''اے نصیراں، ایک قتلہ دے دو نا۔''

اور نصیراں اسے سلاخوں سے لٹکتے داہنا ہاتھ اندر کی طرف پھیلائے بندر کی طرح جھولتے دیکھ کر بہت ہنسی۔ وہ جانتی تھی یہ بہت چٹوری ہے۔ دوں گی نہیں تو جان چھوٹنی مشکل ہے۔

جون کا سورج سویرے سے ہی آگ برسانے لگا تھا۔ وہ پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ پشت یوں جل رہی تھی جیسے کسی نے جلتا توا ساتھ چپکا دیا ہو، ناک بہہ رہی تھی اور وہ سڑ سڑ کرتی ناک کو لمبے سانس سے اوپر لے جاتی۔ چٹخارہ بھرتی اور نرم نرم مچھلی کا گودا منہ میں ڈال کر فراک کی آستین سے رخساروں پر بہتا پسینہ پونچھنے میں لگ جاتی۔

چھاؤنی کی یہ شفاف اور فراخ سڑک جس کے سینے پر میری جیپ اس وقت تیز رفتاری سے دوڑ رہی ہے، ایلکن روڈ کہلاتی ہے اور میں آفیسرز میس جانے کی بجائے وہاں جا رہا ہوں جہاں جانے کی مجھے ہمیشہ تمنا رہتی ہے۔ ہر دو حالتوں میں جب میں خوش ہوتا ہوں یا مجھ پر اُداسی طاری ہو۔ میرے نزدیک بیٹھا یہ سرخ وسفید پنجابی نوجوان میری قریبی نشست کی طرح میرے دل کے بھی اتنا ہی قریب ہے۔ یہ اس وقت میری ہی طرح کی گرمائی یونیفارم میں ہے۔ اسٹیرنگ پر اس کے مضبوط ہاتھ جمے ہیں اور وہ مہارت سے موڑ کاٹ رہا ہے۔ کھڑکی سے آتی لُو جِلد کو جھلسائے دے رہی ہے۔ یہ شہر جو تاریخ کا دل ہے، جس کے چپے چپے پر تاریخ کی داستانیں بکھری پڑی ہیں۔ یہ جو سینکڑوں بار اجڑا اور بسا ہے۔ اس کے در و دیوار پر اس موسم میں کتنی اُداسی اور ویرانی ٹپکتی ہے۔ سوچتا ہوں یہ میں ہوں جسے یہ سب عجیب نظر نہیں آتا۔ میں جس نے دریاؤں کی آغوش میں آنکھ کھولی، ہریالیوں کی گود میں پروان چڑھا اور جو اس شدید گرمی سردی کا عادی نہیں پھر بھی ہر چیز جانی پہچانی لگتی ہے۔ ایک اٹوٹ روحانی رشتہ ان سب پر پھیلا نظر آتا ہے۔ میں جانتا ہوں ایسا کیوں ہے۔ اس سرزمین کا حصول ہماری زندگی تھا اور اس کی

حفاظت اب میر انصب العین۔

یہ سب وہ سوچ رہا تھا جس کے شانوں پر چار ستارے چمک رہے تھے اور جسے لوگ فرسٹ لیفٹیننٹ نذرُل اسلام کے نام سے جانتے تھے۔

''آؤ نذرُل!''...... چھ فٹ کے نوجوان نے جس کا نام محسن تھا جیپ کو ایک پختہ کشادہ مکان کے سامنے روک کراترتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور کھٹاک سے بند کرتے ہوئے ڈیوڑھی میں آ گیا۔ وزنی بوٹوں نے برآمدے میں تھوڑا سا شور پیدا کیا۔

اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں ایک معنی خیز چمک اُبھری وہ اپنے سرخ وسفید ساتھی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ کافی دنوں بعد یہاں آیا تھا اور اب کمرے کی ترتیب یکسر بدلی ہوئی دیکھ رہا تھا۔ کچھ نئی چیزوں کا اضافہ بھی ہو گیا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ آج کل اس گھر میں محسن کی کزن جو اس کی بھابھی کی چھوٹی بہن ہے گریجوایشن کے لیے آئی ہوئی ہے اور محسن جیسے لا اُبالی انسان کا کمرہ جو ہمیشہ ہی بہت الٹ پلٹ حالت میں ہوتا ہے۔ اب بہت صاف رہتا ہے۔ محسن آج کل بہت خوش ہے اور اکثر اس کی باتیں کرتا ہے۔

وزنی بوٹ اور جرابیں اتارتے سمے اس نے ٹھہر ٹھہر کر دھیمے سے مسکراتے ہوئے یہ سب سوچا تھا۔

''تم غسل سے فارغ ہو جاؤ پھر کھانا کھاتے ہیں۔''...... محسن نے اسے اطلاع دی۔

''مشرقی پاکستان کا میدانی حصہ اس کے کل رقبے کا نوے فیصد ہے۔ اس علاقے کے تین مشہور دریا گنگا، برہم پتر اور میگھنا ہیں۔ یہ تینوں مل کر دنیا کا سب سے بڑا ڈیلٹا بناتے ہیں۔''

یہ بہت تیز اور لمبی آواز تھی جو کمرے سے نکل کر برآمدے اور صحن میں پھیلی تھی۔......

''گڈ گاڈ۔ انگلش سکولوں میں یوں رٹوایا جاتا ہے۔''...... اس نے میز پر برتن لگاتے ہوئے مسکرا

کر خود سے کہا تھا۔ جس کے اس گھر میں آ جانے سے محسن بہت خوش تھا۔ پر اس کا تلفظ کس قدر صاف ستھرا ہے۔ مجھ ایسی گھوڑا کی گھوڑا بی اے تک پہنچ گئی ہے۔ پر کہیں اس خوبصورتی سے پڑھ سکتی ہے!''

''گدھی نے پھر گھوٹا بازی شروع کر دی ہے۔'' محسن بھاوج کی طرف دیکھ کر ہنسا۔

''کمبخت کی آواز ہے کہ صورِ اسرافیل۔''...... بی بی جان تلخی سے بولیں۔

''شاید اسے ابھی نذرل کے آنے کا علم نہیں ہوا۔''...... محسن نے ماں جی کی طرف دیکھا۔

''اچھا ہی ہے ورنہ اس کے کندھوں پر یوں سوار ہو جائے گی کہ بیچارے کا کھانا بھی حرام ہو جائے گا۔''...... ماں جی خاصی بیزار نظر آ رہی تھیں۔

اور وہ لڑکی جس کی آواز کانوں کے پردے پھاڑتی گزرتی، چار لائنیں بھی یاد نہ کر پائی تھی کہ تھک بھی گئی۔ اس کا گلا خشک ہونے لگا۔ ایک جھٹکے سے اس نے اپنی دونوں ٹانگیں دری پر پھیلا دیں۔ آسودگی کا ہلکا سا احساس ہوا تو آموختہ دہرانے کی کوشش کی۔ پر وہاں کیا تھا، ذہن نے تو اپنے سبھی کواڑ، کھڑکیاں یوں بند کر لی تھیں کہ ایک درز بھی نہ چھوڑی۔ بھلا ایسے میں کوئی لفظ کیسے اندر گھستا؟

''ارے۔ یہ تاریخ جغرافیہ۔ اس کا پارہ چڑھ گیا۔ جی چاہتا ہے کتاب چیر کر نصیراں کو دے آؤں۔ صبح جو وہ آگ جلانے کے لیے اتنا ڈھیر سارا تیل لکڑیوں پر انڈیل کر ضائع کر دیتی ہے تو اس سے کام چلا لے۔ معلوم نہیں آج مجھے کیا ہو گیا ہے؟ وہ شیریں اللہ جانے کیسے رٹتی ہے؟ سسٹر پوچھتی ہے تو اس کا ہاتھ سب سے اونچا ہوتا ہے۔ کیسے قینچی کی طرح زبان چلتی ہے؟ آج کا میرا دن یونہی فضول گیا۔ کوئی پوچھے میں نے کیا کِیا ہے؟ ہائے، جیکی سے بھی نہیں کھیل سکی۔

''بھاڑ میں جائے سب۔''...... اس نے بھنا کر کتاب دور پھینکی۔ جو میز سے ٹکراتی دھم سے زمین پر آ گری...... ''لعنت ہے ایسے سبق پر جو یاد ہونے کا نام نہ لے۔''...... وہ لیٹ گئی۔

پہلو دائیں بائیں بدلتے ہوئے سنے سنائے گیتوں کی ٹانگیں توڑتی رہی۔

دیر بعد جب اسے یاد آیا کہ اس کا سکول تین دن بند رہنے کے بعد کل کھل رہا ہے اور سسٹر سموئیل سبق نہ آنے پر اس کا بھرتہ بنا دے گی تو اس کا دل آپ ہی آپ ڈوبنے لگا۔

اس دن جب سسٹر ریکسٹن انہیں ''ایڈونچرز آف یولیسز'' کا پہلا پارٹ پڑھا رہی تھیں اور وہ سبق پر توجہ دینے کی بجائے دیوہیکل پولوفیس کی تصویر بغور دیکھ رہی تھی تب ایکا ایکی عبادت خانے کی گھنٹیاں بجنے لگیں اور سسٹر ریکسٹن اپنے سفید لبادے اور کمر کے گرد لٹکتی ہوئی سنہری زنجیر کو سنبھالتی باہر نکل گئیں۔

اور خاموشی سے عبادت خانے کی طرف جاتے ہوئے اسے معلوم ہوا کہ سُپر مدر راجرز کا انتقال ہو گیا ہے۔ عبادت خانے میں جب وہ بخشش کی دعائیں پڑھ چکی اور اس نے O come let us adore her بھی دھیمے دھیمے گا لیا تو اسے خیال آیا کہ خداوند خدا مقدس باپ کو غلطی لگی۔ مرنا تو سسٹر سموئیل کو چاہیے تھا۔ اتنی کالی ہیں اور غصے بھی بہت ہوتی ہیں پر مر گئیں بیچاری سُپر مدر راجرز۔

وہ کتاب اٹھا کر لائی اور پھر سے جٹ گئی...... ''مشرقی پاکستان کا میدانی حصہ اس کے کل رقبے کا'' ......

اور عین اس وقت وہ غسل سے فارغ ہو کر نشست گاہ میں آیا۔ اس کی گھنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں تلے ہونٹ فراخدلی سے مسکرائے۔

''اس علاقے کے تین مشہور دریا گنگا، برہم پتر اور میگھنا ہیں۔'' ...... آواز اب پھر تیز اور اونچی ہو رہی تھی۔

برہم پتر اور جمونا میرے پرانے ساتھی...... وہ ڈوبا، ابھرا اور پھر ڈوبا۔ باریسال کے ساحل سے تو اسے عشق تھا۔ صاحب رائے سے نوکے (کشتی) کو روز کھے کر ساحل تک لانے میں اسے کبھی دقت محسوس نہ ہوئی تھی اور جزیروں کی اس چھوٹی سی بستی میں جہاں پانی نسبتاً کم گہرا ہوتا

وہ مچھلیاں پکڑا کرتا اور ان کے جال میں پھنس جانے پر نو کے میں اچھلا کرتا۔

عجیب سی بے چینی اس پر طاری ہوئی۔ دل کی دھڑکنوں کے بہت قریب بسنے والا کوئی یاد آیا۔

''باریسال پہنچے ہو کیا؟''...... محسن اسے کمرے کے وسط میں یوں اضطراری حالت میں کھڑے دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ اسے گھر یاد آ رہا ہے۔

''کبھی کبھی یہ دوری بہت کھلنے لگتی ہے۔'' وہ اُداسی سے مسکرایا۔ تب محسن نے بھتیجی کو آواز دی۔ وہ اس کی اداسی کم کرنا چاہتا تھا۔

وہ رکی۔ نگاہیں اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے آواز اندر داخل ہوئی تھی۔

محسن چچا ڈیوٹی سے آ گئے ہیں۔ وہ خود سے بولی اور ڈرائنگ روم کی طرف بھاگی۔

''نذرُل چچا''......اس لڑکی کی آنکھیں خوشی سے چمکیں جو کتھئی پھولدار فراک پہنے تھی۔ وہ سیدھی آئی اور اس کے پھیلے بازوؤں میں گر گئی۔ اس کی براق سی پیشانی پر اس نے شفقت سے بوسہ دیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تم تو پاگلوں کی طرح سبق رٹتی ہو۔''

اور وہ بھی بہت ڈھٹائی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

''نذرُل چچا! یہ تاریخ جغرافیہ اللہ قسم زہر لگتا ہے ہمیں۔ بس جی چاہتا ہے کتاب پھاڑ دوں۔''

''نیک کام کرنا چاہتی ہو''......وہ بھی مسکرایا۔

تب اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ بڑی میز کا بغور جائزہ لیا۔ ادھر ادھر بھی نگاہ دوڑائی۔ کوئی چیز دکھائی نہ دی۔ نذرُل آئیں اور خالی ہاتھ۔ اس کا دل یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ ایسا تو آج تک نہ ہوا تھا۔

بی بی جان اندر آئیں۔ اس کے شانوں پر محبت بھرا ہاتھ پھیرا۔ گھر سے خط کے بارے میں استفسار کیا۔ ماں، بھائی، بھاوج اور بھتیجوں کی خیریت دریافت کی اور اتنے دنوں سے نہ

آنے کا گلہ کیا۔

وہ دھیمے دھیمے ان سے باتیں کرتا رہا۔ ان سے باتیں کرنے میں اسے بہت اپنائیت محسوس ہوتی اگرچہ ان کے درمیان سب سے اہم مسئلہ زبان کا تھا۔ وہ پنجابی اتنی ہی سمجھ سکتا جتنا محسن کی یہ بھاوج اردو۔ بہت سی باتوں کی وضاحت محسن کرتا۔ پھر بھی یہ اسے اپنی بھاوج ہی کی طرح نظر آتی۔ مشفق اور مخلص سی۔ انہوں نے کچھ کہا تھا۔ سومی اور محسن ان کے غلط اردو بولنے پر ہنس رہے تھے۔ وہ جھینپتے ہوئے کہہ رہی تھیں...... ''ارے کیا کروں نگوڑی بولنی جو نہیں آتی۔''

تب اس نے سوچا۔ محبت کی کوئی زبان نہیں۔ یہ سب پر ارفع ہے اسے اپنے اظہار کے لیے کسی بھی وسیلے کی ضرورت نہیں۔ یہ اگر ہو تو ظاہر ضرور ہوتی ہے۔ آدمی اسے دیکھتا، محسوس کرتا اور پہچانتا ہے اور پورے یقین سے اس کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔

تب وہ کھانے کے کمرے میں آئے۔ وہیں وہ بھی تھی۔ سرمئی دوپٹے کے ہالے میں گندمی چہرہ لپیٹے۔ اس نے پہلے اسے دیکھا اور پھر محسن کو۔ مستقبل کے اس جوڑے کو اس کے دل نے آنکھوں کے ساتھ سراہا اور ان کی کامیاب زندگی کے لیے دعا گو ہوا۔ اس نے جب اس سنجیدہ سے لڑکے کو جو اس نٹ کھٹ شیطان لڑکی کا اکلوتا بھائی تھا۔ وہاں نہ دیکھا تو پوچھا کہ...... ''غزالی کدھر ہے؟''...... اور محسن نے بتایا کہ وہ آج کل گاؤں گیا ہوا ہے۔

گھریلو ماحول میں اس نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ کتنے دنوں بعد کھانے میں ہاتھ کا استعمال کیا تھا۔ طبیعت مطمئن ہو گئی تھی۔

''اچھا تو تم مجھے اپنا سبق سناؤ اب۔'' وہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔

پر اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ اس نے تو اسی ادھیڑ بن میں کھانا بھی ڈھنگ سے نہ کھایا تھا۔ وہ تو سارا وقت ٹافیوں کے لانے اور نہ لانے کے بارے میں ممکن اور ناممکن کے امکانات پر غور کرتی رہی تھی۔ ایسے میں سبق یاد رہتا اور وہ بھی اسے۔

''نذرل چچا......'' وہ عجیب سی پژمردگی سے بولی۔ اور یہ نذرل چچا اس کی پژمردگی کی

وجہ خوب جانتا تھا۔اتنے عرصے سے وہ اسے اتنا تو سمجھ گیا تھا۔

’’چلو پہلے ہمیں سبق سناؤ پھر ہم تمہیں ٹافیاں دیں گے۔‘‘

ٹافیاں اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولی...... ’’آپ لائے کب ہیں جو دیں گے۔‘‘

’’ارے اتنی ندیدی ہو تم۔‘‘...... وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔اور پتلون کی جیب سے چھوٹا سا پیکٹ نکال لایا...... ’’لو اب شروع ہو جاؤ۔پھر یہ تمہیں ملیں گی۔‘‘

اور رنگ برنگ خوشنما کاغذوں میں لپٹی ٹافیوں کو دیکھ کر اس کا حافظہ تیز ہوا اور کرسی پر جھولتے ہوئے اس نے سبق اٹک اٹک کر سنا ہی دیا۔

’’نقشہ دیکھنا آتا ہے۔‘‘......اس نے پوچھا۔

’’ہاں‘‘......وہ بہت فخر سے بولی تھی۔

’’تو لاؤ دیکھتے ہیں تمہیں کتنا کچھ آتا ہے۔‘‘

وہ بھاگ کر اپنی الماری سے اٹلس نکال لائی۔اور پھر چٹکی پھٹکی میں اس نے تینوں بڑے دریا مشرقی پاکستان کے نقشے پر دکھا دیے۔

’’اچھا ذرا اسے پڑھو۔‘‘......نذرُل اسلام نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھی۔

وہ جھکی اور کچھ دیر بعد گردن اوپر اٹھائی اور قدرے ہچکچاتے ہوئے بولی۔

’’باریسال‘‘......

’’تم نے شیر بنگال کا نام سنا ہے؟‘‘

ہونٹوں کو اس نے دانتوں سے کاٹا۔نذرُل چچا کو ایک نظر دیکھا اور قدرے تذبذب سے بولی......’’نہیں تو۔‘‘

’’مولانا محمد علی جوہر کے متعلق کچھ جانتی ہو؟‘‘

وہ مسکرائی اور اس بار بھی گردن نفی میں ہلا دی۔

''یہ ہمارے بچے ہیں جو اپنے قومی ہیروز کے متعلق کچھ جانتے ہی نہیں۔کل ان سے نظریۂ پاکستان کے متعلق پوچھا جائے گا تو انہیں کیا معلوم ہوگا۔''......اس نے دور بیٹھے محسن کو مخاطب کیا۔

پھر اس نے اسے اے۔کے فضل الحق، علی برادران، علامہ اقبال، ناظم الدین اور قائداعظم کے بارے میں ڈھیر ساری باتیں بتائیں۔چھوٹی چھوٹی دلچسپ باتیں جنہیں سن کر اسے یوں محسوس ہوا کہ تاریخ بہت دلچسپ مضمون ہے۔

''سومی! باریسال فضل الحق کا شہر ہے اور میں بھی یہیں کا رہنے والا ہوں۔''

اپنے نذرُل چچا کا گھر دیکھنے کے لیے وہ دلچسپی سے نقشے پر جھکی، پر اس کے اردگرد نیلی لکیریں دیکھ کر گھبراتے ہوئے بولی۔......''نذرُل چچا! آپ یہاں کیسے رہتے ہیں یہاں تو دریا ہی دریا ہیں۔''

''یہ دریا ہماری زندگی ہیں۔ہمیں ان سے ڈر نہیں لگتا۔''

وہ بہت حیران ہوئی یہ جان کر کہ ان کے گھر جانے کے لیے کوئی ریلوے لائن اور سڑک نہیں۔وہ بس دریا سے آتے جاتے ہیں۔''اللہ! کیسے آتے جاتے ہوں گے اور جو ڈوب جائیں تو؟......اسے بہت ڈر لگا۔''

ٹافیوں کا خوبصورت پیکٹ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر اس نے نذرُل چچا کو خدا حافظ کہا اور سونے کے لیے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

اور محسن اس سے کچھ پرے بیٹھا تازہ ڈاک کا ایک خط بہت غور سے دیکھ رہا تھا اور گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔یہ اس کے مزارع کا خط تھا جس نے اسے لگان اور مالیہ کی ادائیگی کے لیے پیسے بھیجنے کو کہا تھا۔

اب وہ نذرُل سے کہہ رہا تھا کہ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ اتنی رقم کا بندوبست کہاں سے کروں۔

''یار یہ ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔''......اس نے سوچا۔اس گھر کا سربراہ ہونے کی وجہ سے اس کی اور بھی تو بہت ساری ذمہ داریاں ہیں۔پچیس سالہ اس لاپرواسے نوجوان کو جو اس حالت میں بہت ہی ذمہ دار نظر آرہا تھا۔اس نے دکھ اور ہمدردی سے دیکھا اور سوچا کہ متوسط طبقے کے مسائل ہر جگہ ایک جیسے ہیں۔ یہ لمبا چوڑا گھرانا تو اس کا اور بھی شکار ہے۔ جہاں رشتہ داریاں آپس میں بہت الجھی الجھائی ہیں۔ تقسیم میں جہاں یہ اپنا سب کچھ لٹا آئے ہیں۔ وہاں اپنے خاندان کے سربراہ سے بھی محروم ہو گئے ہیں۔

غزالی اور سومی کے یتیم ہونے کے ساتھ ساتھ محسن، احسن، ان کی بہنیں اور ماں بھی ایک طرح سے یتیم ہو گئی ہیں۔ پر ان کی بھاوج بہت حوصلہ مند خاتون ہیں۔ان کے بھائی جو محسن اور احسن کے پھوپھی زاد ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی دو عدد بہنوں کے شوہر بھی ہیں، پاک فضائیہ میں اونچے عہدوں پر فائز ہیں۔ان کی معاونت نے اس خاندان کو تباہ ہونے سے بچا لیا ہے۔ محسن اپنی بھاوج سے بہت مانوس ہے اور اپنی ماں سے بھی بڑھ کر پیار کرتا ہے۔کیونکہ انہوں نے ہی ان سب بہن بھائیوں کی پرورش کی۔ یہی وجہ ہے کہ غزالی اور سمعیہ ان سب بہن بھائیوں کو بہت پیارے ہیں اور ان کے مستقبل کے متعلق ان کے عزائم بہت اونچے ہیں۔

"کس کمبخت نے لانبے بالوں کو عورت کا حسن کہا ہے۔ ارے یہ حسن ہے یا ایک جیتا جاگتا عذاب۔ من بھر کے اس بوجھ کو دھونے میں گھنٹے لگاؤ۔ انہیں خشک کرو اور پھر ان کی زیبائش کے لیے دکانوں پر بھاگتے پھرو۔ بھاڑ میں جائے یہ زینت اور چولہے میں جائے یہ حسن۔ نہیں درکار مجھے یہ سب۔"

یہ وہ تھی جو وقت کے کافی سال پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ پر اب بھی اکثر ذرا ذرا سی بات پر جھنجھلایا کرتی تھی۔ اس وقت گردن نہوڑائے آدھے سر پر پھیلے اس کوہان نما جوڑے کو کھولنے میں لگی تھی۔ جسے تین دن پیشتر بہت چاؤ سے ہیئر ڈریسر سے بنوا کر آئی تھی۔ دو دن تو خوب نشہ رہا۔ سبھی نے تعریف کی۔ غزالی نے بھی پسند کیا۔ اور سوتے جاگتے اس نے بھی اتنی حفاظت کی کہ گردن کو ہی آزار دے بیٹھی۔

چند لٹیں ڈھیلی ہو گئیں۔ کچھ ہنوز کسی تھیں اور وہ بیدردی سے انہیں نوچ رہی تھی۔ اب اسے تھکن کا احساس بھی ہونے لگا تھا۔ ستانے کے لیے ذرا گردن اوپر اٹھائی تو سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے سے نظر ٹکرائی۔ اپنا حلیہ کچھ بھوت ہی کی طرح نظر آیا۔ ایک ٹک اس نے

خود کو دیکھا۔ جھٹکے سے اٹھی، الجھے بالوں کو انگلیوں سے قدرے ٹھیک کیا۔ دوپٹے سے سر ڈھانپا۔ باہر نکل کر باورچی خانے میں کام کرتی بھاوج کو تہمینہ کے ہاں جانے اور دوپہر کو کھانے پر انتظار نہ کرنے کے متعلق بتایا اور گاگلز آنکھوں پر چڑھاتی رکشے میں لد گئی۔

''بالوں کو شانوں تک تراش دو۔''...... لمبے لمبے بال جب کُھل کر اس کی پشت پر بکھر گئے تو اس نے ہیئر ڈریسر سے کہا۔

''آپ انہیں کٹوا کیوں رہی ہیں؟''......اتنے خوبصورت بالوں کو کاٹ دینے کا سن کر وہ بولے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

''مجھے تنقید اور مشورے دونوں سے الرجی ہے۔'' اس کے لہجے میں خفیف سی تلخی تھی۔ ہیئر ڈریسر کو انہیں کاٹ دینے ہی میں اپنی عافیت نظر آئی۔ یوں اسے افسوس سا ہو رہا تھا۔

اور جب وہ کٹے بالوں کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے لفافے میں ڈالنے لگی تو اس نے کہا۔ ''آپ انہیں ہمارے پاس بیچ دیں۔''

''وہ کیوں؟'' اس نے لفافہ اور بیگ اٹھا کر باہر نکلتے ہوئے خاصی بے نیازی سے کہا۔

اور وہ زرد رو آدمی اس کے دکان سے نکل جانے کے بعد بڑبڑایا...... ''یہ کیسی سرپھری لڑکی ہے۔ گز بھر لمبے ان بالوں کو اگر اسے کٹوا کر اپنے پاس ہی رکھنا تھا تو سر کے ساتھ ٹکے کیا کاٹتے تھے؟ اس کی وہ چھریرے قد والی بھاوج تو بہت سمجھدار ہے اور یہ تو اپنی جگہ سے کچھ کھسکی ہوئی نظر آتی ہے۔ اب یہ انہیں اگر میرے پاس بیچ جاتی تو میرا کتنا فائدہ ہوتا؟ دو سو سے کم میں تو کیا ہی بکتے۔''

اور وہ بال کٹی جب تہمینہ کے ہاں پہنچی تو برآمدے میں قدم رکھتے ہی جان گئی کہ جن ناخواندہ مہمانوں کی وہ پچھلے ہفتے سے منتظر تھی وہ آچکے ہیں۔ اس کے بے حد نفیس اور اسٹائلش ڈرائنگ روم میں دھما چوکڑی اور اودھم کا ایک سلسلہ جاری تھا۔ برآمدے کے غربی کونے میں

نو سالہ عاشی میاں مٹھو کے پنجرے کے پاس کھڑی اس سے باتیں کر رہی تھی۔

وہ مسکرائی اور صحن میں آ گئی، جہاں پندرہ سالہ منی دھلے کپڑے تار پر پھیلا رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی چیخی۔

''سوی آپا! آپ نے کیا غضب کیا۔''

وہ بیگ جھلاتی ہنسی اور یہ کہتے ہوئے ''ارے کیا اچھے نہیں لگے۔''...... کچن کی سمت بڑھ گئی۔

اور منی کو اس کے شانوں پر لہراتے کٹے بالوں کو دیکھ کر دفعتہً خدا کی بے نیازی پر بہت غصہ آیا۔...... یہ اللہ میاں کی بانٹ بھی کیسی اندھی ہے۔ یونہی بے قدرے لوگوں پر اپنی عنایتوں کی بارش کرتا چلا جاتا ہے اب کمر تک پہنچے ہوئے ان کے یہ سیاہ چمکیلے بال اللہ کی دین نہیں تو اور کیا تھی جسے وہ جھمیلا سمجھتے ہوئے کٹوا آئی ہیں اور ایک ہم جیسے بھی ہیں جنھوں نے بالشت بھر بالوں کو بڑھانے کے لیے کیا کیا پاپڑ نہیں بیلے اور وہ ہیں کہ اِنچ بھر بڑھنے کی بھی قسم کھائے بیٹھے ہیں۔

وہاں دہکتے چولہوں کے آگے پیڑھیوں پر بیٹھی ماں بیٹی کھانا پکانے میں جُتی تھیں اور پسینہ پسینہ ہو رہی تھیں۔ تہمینہ بیگم کی اماں بیگم کے ہاتھ سے اس کی صورت دیکھتے ہی چمچہ چھوٹ کر زمین پر گرا۔ وہ بوکھلا کر بولیں۔

''اے بیٹی! یہ تم نے اپنے بالوں کو کیا کیا؟''

اور اس کے اس جواب پر کہ...... ''خالہ بی! سنبھالنے دو بھر ہو رہے تھے ٹھکانے لگا دیے ہیں۔''...... چچ چچ کرتے ہوئے تاسف بھرے لہجے میں انہوں نے کہا۔...... ''تم آج کل کی لڑکیوں کو جانے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ بال تو عورت کی زینت ہیں۔ اب یہ تمہاری گردن پر جھل جھل کرتے کیا اچھے لگ رہے ہیں؟ تم لوگوں کو سمجھائے کون۔ بھیڑ چال جو چلی ہے تو ساتھ ہی سوچ سمجھ بھی ختم ہو گئی ہے۔''

اس کے آنے کا فائدہ یہ ہوا کہ تہمینہ کی جان اس دہکتی آگ سے چھٹ گئی۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے وہ بولی۔...... ''تو تم اِن دِنوں اپنی ہونے والی نند کی آل اولاد کو پکوان پکا پکا کر کھلا رہی ہو۔''

''مت پوچھو کچھ، اس فوج نے تو ناک میں دم کر دیا ہے۔ خرچ نے الگ کمر توڑ ڈالی ہے۔''

ڈرائنگ روم میں بے فکروں کی ایک دنیا آباد تھی۔ دو مُخنی سے لڑکے کیرم بورڈ پر جھکے تھے۔ چند پنگ پونگ کھیل رہے تھے۔ ایک لڑکی دائیں ہاتھ بیٹھی کومک پڑھ رہی تھی اور بڑے صوفے پر جدید وضع کا ایک ماڈل اپنی موٹی سی ناک پر سنہری پتلے فریم کا چشمہ چڑھائے بیٹھا تھا۔ شنیل نمبر فائیو کی خوشبو سارے ڈرائنگ روم میں پھیلی تھی۔ تعارف پر اس نے سر یوں خم کیا تھا جیسے ملکہ صبا ہو۔

''یہ کس پہ اتنا اترائی ہوئی ہے۔ ناک تو دیکھے ذرا اپنی، گالوں تک گھومتی پھر رہی ہے۔ ہونٹوں کے گوشے کانوں کی اور بھاگے جاتے ہیں۔ رنگت پیلے شلجم سے بھی بدتر اور سمجھتی ہے خود کو ہیلن آف ٹرائے''......وہ جل کر بولی۔

''گولی مارو اسے اور یہاں بیٹھ کر مجھے بتاؤ کہ تمہیں ایسا کرنے کا کس دیوانے نے مشورہ دیا تھا؟''......دوسرے صوفے پر تہمینہ اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

''کیا بکواس ہے۔ بھئی میرا جی نہ جلاؤ۔ تمہاری اماں بیگم نے اپنا فرض پورا نہیں کیا جو ابھی تمہاری کسر باقی ہے۔''

''کمبخت کا غصہ تو دیکھو۔ مجال ہے جو ناک پر مکھی بیٹھ جانے دے۔ وہ تمہاری ماں جی، تمہاری ان ہی حرکتوں پر ٹھیک ہی بیزار رہتی ہیں۔''

کسی نے تہمینہ کو پکارا تھا...... ''ابھی آئی میں، تم اتنی دیر یہ رسالے دیکھو۔''......اس سے کہتی ہوئی باہر چلی گئی۔

قریبی میز پر لائف ٹائم، اون لکر اور مرر کے تازہ شمارے پڑے تھے۔ مرر اٹھا کر اس نے دیکھنا شروع کیا۔ یہ پاکستان کی ہائی کلاس خواتین کا نمائندہ تھا۔ ایک بے حد دلکش لڑکی جم خانہ کلب میں سلیکس پہنے کریکرز اور کاغذی ٹوپیاں بانٹتی پھر رہی تھی۔ توند اور گنجے سر والا ایک بھاری بھرکم مرد کلوک روم سے نکلتی ایک ناٹی ادھیڑ عمر کی عورت کو کوٹ پہننے میں مدد دے رہا تھا۔ بال روم میں رقص عروج پر تھا۔ یہ کراچی کے شب و روز تھے۔ لاہور کے انٹر کونٹ میں فیشن پریڈ تھی۔ پی۔ آئی۔ اے کٹ پاجاموں اور بیل باٹم کے جلوے نظر آ رہے تھے۔ سہلٹ ٹی گارڈن کے ایک کلب میں ولایتی اور دیسی عورتیں بیٹھی ماہ جونگ کھیل رہی تھیں۔ ڈھاکہ میں اپوا کی بیگمات چیریٹی کلب آرگنائز کرنے کے سلسلے میں ایک گول میز کانفرنس کر رہی تھیں۔ اس نے رسالہ میز پر پھینکا اور نیم درازسی ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔...... ''اس غریب ترین ملک کی ان امیر ترین عورتوں کے لیے واقعی ان سے بڑھ کر اور کام بھی کیا ہو سکتا ہے۔ قوم کلچرڈ ہو رہی ہے۔''

تہمینہ کے گھر دوپہر کا کچھ حصہ گزار کر جب وہ اپنے گھر آئی تو سائے ڈھل گئے تھے اور ماں جی نماز کے لیے تخت پر کھڑی تھیں۔ نیّت کے لیے ہاتھ اوپر اٹھے ہی تھے جب قدموں کی چاپ پر انہوں نے گردن موڑ کر دیکھا اور پھر اسے سیدھا کرنا انہیں یاد نہ رہا۔

وہ بھی بہت بدبخت تھی۔ جان بوجھ کر یوں کھلے سر ان کے سامنے آئی تھی۔ اور اب انہیں غصے سے لال پیلا ہوتے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ جانے انہیں یوں تنگ کر کے اس کی کون سی حِس تسکین پاتی تھی؟

''میں پوچھتی ہوں بال کہاں گئے؟'' وہ چیخیں۔

''باربر کے پاس۔'' اس ڈھیٹ دیدے کے گلابی ہونٹوں پر تبسم پھیلا پڑ رہا تھا۔

''اللہ کی مار تم پر۔ اچھے بھلے بالوں کے ساتھ صبح گھر سے گئی تھی اور اب بال کٹی میم بن کر آ گئی ہو۔ اس گھر کا تو باوا آدم ہی رقیہ کے مرنے کے بعد بدل گیا ہے، جو جس کا جی چاہتا

ہے کرتا پھرتا ہے۔ برقعے اترے ہیں تو دوپٹے گلوں میں آگئے ہیں۔ میرے اللہ یہ شہباز کا گھر ہے۔ وہ محسن، احسن، غزالی اور اس کی دلہن کو کوسنے دے رہی تھیں کہ جنہوں نے لاڈ پیار میں اسے دوکوڑی کا کر دیا ہے۔

''اے چھوڑیے ماں جی، آپ کو کیا۔ آپ تو بس اللہ اللہ کرتی رہا کریں۔''......غزالی کی دُلہن ان کی چیخ وپکار سن کر کمرے سے نکل کر تیزی سے ان کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

پر ماں جی اور چپکی بیٹھیں اور وہ بھی گھر میں جب اتنی بڑی بات ہو جائے۔

''انہیں تو بولنے کی بیماری ہے۔اب ان سے کون مغز کھپائے؟''......اس نے سوچا اور بچے کا دودھ بنانے کے لیے باورچی خانے کی طرف چل دی۔

''شات بائی چمپا...... ہو جا گورے جا گو۔''

اس نے نیم تاریک راہداری میں قدم رکھا اور اس شیریں آواز کو سنا۔

یہ پاکستان کونسل برائے قومی یکجہتی کی عمارت تھی جس کے ہال کی طرف وہ اس وقت چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی بڑھ رہی تھی۔ یہاں بنگالی بچوں کے ساتھ ایک شام منائی جا رہی تھی۔ ممبر ہونے کی وجہ سے وہ بھی شرکت کے لیے آئی تھی۔

وہ ہال میں داخل ہوئی۔ یہاں تیز جگمگاتی روشنیاں تھیں۔ سٹیج خوبصورتی سے سجی تھی۔ اور خواتین رنگ برنگی ساڑھیوں اور بوجھل جوڑوں میں کافی پر تمکنت دکھائی دے رہی تھیں۔ سانولے اور نکھرے ستھرے رنگ اچھے لگ رہے تھے۔ بلوغت میں داخل ہوتی اس لڑکی کی آواز بہت دلکش تھی جو سٹیج کے ایک طرف بیٹھی اپنے نازک وجود کو ہلکی ہلکی جنبش دیتی ہوئی گا نا گا رہی تھی۔

ان کی آنکھیں بند تھیں، انہوں نے اپنے سروں پر سنہری اور سفید تاج پہن رکھے تھے۔ وہ بہت کم عمر اور معصوم تھے جو ہتھیلیوں کے پھول بنائے اور اپنے داہنے رخساروں کو ان پر ٹکائے

بیٹھے تھے۔ وہ تعداد میں سات تھے اور سٹیج پر ان کی ترتیب نیم دائرے کی صورت میں تھی۔ ان کے درمیان ایک لڑکی سنتھالی طرز کا جوڑا بنائے پھولوں سے لدی پھندی رقص کر رہی تھی۔

سمیعہ علی یہ سب بہت دلچسپی سے دیکھ رہی تھی سمجھ نہ آنے کے باوجود ساری نشستیں پر تھیں۔ وہ ایک طرف کھڑی تھی۔ پر اسے شاید اپنے یوں کھڑے ہونے کا دھیان نہیں تھا۔

''جاگو رے جاگو......''

خوبصورت رسیلی مترنم آواز مدھم پڑتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی ان کی بند آنکھیں بھی آہستہ آہستہ کھلتی جا رہی تھیں۔ وہ ایک کے بعد ایک ہوش میں آکر رقص میں شامل ہو رہے تھے۔

گیت ختم ہوا اور اس کے ساتھ ہی ان کا ناچ بھی ختم ہو گیا۔ بہت سی تالیوں کا شور ہوا۔ وہ کسی سے اس کے متعلق جاننا چاہ رہی تھی۔ تبھی نازک سے جسم والی ایک لڑکی نما عورت نے اپنے دو سالہ بچے کو گود میں بٹھاتے ہوئے اس کے لیے جگہ خالی کر دی۔

اس کی اُردو ٹوٹی پھوٹی تھی لیکن پھر بھی رقص کا جو پس منظر اس نے اسے سمجھایا، وہ اسے سمجھ گئی تھی۔ کہانی تو روایتی سی ہے۔ وہی سوتیلی ماں جو بچوں کو جادو کے زور سے سلا دیتی ہے اور رحمدل پری انہیں ہوش میں لاتی ہے مگر معصوم پیشکش کا تمثیلی انداز بلاشبہ اعلیٰ ہے۔ اس نے سوچا اور گہری نظر اپنے ساتھ بیٹھنے والی پر ڈالی۔

وہ چوبیس پچیس کے گھیرے میں نظر آتی تھی۔ اس کے سیاہ بال جن سے ناریل کی ہلکی ہلکی خوشبو اڑتی تھی، سادگی سے ایک لمبی چوٹی کی شکل میں اس کی پشت پر پڑے تھے۔ چہرے پر کافی ملاحت تھی۔

''ایشو آمار گھورے ایشو۔ ایشو۔ ایشو۔''

''(آؤ میرے گھر میں آؤ۔ آؤ۔ آؤ)''

سٹیج پر ایک ادھیڑ عمر کی خاتون گیت گا رہی تھیں۔ جن کے بارے میں اس کے ساتھ والی

نے بتایا تھا کہ یہ ٹیگور کا مشہور گیت ہے۔ جس میں وہ خدا کو اپنے گھر آنے کی دعوت دیتا ہے اور یہ گھر اس کا دل ہے۔

''کیسا رس ہے گلے میں''...... اس نے بہت رشک سے گانے والی کو دیکھا جس کی قرمزی ساڑھی کا آنچل مخصوص بنگالی طریقے سے دوسرے شانے تک آیا ہوا تھا۔ کانوں میں بڑے بڑے ٹاپس تھے اور رنگت کافی کھلتی تھی۔

''یہ ڈھاکہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو کی مشہور فنکارہ ہیں، رابندرو شنگیت کی ماہر ہیں۔''...... اس کی معلومات میں مزید اضافہ ہوا۔

اب ایک لمبی چوڑی تقریر جاری ہوئی۔ مہمان خصوصی ایک خاتون تھیں جو مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان بہتر تعلقات کی تجاویز پر روشنی ڈال رہی تھیں۔ ان کی انگریزی تو خاصی رواں تھی پر تلفظ کچھ اتنا اچھا نہ تھا۔

اس کی ساتھی خاتون نے سمعیہ سے اس کی سرگرمیوں کے بارے میں دریافت کیا۔ مختصر لفظوں میں اپنا تعارف بھی کرایا۔ پر یہ جان کر وہ بہت حیران ہوئی کہ وہ دبلی پتلی لڑکی جس کے بدن پر اس وقت مہین کلف والی سوتی ساڑھی تھی۔ تین بچوں کی ماں تھی، اس نے ڈھاکہ یونیورسٹی سے سیاسیات میں ایم۔ اے کیا تھا۔ وہ طالب علمی کے زمانہ میں بائیں بازو کی سرگرم جوشیلی لیڈر تھی۔ اسے اپنی شادی اتنی جلدی ہونے کا بہت قلق تھا۔ اس کے عزائم بہت بلند تھے اور وہ جنتا کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی تھی۔

''ستیاناس ہو اس شادی کا، بیڑا غرق کر دیا۔''...... اس نے دکھ سے کہا۔

سمعیہ بھی بشاشت سے مسکرائی اور بولی۔...... ''چلئے! آپ نے اپنی منزل پالی۔''

''میری منزل؟......'' وہ زیر لب بولی۔ اس نے اپنی لانبی گردن شانوں کی طرف گھمائی اور کسی قدر نفرت سے اپنے قریب بیٹھی لڑکی کو دیکھا، جس کی گلابی رنگت چمکتی تھی جس کے شانوں پر سیاہ گھنے بال لہراتے تھے اور جس کے جدید وضع کے خوش رنگ لباس سے غیر ملکی پرفیوم کی بھینی

بھینی خوشبو پھوٹتی تھی۔ تب اس نے بہت دھیمے سے خود سے کہا۔

''یہ سب مجھے تمہارے خاندانی پس منظر سے ناواقف ہونے کے باوجود تمہارا آتا پتا بتا رہے ہیں۔ تم جیسی سپر کلاس فیملیز کی لڑکیوں کے لیے یقیناً شادی ہی ان کی منزل ہے پر میں جو بنگال سے ہوں، بنگال جس کا سنہری ریشہ تمہارے لیے فلک بوس عمارتیں اور پُرتعیش زندگی کے لوازمات مہیا کرتا ہے، یہ سب نہیں چاہتی تھی۔''

اپنے ان محسوسات کو اس نے خاموش ہی رہنے دیا اور بس اتنا ہی کہا۔

''آپ لوگوں کو مشرقی پاکستان کے مسائل سے ذرا دلچسپی نہیں۔'' وہ چونکی اور حیرت سے اسے دیکھا۔

اس خوبصورت لڑکی کی آنکھوں میں واضح حیرت محسوس کرتے ہوئے اس نے اپنی بات کو آگے بڑھایا۔

''آپ یقیناً حیران ہو رہی ہیں۔ میں کچھ غلط نہیں کہہ رہی ہوں۔ اب ان محترمہ کو کون سمجھائے کہ مادام آپ جو اپنی ساری انرجی یہ بتانے میں صرف کر رہی ہیں کہ دونوں حصوں کے درمیان بہت اخلاص و محبت ہے تو یہ قطعی غلط ہے۔ ہم لوگ بہت مضطرب ہیں۔ ہمارے حالات حوصلہ افزا نہیں۔ بائیس سالوں نے تو ہمیں دال بھات سے بھی محروم کر دیا ہے۔''

ملک کے سیاسی حالات سے وہ کچھ اتنی بے خبر بھی نہ تھی۔ اس کے گھر کے مردوں کا دل پسند مشغلہ ملکی حالات پر تبصرہ کرنا تھا۔ وہ بھی ان کے پاس بیٹھ کر انہیں سنتی اور کبھی کبھی اپنی عقل اور معلومات کے مطابق لقمے بھی دیا کرتی۔ پر اس سرکاری عمارت تلے فرید پور کی اس نازک سی لڑکی نے اپنی پہلی ہی ملاقات میں جس بے باکی سے باتیں کی تھیں۔ اسے سن کر اسے بہت دکھ ہوا۔ اس کی چمکتی رنگت زردسی پڑ گئی۔

تب اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے مرد نے جو اس کا شوہر جان پڑتا تھا۔ اس کی طرف دیکھا اور بولا۔۔۔۔۔۔ ''تم نے اپنی سیاست یہاں بھی شروع کر دی۔ یہ بُری بات ہے۔''

''کیا بری بات ہے؟ آنکھوں پر پردے ڈالنے سے کچھ فائدہ ہوگا؟ حقیقت بلاشبہ بہت کڑوی ہوتی ہے۔''......وہ بہت بیزار نظر آ رہی تھی۔

اس لمحے اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے شوہر پر حاوی ہے اور دھان پان سی ہونے کے باوجود مضبوط شخصیت کی مالک ہے۔

پروگرام ختم ہونے پر اس نے اچھے انداز میں سمعیہ کو خدا حافظ کہا۔ اپنے گھر کا پتہ بتایا۔ آنے کی دعوت بھی دی اور یہ بھی کہا کہ اگر اس نے کسی بات کو محسوس کیا ہے تو وہ معافی کی خواستگار ہے پر حقیقت وہی ہے جو اس نے بیان کی ہے۔

''دراصل ہم لوگ''......اس نے اداسی سے کہا۔......''ملک کے دو حصے ہونے کے باعث اتنے بدقسمت ہیں کہ ایک دوسرے کے مسائل کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔''

''واقعی''......اس نے اس کے چلے جانے کے بعد دکھ سے سوچا۔......''یہ ہم کیسے ہم وطن ہیں؟''......ایک دوسرے سے ناواقف، اجنبی، غیریت لیے ہوئے۔

اس گھر میں پچھلے چند دنوں سے عجیب سا شور تھا۔ گھر کا معمر ترین فرد دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے اٹھارہ گھنٹے ہر چھوٹے بڑے کو یہ سمجھانے میں صرف کر رہا تھا کہ اس نامعقول لڑکی کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ لاڈ پیار نے اس کا ستیاناس کر ڈالا ہے۔ وہ جوان ہے اور یوں ایک جوان لڑکی کا ہزار میل دور پڑھنے کے لیے جانے کی ضد کرنا قطعی احمقانہ بات ہے۔

اور یہ کہ اب اتنا بھی پڑھانے کی ضرورت کیا ہے۔ اٹھارہ انیس سال کی لڑکی کو تو ایک آدھ بچے کی ماں بن جانا چاہیے۔ اور یہ ابھی تک یونہی ہُڑدنگے مارتی پھرتی ہے۔ جوان جہان لڑکی دھرتی کا بوجھ ہوتی ہے۔ اسے فوراً ٹھکانے لگا دینا چاہیے۔

ویسے انہیں اس بات کا بھی قلق تھا کہ ان کی باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دیا جاتا۔ پر وہ اپنے طور پر انہیں پھر بھی سمجھائے چلی جا رہی تھیں۔

اس ہُڑدنگے مارتی لڑکی نے جس کا نام سمعیہ علی اور پیار کا نام سومی تھا، بی۔ اے کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کر لیا تھا۔ وہ خوش قسمتی سے اس گھر کی اکیلی لڑکی تھی۔ چچاؤں، پھوپھیوں، بھائی اور کامنی سی بھاوج سبھوں نے اپنے اپنے طور پر اس کی خوشی میں شرکت کی

تھی۔ چند دنوں بعد صبح ناشتے کی میز پر جب اس کے بھائی نے یونیورسٹی سے ایم۔اے کے لیے داخلہ فارم لانے کو کہا تو اس نے آنکھیں اٹھائے بغیر جواب دیا کہ ''وہ ایم۔اے کے لیے ڈھاکا یونیورسٹی جانا چاہتی ہے۔''

''کیوں؟''......غزالی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''بس یونہی۔''......اس نے بھی اطمینان سے کہا۔

''وہاں کے حالات اتنے اچھے نہیں ہیں۔ایسے میں تم کہاں جاؤ گی؟''......وہ بہت نرم اور محبت بھری آواز میں اس سے مخاطب تھا۔

''میرا جی چاہتا ہے۔''......اس نے قصداً وہ بات کہی جس کے متعلق اسے اچھی طرح علم تھا کہ اس کا رد کرنا اس کے بھائی کے لیے کتنا کٹھن ہے۔

اور یہ ٹھیک وہ وقت تھا جب ماں جی نے اپنے لیکچر کا آغاز کیا۔ وہ دھواں دھار بول رہی تھیں۔غزالی پریشان تھا۔......''وہاں سیاسی سرگرمیوں کی نوعیت کسی طرح بھی صحت مند نہیں۔ یہ اگر وہاں چلی جائے گی تو میرا دھیان سارا وقت اسی میں اٹکا رہے گا اور ہاں! اسے اپنی آنکھوں سے دور کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ اس کے بغیر تو گھر میں مجھے گھُپ اندھیرا محسوس ہوتا ہے۔''......اس نے گہرے غم اور تفکر سے یہ سب سوچا اور چائے ادھوری ہی چھوڑ کر چلا گیا۔

بھابھی نے شوہر کے ایما پر اس سے ایک دو بار بات بھی کی۔ پر اس کے عزمِ صمیم نے اسے کچھ زیادہ بولنے ہی نہ دیا۔اس کے اتنے قوی ارادے کو محسوس کرتے ہوئے وہ شوہر سے بولی۔

''میں مناسب نہیں سمجھتی کہ ہم اس کے شوق کی راہ میں حائل ہوں۔ وہ جانے کا پختہ ارادہ کیے بیٹھی ہے۔اسے روکنا فضول ہوگا۔یوں پریشانی کی کیا بات ہے۔نذرل چچا کے بڑے بھائی کا خاندان وہیں ڈھاکہ میں ہی تو ہے۔خاندانی لوگ ہیں۔''

پر ماں جی کا یہ ہر وقت کا لیکچر سبھی کو ناگوار گزر رہا تھا۔انہوں نے زینب اور فاطمہ اپنی دونوں چھوٹی بہوؤں کو جو احسن اور محسن کی بیویاں تھیں۔ خط لکھوائے۔ باقاعدہ شام میں غزالی کو

بھی آدھ گھنٹہ کی خوراک پلانا ضروری خیال کرتیں۔ بہو سے وہ اکثر ناخوش ہی رہتیں۔ انہیں گلہ تھا کہ وہ نند کی بہت طرفداری کرتی ہے اور اس بگڑی ہوئی لڑکی کو مزید بگاڑ رہی ہے۔

اس دن غزالی نے باری باری دونوں چچاؤں کو فون پر گھر کی صورت حال کی خبر دی۔

''ارے بھئی تو پریشان کیوں ہو؟ وہ اگر جانا چاہتی ہے تو جانے دو۔ وہاں نذرُل کے بڑے بھائی ہیں۔ قطعی فکر کی بات نہیں۔''...... کرنل محسن نے اتنے لمبے چوڑے مسئلے کو جو غزالی کے گھر میں اتنا شور مچائے ہوئے تھا، یوں دو باتوں میں ختم کر دیا۔

اس نے دبے دبے لفظوں میں وہاں کے حالات کے بارے میں کہا۔

''سنو غزالی!...... ان کی آواز گھمبیر تھی...... قوموں کو اپنی زندگی میں ایسے واقعات اور حالات کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے، گھبراؤ نہیں۔''

اور یوں وہ قدرے مطمئن سا ہو گیا۔ کہنے کو وہ ایک ذمہ دار ڈاکٹر تھا۔ پر گھریلو زندگی میں اس کی حیثیت اپاہجوں جیسی تھی، اس پر اپنے چچاؤں کا بہت اثر تھا اور ایسا ہونا بھی قدرتی تھا کیونکہ پہلے باپ اور بعد میں ماں مرنے سے ان دونوں بہن بھائی کی زندگی میں جو خلا پیدا ہو گیا تھا اسے محسن اور احسن نے جس طرح پورا کیا اس نے ان پر کبھی یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ ماں باپ کی شفقت سے محروم ہیں۔

''سؤر کہتا ہے پاکستان نہیں بنے گا۔ کہونا ایک بار پھر۔ نہ میں تیرا جبڑا توڑ دوں تو میرا نام بھی شلپی نہیں۔''

یہاں تاڑ کے درختوں کے پاس کھڑا وہ قہر بھری نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ جس کی ٹھوڑی پر ابھی ابھی اس نے ایک زوردار مُکا رسید کیا تھا۔ وہ قد کاٹھ میں اس سے خاصا لمبا تھا اور کاہی رنگی چارخانہ دھوتی کو ہندوانہ سٹائل سے باندھے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے جبڑے کو سہلایا اور اپنے نوکا کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

''اب تم اپنی خیر منانا''......

''جاؤ جاؤ سیار (گیدڑ) کہیں کے، دھمکیاں دیتا ہے۔ پوربو بنگال سے تمہاری قوم کو جوتے مار مار کر نکالیں گے۔ ہمارا خون پی پی کر ٹپا ہو گئی ہے۔'' یہ اس نے زہر بھرے لہجے میں کہا تھا جو شلپی تھا۔

پر وہ دھمکیاں دیتا لڑکا جاتے جاتے رکا، سامنے سے ایک نوکا تیز رفتاری سے اس کی طرف آ رہی تھی۔ اس نے پہچانا۔ اس میں شنکر، کرشن داس، نگن اور اجیت تھے۔ وہ واپس پلٹا،

اس نے دایاں بازو ہوا میں لہرایا اور گرجا۔

''جے بھارت ماتا کی۔''

اس پر ان سب نے زوردار آواز میں نعرہ لگایا۔......''پاکستان جندہ باد۔''......ان کی جندہ باد کی یہ مشترکہ آواز بہت دور تک سنائی دی گئی۔ ان کے گلوں کی ایک ایک رگ پھولی تھی اور ان کی سوکھی سڑی چمڑیوں کے نیچے سینوں کے پنجر بہت نمایاں ہو گئے تھے۔ ان کے گندمی اور سانولے چہروں پر شوق و آرزو کی ایک دنیا امنڈی تھی۔

وہ تعداد میں یہی کوئی سات آٹھ تھے۔ لاغر اور مریل سے، ان میں بس تمیزالدین تن و توش کا اچھا تھا۔ جسے اس کے ماں باپ اور دوست تمیج کہتے تھے۔ یوں شبلی کا قد سب میں لمبا تھا، ہاتھ پیر بھی کھلے تھے، پر تن پر گوشت نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ بس ایک پردہ سا تھا جس نے اطراف کو ڈھانپا ہوا تھا۔

پر اس سمے ناریل اور تاڑ کے جھومتے ہوئے درختوں کے نیچے، ان دبلے پتلے لڑکوں کے چہروں پر ان ہندو لڑکوں کو اپنی جانب آتے دیکھ کر ذرا بھی خوف نہ تھا۔ تمیزالدین نے لال بھبھوکا ہو کر کہا تھا۔

''ہم تمہارے باپ دادا کی جائیداد مانگتے ہیں جو تمہارے پیٹ میں پاکستان کا نام سن کر یوں درد اٹھنے لگتا ہے۔''

''ذرا دیکھو تو ان ملیچھ مسلمان چھیلوں (لڑکوں) کو کیسے پَر لگ گئے ہیں۔ پاکستان اور جناح نے سب کو پاگل بنا دیا ہے۔ ہم دیکھیں گے بھارت ماتا کے ٹکڑے کون کرتا ہے۔''...... اجیت بولا۔

''ہم کریں گے ٹکڑے...... ہم!''......تمیزالدین نے اپنی چھاتی پر ہاتھ مارا۔ جوشِ غضب سے اس کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔ چند ماہ بعد ہی پورے ہندوستان کے الیکشن تمھیں بتائیں گے کہ ہم نے تمھاری بھارت ماتا کا گلا کاٹ دیا ہے۔

اور پھر یوں ہوا کہ بھارت ماتا کے ٹکڑے کرنے والے اور نہ کرنے والے ایک دوسرے پر پل پڑے۔ کوئی بیس منٹ وہ گتھم گتھا رہے۔ جب دھان کے کھیتوں میں سے واپس آتے دو صلح پسند آدمی وہاں آئے۔ ان کی مساعی سے وہ الگ تو ہو گئے پر ان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ ان کے کمزور کمزور بازو تنے ہوئے تھے اور وہ ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے۔

اور جب مخالف پارٹی کے لڑکوں کو انہوں نے جاتے دیکھا تو وہ اونچے اونچے چلائے۔

''آمار نیتا قائداعظم...... قائداعظم...... قائداعظم جندہ باد...... لے کے رہیں گے پاکستان۔ پاکستان جندہ باد۔''

وہ نظروں سے اوجھل ہوئے تو انہوں نے بھی واپسی کا قصد کیا۔ کھلے پانیوں پر ایک دوسرے کے پیچھے جب وہ نورالابصار کے ٹیلے کے قریب پہنچے تو انہیں وہاں بہت بڑا مجمع نظر آیا۔ ایک گونج دار آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟''......ابوعبداللہ نے حیرت سے پوچھا۔

''ہونا کیا ہے۔ پرشاد ساہا بکواس کر رہا ہے۔ پرسوں کلکتے سے آیا ہے، یہ بھی ایک نمبر حرامی ہے۔ جب آئے گا ایک نئے فلسفے کا پرچار کرے گا، سالا بڑا آیا روس کا حمایتی بن کر۔''

''اے تو چلو! سنتے ہیں۔''......شبلی نے نو کے کا رخ ٹیلے کی جانب موڑ دیا۔

اور اس بڑے ہجوم میں بمشکل جگہ بنا کر جب انہوں نے دائرے میں اندر جھانکا۔ پرشاد ساہا کہہ رہا تھا۔

''میں کہتا ہوں کمرِ ہمت باندھ لو۔ کمرِ ہمت یارو!......وگرنہ سرمایہ داری کی جونکیں ہمارا رہا سہا خون بھی چوس جائیں گی۔ یہ پُرشکوہ راجباڑیاں ہمارے ہی خون پسینہ سے بنائی گئی ہیں۔ انسانوں کے درمیان تفاوت کیوں ہے؟ ہم بھوکے مرتے ہیں اور وہ عیش کرتے ہیں۔ یارو! ایسا کب تک ہوگا۔ شنگھرام (انقلاب) آنا چاہیے۔ یہ ہندو پاکستان کے نعرے سب سرمایہ داروں کے سٹنٹ ہیں۔ وہ ہماری کاوشوں کو ناکام بنانا چاہتے ہیں۔ سوراج (آزادی) چاہیے۔ دال

بھات چاہیے۔''

مجمع میں موجود ہندو اور چند مسلمانوں نے اس کے جواب میں کہا۔شنگھرام۔ شنگھرام۔ مکیتر شنگھرام۔

پر چند مسلمان جواباً بولے

''ہم نہیں چاہتے شنگھرام ونگرام۔ ہمیں پاکستان چاہیے۔ پاکستان ملے گا تو شنگھرام آپ ہی آپ آجائے گا۔''

تمیز اور شلپی کا گروہ چلایا...... ''پاکستان جندہ باد۔''

پرشاد ساہا کو بہت غصہ آیا۔ بدک کر عبدالمتین سے بولا...... ''تمہاری یہ کیا بُری عادت ہے کہ ہر بات کی تان پاکستان پر توڑتے ہو؟''

''ارے! تو کیوں نہ ٹوٹے؟ پرشاد ساہا نصف صدی سے اوپر ٹاپے ہوئے جیون نے تو تمہاری قوم کا مسلمانوں کے ساتھ شودروں اور ملیچھوں جیسا سلوک ہی دیکھا۔ انصاف سے بتاؤ تم شادی بیاہوں میں ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھا پی سکتے ہو، حقے کے دو کش لے سکتے ہو۔ ارے! ہمارا تو کوئی معصوم بچہ بھی اگر تمہاری رسوئی میں چلا جائے تو تمہارے برتن بھانڈے، تمہاری جگہ، تمہارا کھانا سب بھرشٹ ہو جاتا ہے۔ تم کھانا پھینکتے ہو، برتن توڑتے ہو اور جگہ صاف کرتے ہو۔ اب تمہی بتاؤ مسلمان مزارع ٹھاکر جی کی حویلی میں ٹاٹ پر بیٹھے اور ہندو مزارع ستر نگ (کپڑا) بچھے فرش پر۔ بولو کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا میں؟

''تم لوگ یہ بھی شرم نہیں کرتے کہ ہماری مسجدوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے شور نہ کرو۔ ڈھول تماشوں سے پرہیز کرو۔ پر تم یہ سب ذلیل کام کرتے ہو بولو، تمہارے ساتھ کیسے رہا جاسکتا ہے؟''

عبدالمتین نے جونہی بات ختم کی۔ فضا میں پاکستان جندہ باد کی آوازیں پھر گونجیں۔

مجمع میں سے کسی نے کہا...... ''یہ پرشاد سالا کیمونسٹ ہے۔''

تمیزالدین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے یہ سب باتیں اس لیے کرتا ہے کہ مسلمانوں کی توجہ پاکستان سے ہٹ جائے۔''

''بھئی اب چلنا چاہیے۔ دادو انتظار میں ہوں گے۔ مجھے تو ابھی ماچھ (مچھلی) بھی پکڑنی ہے۔''

''ارے شبلی! مجھے یاد آیا''...... پھول محمد نے اسے مخاطب کیا۔

''مستفیض السلام بھیا ہوڑا سے آئے ہیں۔ ان سے تو ملیں جا کر ادھر کا حال احوال سنیں۔''

اور مستفیض السلام کا نام سنتے ہی شبلی کو نہ دادو کا انتظار یاد رہا نہ مچھلی پکڑنی۔ چلو چلو چلتے ہیں کہتے ہوئے اس نے نوکا کا رخ موڑ دیا۔

پانی میں کوئی کوس بھر کا پینڈا مارنے کے بعد جب وہ احتشام چاچا کی باشا پر پہنچے وہاں مستفیض بھیا کے دوستوں اور ملاقاتیوں میں الیکشن اور مسلم لیگ کے ٹکٹ پر لڑنے والے سبھی امیدوار زیرِ بحث تھے۔ مستفیض کے وجود سے پھوٹتی محبت اور خلوص کی روشنی میں پور پور نہانے کے بعد سب لڑکے مؤدب ہو کر بیٹھ گئے۔

مستفیض کی سیاہ آنکھیں چمکیں جب اس نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم سب دن رات کام کرو۔ اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ مسلم لیگ بنگال کی 200 نشستوں میں سے سو فیصد جیتے گی۔ انشاءاللہ!''

''انشاءاللہ!''...... لڑکوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ احتشام چاچا نے دھیمی آواز میں شیرِ بنگال کی مسلم لیگ کی طرف مراجعت اور قائداعظم سے کوئی صلح صفائی کے بارے میں پوچھا۔

مستفیض تڑ سے بولے۔

بابا! اب کیسی واپسی اور کیسی صلح صفائی؟ قائداعظم اصولی آدمی ہیں۔ جب انہوں نے کہا کہ وائسرائے ڈیفنس کونسل سے استعفیٰ دے دو تو پھر شیرِ بنگال کا ٹال مٹول کیسا؟ اب مسلم لیگ کی رکنیت تو ختم ہونی تھی۔ اب تو خیر بہت دیر ہو گئی ہے۔

''ہاں بھلا کیوں کئے ایسے؟''......احتشام چاچا کے ساتھ ساتھ کچھ اور بڑوں نے بھی سر ہلایا......''قائد اعظم جو بولے وہ ٹھیک باقی سب غلط''......ابوالبشر چاچا نے فوراً کہا۔

احتشام چاچا کی باڑی کے پاس ہی گوپال بابو کا ٹیلہ تھا۔ گوپال بابو بنگال کے مشہور ناول نویس چندر چیٹر جی کے عزیز ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے عقیدت مند بھی تھے۔ بندے ماترم کا ترانہ ان کے گراموفون پر اکثر ہی بجتا رہتا تھا۔ اس وقت بھی ایکا ایکی فضا میں یہ آواز گونجنے لگی۔

بندے ماترم	میں تیرا بندہ ہوں، اے میری ماں
شوجلدم، شوپھلدم، مویو بوشیتلدم	اچھے پانی، اچھے پھلوں، بھینی خشک جنوبی ہواؤں
شش شیاملدم ماترم	شاداب کھیتوں والی میری ماں
شپت کوئی کنٹھ کلکل نناوکرائے	تیس کروڑ گلوں کی پُر جوش آوازیں
دوشپت کوئی بھوجے دھرپت کھر کھر بائے	ساٹھ کروڑ بازوؤں میں سنبھلنے والی تلواریں
ایلا کینول مان اینو یلے	کیا اتنی طاقت کے ہوتے ہوئے بھی، اے ماں تو کمزور ہے۔
بھوبھل ورھارنم تمامی تارنم	تو ہی ہمارے بازوؤں کی قوت ہے، میں تیرے قدم چومتا ہوں
دیپودل بارنیم ماترم	تو دشمن کے لشکر کی غارت گر ہے میری ماں

مستفیض نے اسے سنتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

چیٹر جی جتنے بڑے ناول نگار تھے، کاش! اتنے بڑے انسان بھی ہوتے۔ قدرت نے انہیں بہت بڑا ذہن اور بے پناہ تخلیقی صلاحیت بخشی تھی مگر ان کی بیشتر تحریروں کا واحد مقصد ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف صف آرا کرنے کے علاوہ کچھ نہ تھا......خدا انہیں معاف کرے۔ پر بھیا! بندے ماترم کی نغمگی، اس کی شیرینی اس کا حُسن انسان کو مسحور کر دیتا ہے۔

تمیز الدین نے...... ''شو جلدم، شو پھلدم، مو یو بوشیتلدم'' ......ایک کیف میں گنگنایا۔

وہاں موجود مستفیض بھیا کے دوست عبدالاوّل جو کلکتہ یونیورسٹی میں قانون کے طالب علم تھے فوراً بولے...... ''میرے خیال میں تم میں سے کسی نے چیٹر جی کی انند مٹھ نہیں پڑھی ہوگی۔''

''نہیں تو بھیا'' ......سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

بڑے ہو کر ضرور پڑھنا۔ یہ گیت اسی ناول کی روح ہے۔ جو دراصل اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔

اور جب وہ نوکے میں بیٹھا اپنی باشا (گھر) کی طرف جا رہا تھا۔ اسے خیال آیا کہ وہ انہیں پوچھتا جائے۔ ان کی باشا کے سامنے اِک ذرا رک کر وہ اونچی آواز میں بولا...... ''اے عبدل چاچا! من کیسا ہے اب تمہارا؟''

اس ٹوٹی پھوٹی باشا کے ایک کونے میں سمٹے ہوئے اس دکھی لاغر وجود نے ہوا میں تیرتی اس آواز کو سنا اور جواب دیا...... ''بس بچہ! کیا پوچھتے ہو؟ تم کو تو معلوم ہی ہے، جی رہا ہوں۔''

نوکے کا رُخ موڑتے ہوئے اس نے بہت دکھ سے سوچا۔ ''یہ عبدل چاچا اور اس کی بیوی کا کیا ہوگا؟ ان کا تو کوئی پُرسانِ حال بھی نہیں۔''

گھٹائیں جھوم کے آئی تھیں اور کسی دم میں تیز بارش ہوا چاہتی تھی۔ تاڑ اور سُپاری کے درخت جھوم رہے تھے۔ اس نے افق کی طرف دیکھا۔ ان دنوں وقت کا اندازہ ہی نہیں ہوتا، سورج کی صورت پر تو دنوں نظر نہیں پڑتی۔

رات بھر وہ الٹے سیدھے خواب دیکھتا رہا۔ صبح کے قریب اس نے دیکھا کہ پرشاد سا ہا اونچے اونچے بول رہا ہے۔ شنگھرم کے نعرے لگا رہا ہے۔ وہ بھی چلاّ تا ہے۔ پاکستان۔ پاکستان۔ اس پر کسی نوکیلی اکڑی مونچھوں والے نے اس سے کہا۔ ''یہ تم کیا ٹرٹر کر رہے ہو؟'' اس نے اس بات پر سخت غصہ کھایا اور چلاّیا...... ''تم کون ہوتے ہو یہ کہنے والے؟ میرا جو جی چاہے گا کہوں گا''...... ''کیا کہنے ہیں تمہارے جی کے، یہ تو ابھی ٹھکانے آجائے گا۔''......

اور اس کے ساتھ ہی اس کے بائیں رخسار پر ایک زناٹے دار تھپڑ پڑا۔

اس کی آنکھ کھل گئی۔ ہڑ بڑا کر وہ اٹھ بیٹھا۔ ہمیشہ کی طرح دادو تخت پر بیٹھے ناک کی پھننگی پر عینک رکھے مطالعے میں مصروف تھے۔ یہ اس کی اپنی باشا تھی، مانوس اور محبت بھرا ماحول تھا۔ اس کے دھڑکتے دل کو تسکین ہوئی اور اس کے محض سپنا ہونے پر اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔

دادو کے بالکل پاس بیٹھ کر اس نے انہیں صبح کا سلام کیا۔ ان سے پیشانی پر شفقت بھرا بوسہ لیا اور سپنا انہیں سنایا۔ دادو نے ایک لحظہ کے لیے اسے غور سے دیکھا ان کی آنکھوں میں برسوں پر پھیلی دکھی کہانیاں تھیں۔ جنہوں نے آنکھوں کو بہت وسعت اور گہرائی دی تھی۔ کچھ دیر وہ اسے دیکھتے رہے۔ پھر رسان سے بولے۔ ''یہ تمہاری سوچ کا نتیجہ ہے۔''

''پر یہ سوچ فضول اور خیالی تو نہیں دادو! ہم اپنی روزمرہ زندگی میں ایسے واقعات نہیں دیکھتے؟''

تب انہوں نے ایک ٹک اسے دیکھا اور سوچا۔ یہ جو بھی بات کہتا ہے، اس کی عمر سے کہیں بڑی ہوتی ہے۔ انہیں اپنے دل میں پھوٹتی خوشی کا گہرا احساس ہوا۔ اس کی پیٹھ پر انہوں نے محبت بھرا ہاتھ رکھا اور خود سے کہا۔ ''میں نے اس لڑکے کو جو میرے لختِ جگر کا ٹکڑا ہے۔ جس کی عمر ابھی صرف گیارہ بارہ سال ہے پر جس کی ذہانت اور احساس اس کی عمر سے کہیں زیادہ ہے۔ فخرِ بنگال کا نام دے کر کچھ غلطی نہیں کی، کون جانتا ہے کہ وہ اس مملکت کا فخر ہی ثابت ہو جس کا نام پاکستان ہوگا۔''

''دادو آپ کس سوچ میں پڑ گئے؟ آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔''

''کچھ فکر نہیں کرو بچہ! سراج الدولہ کا بنگال اب زیادہ دنوں غلام نہیں رہے گا۔''

دادو کی اس بات کا اس نے فوراً یقین کیا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کرن بن کر چمکی۔ وہ وہاں سے اٹھ گیا۔ اس کا دادو اتنا بڑا عالم جو تھا۔ ان کی باشا میں تھا ہی کیا؟ کتابوں کے سوا۔ اپنے دادو کی سنگت اسے عزیز بھی تو بہت تھی۔ وہ ان سے عالمِ اسلام کے نامور سپہ

سالاروں کی کہانیاں رات گئے تک سنتا۔ سراج الدولہ اس کا آدرش تھا جس کے بنگال کو بھوک اور غربت کے آکٹوپس نے جکڑ رکھا تھا۔ گوشت گورے کھا گئے تھے اور خون کی آخری بوند اب ہندو جاگیردار پی رہا تھا۔ تبھی تو مسلمان ایک علیحدہ ملک کے لیے لڑ رہے تھے۔ قائداعظم اس کا زندہ قومی ہیرو تھا، وہ لگن سے ان کی باتیں سنتا اور مسلم لیگ کو کامیاب بنانے کے لیے اپنے ذہن کے مطابق تجاویز سوچا کرتا تھا۔

یہ وہ تھا جس کا نام اجتبیٰ الرحمٰن تھا، پر جسے اس کی دادی اور ماں پیار سے شلپی کہتیں۔

اس نے باہر نکل کر دیکھا، آسمان گہرا تھا۔ دھان کے کھیتوں کی ہریالی فضا کو بہت حسین بنائے ہوئے تھی۔ سپاری اور ناریل کے درخت دور دور تک پھیلتے چلے گئے تھے۔

''مجھے ان کے پاس فوراً جانا چاہیے۔ کیا معلوم انہوں نے کچھ کھایا بھی ہے، وہ یہ سوچتا ہوا اندر آیا اور لمبے کیل کے ساتھ لٹکتی بانس کے تنکوں کی چھاج اتار کر اپنے سر پر رکھی، جب دادو کی آواز اس کے کانوں میں پڑی جو اس سے کہہ رہے تھے۔ ''تم کیا کہیں باہر جا رہے ہو؟ پوکھر (تالاب) پر تمہاری دادی ماں پانی لینے گئی ہیں۔ تمہیں اس کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس کی جان اب بوڑھی ہے۔''

تب باشا کی پچھلی سمت کیلوں کے جُھنڈ کی طرف قدرے ڈھلانی زمین پر پاؤں آہستہ آہستہ جما کر نیچے اترتے ہوئے اس نے سوچا۔...... ''یہ دادی ماں بھی بس عجیب ہیں۔ وزنی چیز اٹھانے کے قابل نہیں پر یہ اٹھائیں گی ضرور۔''

پوکھر لبالب پانی سے بھرا تھا۔ کنارے کے قریب پڑے موٹے لکڑی کے تنے پر بیٹھی وہ گھڑے کی صفائی میں کتنی مگن تھیں۔ وہ مسکرایا...... ''انہیں اپنے کاموں سے عشق ہے۔''

گھڑا اس نے ان کے ہاتھ سے لے کر اچھی طرح کھنگالا، بھرا اور اپنے کندھے پر اٹھا کر انہیں آگے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔

انہوں نے تیز سبز موٹی سوتی ساڑھی کا آنچل سر پر ٹھیک کیا اور باشا کی طرف چلنے لگیں۔

شبلی نے ان کی ایڑیوں کو دیکھا جو پھٹی ہوئی تھیں۔ ان کے پاؤں میں جوتا وہ بہت کم دیکھتا تھا۔ دادی ماں کچھ اتنی زیادہ بوڑھی بھی نہ تھیں، بس بیماریوں نے لاغر کر ڈالا تھا۔

باشا کے سامنے تھوڑی سی جگہ پر ٹین ڈال کر کھانا پکانے کے لیے جگہ بنائی ہوئی تھی۔ وہیں اس نے گھڑا رکھ دیا۔ دادی ماں اسے کٹھل لانے کو کہہ رہی تھیں پر اس کی جان تو ان دو بیماروں میں اٹکی تھی جو ابھی تک ویسے ہی بیٹھے منہ اٹھائے اس کی راہ تک رہے ہوں گے اور آج تو وہ اٹھا بھی دیر سے تھا۔

اس نے انہیں موڑی تلنے کے لیے کہا اور خود بھاگم بھاگ نوکا کے پاس آیا۔ اسے کھولا اور کھلے پانی میں آ گیا۔ وہ چپو بہت تیز چلا رہا تھا، چندر دت کے بڑے لڑکے گوتم کو اس نے اشنان کرتے دیکھا اور نفرت سے منہ پھیر لیا۔ یہ بھی ایک بدذات تھا۔ بہت لڑائی ہوئی تھی پچھلے دنوں ان دونوں کے درمیان۔ یہی اس پاکستان، ہندوستان کے مسئلے پر۔ وہ مسلم لیگ کا ہرا چاند ستارے والا جھنڈا جب بھی لہراتا گوتم اور اس کے بہن بھائی اسے پھاڑنے کی کوشش کرتے۔ اس دن اس نے گوتم کو اچھی طرح پیٹا تب وہاں طوفان آ گیا۔ یہ دت جو اپنے آپ کو بہت ہی اعلیٰ سمجھتے تھے ان کے در پر آ جمع ہوئے۔ وہ بہت غصے میں تھے۔ دادو نے انہیں حکمتِ عملی سے ٹھنڈا کیا۔ صاحب رائے میں دادو وہ واحد ہستی تھے جو ہندوؤں سے بالکل نہیں دبتے تھے کیونکہ وہ مزارع نہ تھے۔ ان کے پاس اپنی تھوڑی سی زمین کے ساتھ ساتھ قابلِ عزت پس منظر، علم، تحمل اور دانائی تھی۔

ہرسُو پانی ہی پانی تھا۔ اوپر گہرے گہرے بادل اور نیچے ٹھاٹھیں مارتا سمندر اور اس پانی میں ابھرے ہوئے ٹیلے۔ جن پر چھالیہ اور تاڑ کے درختوں میں گھری بانس اور کھپریل کی باشائیں، یہ سب کچھ بہت حسین تھا۔ پر اس حسن پر کوڑھ کے داغ تھے۔ یہاں انسان سسک رہے تھے۔ یہ بنگال تھا جو بیرونی دنیا کے لیے سحر رکھتا تھا۔

وہ بھاگ کر اندر آیا۔ باہر بارش تیز ہوگئی تھی۔ ٹپ ٹپ باشا ٹپک رہی تھی۔ کونے میں وہ

دونوں میاں بیوی بیٹھے تھے۔اسے دکھ ہوا۔اب یہ ٹپکنے لگی ہے۔ان کے زخموں کو بھی آرام نہیں۔ کیا ہوگا؟ کون اس کی مرمت کرے گا؟

''عبدل چاچا!'' وہ ان کے قریب جا بیٹھا...... ''یہ تو بُرا ہوا۔''

''اے بچہ! سب ہی برا ہوا۔غریب کی بھی کوئی جندگی ہے؟ ماں کے پیٹ سے نکلتا ہے تو مصیبتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ جیون بھر ایڑیاں رگڑتا ہے اور ایک دن چپکے سے دم دے دیتا ہے۔ غریب کا تو بچہ! خدا بھی نہیں۔''

''تم لوگوں نے کچھ کھایا بھی؟''......اس نے یونہی پوچھا، حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اب ازخود کوئی چیز کھانے کے قابل نہیں رہے۔

''کس نے ہمیں دینا تھا؟ یہ تیرا دم ہے جو تُو اتنا بھی دیکھ لیتا ہے۔''

وہ اس برستی بارش میں باہر نکل گیا۔قریبی درخت سے دو کٹھل توڑ کر لایا ایک گھر لے جانے اور دوسرا انہیں کھلانے کے لیے۔ان کے پاس ہی بیٹھ کر وہ کٹھل بنانے لگا۔

کٹھل کی میٹھی میٹھی خوشبو اس کے نتھنوں میں گھسی جا رہی تھی۔ وقفے وقفے سے وہ انہیں مخاطب کرتا......''یہ کٹھل بہت ہی میٹھا ہے۔''

اس نے جلدی جلدی انہیں وہ کھلایا اور پھر بولا......''لو اب میں چلتا ہوں، دادی اماں میرے انتظار میں ہوں گی اور ہاں، آج مجھے ہاٹ (بازار) بھی جانا ہے۔''

اور انہوں نے اس کے چلے جانے کے بعد ربِ جلیل سے صرف ایک دعا مانگی۔

''اے باری تعالیٰ! اس متعدی بیماری سے تُو اسے محفوظ رکھیو۔جس کا ہاتھ کراہت سے بے نیاز ہمارے منہ میں بھات اور کٹھل ڈالتا ہے۔اے رب کریم۔تو اسے صحت اور عمر دراز دے کہ اس کے سینے میں فرشتے کا دل ہے اور وہ انسانوں کی اس بھری بستی میں اکیلا ہمارا مونس ہے۔''

دادی ماں کب سے ماتھے پر ہاتھ رکھے چولہے کے پاس بیٹھی تھیں۔اسے کندھے پر کٹھل اٹھائے آتے دیکھا تو غصے سے بولیں۔......''تم ان کے پاس چلے گئے تھے۔ باز نہیں

آتے ہو؟ ہزار بار کہا ہے یہ بیماری خطرناک ہے۔ پرہیز کیا کرو، پر تم ہو کہ چوبیس گھنٹے انہی میں گھسے رہتے ہو۔''

''ارے دادی ماں! وہ جو اپاہج بن کر یہاں آ گئے ہیں تو بولیں انہیں ہمارے سوا کون دیکھے گا؟ اتنے ڈھیر سارے لوگوں میں یوں بے کسی سے وہ مرجائیں تو یہ کتنی بری بات ہوگی۔''

''یہ تمہیں ان کی کچھ زیادہ ہی ممتا آ گئی ہے اور ان کا خون تو انہیں یہاں چھوڑ کر ڈھاکا کی ہوا کھانے چلا گیا ہے، اسے تو ان کا درد ہی نہ تھا۔''......دادی ماں سخت برہم تھیں۔

تب دادو ان کے پاس آئے اور بولے۔......''یہ جو کچھ کر رہا ہے ٹھیک کر رہا ہے۔ اس پر نکتہ چینی مت کرو۔ وہ مجبور اور بے بس انسان ہیں۔ ان کی سیوا خدا کی سب سے بڑی عبادت ہے۔''

اس نے نرم چٹائی باشا کے اندر بچھائی، کٹھل بنایا اور چیوڑا اگو کے ساتھ کھا کر اٹھ گیا۔ آج بدھوار تھا اور اسے ہاٹ جانا تھا۔ کئی چیزیں خریدنے والی تھیں۔ اس نے جال کندھے پر ڈالا اور جب وہ دھیرے دھیرے چپو چلا رہا تھا۔ اس کی پاٹ دار آواز قاضی نذرُالاسلام کے ''مکمل انسان'' کے جذبات کی ترجمانی میں بہت دور تک بکھر رہی تھی۔

وہ مبارک ساعت آ پہنچی۔

راستے کے دونوں طرف جس کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں۔

تمہاری خدمت کے لیے جس نے قلی اور مزدور کا روپ دھار لیا۔

تمہارا بارِ گناہ اٹھانے کے لیے جو ہمیشہ خاک آلود رہتا ہے۔

وہی صرف وہی مزدور مکمل انسان ہے۔

میں اسی کے گیت گاتا ہوں۔

اس کا ٹوٹا ہوا دل ایک نئی دنیا تعمیر کرے گا۔

''اے میرے اللہ! یہ کیسی مصیبت ہے کہ میں اسے اب دیکھ بھی نہیں سکتا۔ جس کے دیدار کے لیے میں یہاں آیا ہوں، پورے دس کوس کا فاصلہ طے کر کے۔ یہ ہاتھ ابھی تک سرخ ہیں، ان پر چھالے سے پڑ گئے ہیں۔ دس میل نوکا جو مجھے چلانا پڑا۔ میں اسے یہ سب کچھ کیسے بتاؤں، میرے تو چاروں طرف انسانوں کا ہجوم ہے۔ جی چاہتا ہے اسے دھکیل کر اس تک جا پہنچوں۔''

''ارے دادو! میں بھی انہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔''...... وہ لڑکا جھنجھلا کر چلایا۔

اور بنگال کے اس عالم نے پوتے کے اس جوش کا خیر مقدم کیا اور اس کے لیے جگہ بنائی تا کہ وہ اسے دیکھ سکے جو شہید سہروردی کے نام سے جانا جاتا ہے......''یہ تم ہو؟''......اس کی آنکھیں خوشی سے چمکیں اور وہ اپنے آپ سے بولا۔......''خدا کا شکر ہے کہ میں نے تمہیں دیکھا جس کی آرزو مجھے مدت سے تھی۔ کتنی کہانیاں سنی ہیں میں نے تمہارے متعلق؟ تمہاری آواز نرم اور ملائم ہے اور اس میں محبت کی باس ہے۔''

وہ انسانوں کا ایسا سمندر دیکھ رہا تھا جس میں سر ہی سر تیر رہے تھے۔ ان کے چہروں پر

غربت کا گہرا رنگ تھا۔ان کی دھوتیاں بھی پرانی اور گندی تھیں۔ان میں اکثریت ان کی تھی جو قمیصوں کی جگہ گنجیاں (بنیانیں) پہنے ہوئے تھے۔ان میں اکثر پاؤں سے ننگے تھے۔

تب اس نے بے اختیار سوچا...... ''یہ سب اسے دیکھنے،اسے ملنے اور سننے آئے ہیں۔ اس بارانی موسم میں اپنا وقت ضائع کر کے...... کیونکہ یہ ہمارے لیے ہندوؤں اور انگریزوں سے لڑ رہا ہے۔ایک ایسے ملک کے لیے جہاں ہم مسلمان آزادی سے رہ سکیں گے۔''

''ہم پاکستان چاہتے ہیں۔پاکستان جو ہمارا دیش ہوگا۔''

تب اس نے اتھاہ جذبے سے اپنی دلی آواز کو اس نعرے میں شامل کیا جو...... ''پاکستان ہو بے، پاکستان ہو بے'' ...... کی صدا بلند کر رہا تھا۔شام ڈھلے جب گھر آتے ہوئے دادو حیدر علی سے باتیں کر رہے تھے، تب حیدر علی نے پوچھا تھا کہ یہ عجیب بات نہیں چالیس سال قبل جس بنگال کی تقسیم کا ہندو شدت سے مخالف تھا، آج وہ خود اسے تقسیم کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رہا ہے۔

ارے بھئی! عجیب کیوں؟ جواب میں دادو نے کہا۔ ہندو ذہنیت تو پوری طرح عیاں تھی۔بس مسلمان سیاسی طور پر بالغ نہیں تھا۔1905ء میں مشرقی بنگال اور آسام کے صوبے کے قیام کا مقصد ہی مسلمانوں کی زبوں حالی کو بہتر بنانا تھا، طاقت کا توازن یکسر بگڑ گیا تھا۔لارڈ کرزن نے صورتِ حال کو بیلنس کرنے کے لیے یہ قدم اٹھایا تھا۔اب مسلمانوں کی سادہ لوحی تو دیکھو کہ احتجاجی تحریک کے اندرونِ خانہ مقاصد کو ہی نہ سمجھ سکے۔سودیشی تحریک میں مسلمانوں کی اکثریت نے بندے ماترم کے نعرے لگائے اور نواب سر سلیم اللہ کی سیاسی بصیرت کو چیلنج کیا۔

اُن کی ساری باتیں اس کے سر پر سے گزر رہی تھیں۔وہ تو بس ایک بات جاننے کے لیے بے کل تھا۔شاید اسی لیے اس نے دادو کا ہاتھ پکڑ کر زور سے کھینچا اور بولا۔

''دادو مجھے ایک بات بتائیں پہلے۔کیا آپ کو یقین ہے کہ پاکستان بن جانے سے ہمارے یہ دکھ درد دور ہو جائیں گے؟''

''بیٹو! یہ دکھ درد تو جیون بھر ساتھ ساتھ چلتے ہیں، پر یہ کتنی خوشی کی بات ہوگی کہ ہمارا اپنا ایک اسلامی دیش ہوگا جہاں کوئی کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔ کسی کا استحصال نہیں ہوگا۔ انصاف کے حصول کے لیے کوئی دقت نہ ہوگی۔''

''پردادو! جب پاکستان بن جائے گا تو بیماروں کو ہسپتال میں داخلہ ملے گا نا۔ ان کا علاج توجہ سے تو ہوگا نا۔ یہ عبدل چاچا جیسے لوگ اتنے مجبور تو نہ ہوں گے تب؟''

''مجھے اُمید ہے یہ مسائل فوری توجہ پائیں گے۔''...... دادو نے اس کی پشت پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا۔

خوش ہوکر اس نے اطمینان بھرا سانس لیا اور اپنے بازوؤں میں چپوؤں کو کھینے کے لیے ایک نئی طاقت اور جوش کا احساس پایا۔ اور جب وہ گھر پہنچے۔ باشا میں دِیے کی ہلکی ہلکی زردی، ملگجا اُجالا بکھیرے تھی۔ دادی ماں ان کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ وہ بچھی چٹائی کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔ نرم نرم چٹائی، انتظار کرتی شفیق دادی ماں اور چنگڑی ماچھ کی خوشبو یہ سب اسے بہت اچھا معلوم ہوا۔ وہ دادو سے بولا۔ ''یہ اپنا باڑی (گھر) بھی کیا چیز ہے دادو!''

ہاں بیٹے یہ راجباڑی ہو یا اسی طرح ٹوٹی پھوٹی باشا، انسان اس میں سکون پاتا ہے۔

دادی ماں نے تھالیوں میں بھات نکالا اور وہ بے صبری سے کھانے پر ٹوٹ پڑا، بھوک بھی تو بہت لگی تھی اسے۔

تب دادی نے ان دونوں کی طرف دیکھا اور کہا ''مولوی خلیل ڈھاکا سے آیا ہے۔ بہو نے شلپی کو بلایا ہے۔''

''کیوں؟''...... اس نے ناگواری سے کہا اور منہ کی طرف لقمہ لے جاتا ہاتھ روک لیا۔

''ماں جو ہوئی وہ تیری بچہ۔ یاد آتا ہوگا اسے، ملنا چاہتی ہوگی۔''

''لو ابھی پچھلے دنوں تو مل کر آیا ہوں، اتنی جلدی اداس بھی ہوگئیں؟ اکیلی تو نہیں ہیں وہ، نذرل چاچا، فخر اور بابا بھی تو ہیں۔''

''تُو اپنی جگہ ہے بیٹو! تیرا چاچا اور فخر اپنی جگہ ہیں۔ وہ تیری کمی تو پوری نہیں کر سکتے۔''
دادی ماں نے رسان سے کہا۔

''ارے دادی ماں! میں نہیں جاتا بس۔ من گھبراتا ہے میرا وہاں۔''...... وہ ان کے پاس قطعی نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہاں اس کے بابا جنھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے چودھویں جماعت تک پڑھا تھا، اس پر بہت سختی کرتے تھے۔ گھومنے پھرنے کا کوئی موقع تو نصیب سے ہی ملتا تھا۔ اسے تو وہ کہانیاں بھی سننے کو نہ ملتیں جن کا وہ حد درجہ رسیا تھا۔ یوں بھی رات بھر میں وہ کئی مرتبہ جاگتا اور دادو کا نرم نرم محبت بھرا وجود اپنے پاس نہ پا کر تشنگی محسوس کرتا، گو اسے وہاں کھانے کو کبھی کبھی موسمی پھل ضرور ملتے جن کی شکل اسے یہاں نظر نہ آتی پر پھر بھی اسے ان کی اتنی لمبی چوڑی تمنا نہ تھی۔ اسے اس کھلی فضا میں دادو اور دادی ماں کی سنگت میں کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہوتی اور اب تو اور بھی بہت سی ذمہ داریاں اس کی جان کے ساتھ چمٹی ہوئی تھیں۔ یہ عبدل چاچا اور ان کی بیوی تو بس مر ہی جائیں گے۔ انہیں کون دیکھے گا؟ روز شام ڈھلے وہ عبداللہ اور دوسرے لڑکوں کے ساتھ مسلم لیگ کا جھنڈا لہراتا ہے۔ وہ اگر چلا گیا تو اسے کون لہرائے گا؟ اور یہاں ہر روز باشا میں دادو اور دوسرے مسلمان جو سیاست پر اتنی دلچسپ باتیں کرتے ہیں، وہاں تو یہ باتیں بھی سننے کو نہیں ملیں گی۔

اس نے خود سے کہا...... ''شریر جانے مٹی کیوں ہوا جا رہا ہے اور من بھی کیسا اجڑا، اجڑا ہے؟ کسی کام کرنے پر طبیعت ہی مائل نہیں۔''

یوں کام کرنے کی اسے کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس گھر میں تھوک کے حساب سے نوکر تھے۔ پر رسوئی گھر کا بیشتر کام اسے ہی کرنا پڑتا تھا۔ اس کا سسر ڈاکٹر جو چند سال قبل بنگال کا وزیرِ صحت تھا، کھانے پینے اور برتنوں کی صفائی کے سلسلے میں کچھ زیادہ ہی محتاط رہتا تھا۔ یوں گھر میں کچھ زیادہ افراد بھی نہ تھے۔ وہ تھی اس کا سسر اور شوہر۔

ملازم چھوکرا سینی لیے اندر آیا۔ اس نے رومال میں لپٹی چپاتیوں کو کھول کر دیکھا، یہ جاننے کے لیے کہ اس کے بیمار سسر نے کچھ کھایا بھی ہے کہ نہیں؟ وہ ملول ہوئی، تین روٹیوں میں سے ڈھائی جوں کی توں تھیں اور وہ بھی لکڑی ہو رہی تھیں۔

''رام! بنگال کی عورت کو کبھی اچھی روٹی بنانی نہ آئے گی۔ اب اگر یہ نرم ہوتیں تو وہ کم از کم ایک تو ضرور کھاتا۔''

اس نے سینی پرے کی۔ پتیلی کا ڈھکن اٹھایا۔ ایلش ماچھ کی خوشبو اس کے نتھنوں میں گھسی

پر اس کی بھوک نہ چمکی۔

اداسی سے اس نے باہر دیکھا۔ رسوئی گھر سے اسے اپنی راجباڑی کا کشادہ آنگن نظر آ رہا تھا۔ کرشنو چوڑا کے درختوں میں آگ لگی تھی، کیلے کے درخت پھل سے جھکے پڑے تھے۔ مالوتی کے بوٹے نکھرے نکھرے کھڑے تھے۔ اوپر بادل گھرے تھے۔ بارش کھل کر برسی تھی اور ابھی اور برسنا چاہتی تھی۔

وہ اُٹھی، ساڑھی کا آنچل اس نے پشت پر پھینکا۔ کونے سے بندھا ہوا چابیوں کا گچھا کمر پر لگا تو اسے خفیف سی چوٹ کا احساس ہوا۔ آلتا لگے گورے گورے ننگے پاؤں فرش پر بیزاری سے مارتی وہ کمرے میں آ گئی۔ درگا کی خوبصورت مورتی سامنے کھڑی تھی، اسے میمن سنگھ کے کمہاروں نے آنے والے درگا پوجا کے تہوار کے لیے تراش کر اس کے سسر کو خصوصی تحفہ بھیجا تھا۔

''کون جانے ہم یہ تہوار اس سال منا بھی سکیں گے۔''......ایک آہ اس کے دل سے نکلی اور نم آنکھوں سے وہ مورتی کے سامنے دوزانو ہوگئی۔

یہاں بہت شور تھا۔ اس عظیم الشان ورثہ کو، جس کا نام ہندوستان تھا، تقسیم کرنے کی خطرناک سازشیں ہو رہی تھیں۔ اسے یہی سمجھ نہ آ رہی تھی کہ یہ پُراسرار سا ہندوستان جو فلسفہ، آرٹ، موسیقی، ادب اور تصوف کی گتھیوں میں الجھا ہوا ہے، اس کی یہ اقدار ایک سے دو کیسے ہو جائیں گی؟

اس کا دل یوں بھی ڈوبتا تھا کہ یہ اگر ایک سے دو ہو گیا، تب وہ کلکتہ اپنے ماں باپ کے گھر جلدی جلدی نہ جا سکے گی۔ پاسپورٹ اور ویزا کے چکروں میں الجھ جائے گی کیونکہ اس کا سسر اپنی راجباڑی اور زمین چھوڑ کر کلکتہ نقل مکانی پر تیار نہ تھا۔ اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگا تھا۔

تو میرا خوبصورت کلکتہ، جسے مشرق کا لندن کہا جاتا ہے، مجھ سے چھن جائے گا؟ بارک پور کے عالی شان کنٹری ہاؤس اور دریا کے کنارے کنارے گارڈن ہاؤس دیکھنے میں نہ آئیں گے؟ میرے کلکتہ کے عالی شان ہوٹل، اس کی فراخ سڑکیں، چورنگی کے بھانت بھانت کے

لوگ، دھرم تلہ میں رہنے والی میری موسیاں، مانک تلہ کے عالی شان مکانوں میں رہنے والے میرے چچا، جن کے برآمدوں میں فرن کے پتے خنک ہواسے جھومتے ہیں تو جیون چند لمحوں کے لیے بے حد سندر لگتا ہے۔ یہ سب میرے لیے اجنبی ہو جائے گا۔

اس کی آنکھیں چھلکیں اور موٹے موٹے آنسو گالوں پر بہتے رہے۔

باہر کوئی جلوس گزر رہا تھا...... پاکستان پاکستان ہو رہا تھا۔ نا قابل برداشت درد اسے اپنے سینے میں محسوس ہوا، وہ اس لفظ کو سننا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لیے۔

''یہ پاگل ہو گئے ہیں۔ ہمیں صرف سوراج چاہیے۔''

تب پانچ فٹ پانچ انچ کا ایک نوجوان جس کے بال سیاہ اور گھنگریالے تھے اور جس نے باریک کرتا اور دھوتی پہن رکھی تھی۔ وہاں آیا۔ اس نے گاجر رنگی ساڑھی میں اسے کھڑکی کے پاس کھڑے دیکھا جسے وہ صرف تین ماہ پہلے بیاہ کر یہاں کو میلا لایا تھا۔ وہ کچھ دیر اس کے پیچھے کھڑا رہا پھر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا...... ''کیا دیکھتی ہو باہر؟ سومیتا! وہی پرانی چیزیں ہیں۔''

اور اس نے جب رُخ پھیرا تو اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ بے چین ہو گیا۔ انگلیوں کی پوروں سے اس نے اس کی آنکھوں کو بند کیا۔ آنسو ادھر ادھر ڈھلک گئے پر اس کے ساتھ ہی وہ سسک پڑی۔

''رنیش کیا ہونے والا ہے؟ میرا پیل پایوں جھلمبیلوں کے برآمدوں والا گھر مجھ سے چھن جائے گا۔ میں اپنے ماما کی بیٹیوں کے ساتھ مل کر اب کالی گھاٹ نہ جا سکوں گی؟ ٹیگور کی چتر نگدا کے گیت گاتے ہوئے میری بہنوں کی آنکھیں بھر بھر آئیں گی؟ بھارت ناٹیم کرتے ہوئے شنیلا کہے گی...... ''سومیتا دیدی کے بنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔...... رنیش! کلکتہ مجھ سے جدا ہو رہا ہے۔ آبی راستے بند ہو رہے ہیں۔ ریلیں نہیں چلا کریں گی، حدیں کھنچ جائیں گی اور اِس پار

اور اُس پار خلیجیں حائل ہو جائیں گی۔ جنہیں من چاہنے پر پاٹا نہیں جائے گا۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ رنیش بھارت ماتا کو اکھنڈ کیوں کیا جا رہا ہے؟''

اور اس نے اس کے جوڑے سے نکلی بالوں کی ایک پتلی لٹ کو انگلیوں سے مسلا اور رسان سے بولا۔...... ''حوصلہ کرو سویتا! انسانوں پر بہت کڑے وقت آتے ہیں۔''

''یہ تم کہتے ہو؟ میرا تو من جیون سے اوبھ گیا ہے۔''

اور اس کے ہونٹوں پر بے بس سی مسکراہٹ آئی۔...... ''حالات جس نہج پر تیزی سے جا رہے ہیں ان پر اس سے ہمارا کوئی بس نہیں۔ میں مانتا ہوں سویتا اسے برداشت کرنا بہت کٹھن ہے پر اسے برداشت کرنا ہوگا۔''

وہ رکا۔ اس نے گہری اداسی سے باہر دیکھا...... کیلوں کے گچھے لٹک رہے تھے۔ تب اس نے اس کی لانبی پلکوں کو چھوا اور بولا۔...... ''ہمیں وقت کا انتظار کرنا ہوگا۔ اگر حالات سے فائدہ اٹھایا گیا اور کوششیں صحیح سمت میں لگائی گئیں تو یقیناً ایک دن تم یہ ضرور سنو گی کہ ٹکڑے کرنے والے ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ آؤ چلو کھانا کھائیں۔''

اس نے گیلی آنکھوں کو اوپر اٹھایا، ان میں بے یقینی نمایاں تھی۔ اس کے شوہر نے اسے پڑھا اور کہا...... ''سویتا! شکست نے کبھی سبق نہیں سکھایا، اس سے سبق سیکھنا پڑتا ہے اور ہم نے سیکھنے کا عزم کر لیا ہے۔''

آج جب اس نے اپنی دھوتی کے ڈب سے ایک پیسہ نکالا تو اسے دُکھ ہوا۔ فیری گھڑ گھڑ کرتی کنارے سے لگ گئی تھی۔ لوگ دھڑا دھڑ اُتر رہے تھے اور جب وہ اپنے سبز رس دار خوشبوئیں اڑاتے آموں کے ٹوکرے کو اٹھانے کے لیے جھکا تو بُڑبڑایا۔

''یہ حرامزادہ اب یہیں بیٹھا رہے گا، ہماری چھاتی پر مونگ دلنے کو...... جا کیوں نہیں چلتا کلکتے۔ یہ دیش اب ہمارا ہے، اس کا یہاں کوئی کام نہیں۔''

ابھی ہاٹ بہت دور تھا۔ راستے میں کتنے ہی ندی نالے آتے تھے۔ باقی جگہوں پر تو کسی نہ کسی یار بیلی کی ڈونگی سے کام چل جاتا تھا پر اس ایک سوا سی گز چوڑے دریا پر داس بابو نے فیری چلا رکھی تھی جو ایک پیسہ فی آدمی کے حساب سے کرایہ لیتی تھی۔ آموں سے بھرا ٹوکرا ہاٹ میں پانچ چھ آنے میں اٹھتا۔ اس کے آم بَن گاؤں سے کھلنا پہنچتے تھے۔

اور جب وہ سوکھا مریل سا چھوکرا اس سے کرایہ لینے کو آیا تو اس نے بے رخی سے پیسہ اس کی طرف پھینکا اور اپنے ساتھی سے بولا!...... ''نورالانوار! اب تو پاکستان بن گیا ہے یہ داس بابو کب دفع ہوگا؟''

''دیکھو اللہ سب ٹھیک کرے گا۔ اس نے پاکستان ہمیں دے دیا، اب اس سے بھی ہماری جان وہی چھڑائے گا۔''

اور بارش کے قطرے اپنی ننگی کمر پر ایک ہاتھ سے پونچھتے ہوئے اس نے آموں کے جھنڈوں کو دیکھا اور بولا! ..... ''ہاں! مولا کا کرم ہے۔ اپنے جیون میں تو مجھے اس دن کی آس نہ تھی۔''

اور پدما کی ان بیکراں لہروں پر تیرتی کشتیوں کے مٹیالے بادبانوں کو انہوں نے ڈھیلا کیا۔ انہیں کنارے لگایا اور زمین پر قدم رکھا۔ وہ ہنستے شور مچاتے ایک دوسرے کی طرف بڑھے اور گلے ملے۔ ان کے قہقہے اس خاموش فضا میں گونجے جہاں ناریل کے درختوں کی بہتات تھی۔ تب ڈاب کاٹ کاٹ کر پیتے ہوئے انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ انگریز اور ہندو جاگیرداروں کے چنگل سے آزاد ہوئے ہیں۔ یہاں انہوں نے اس نئے ملک کی سلامتی اور بقا کے لیے بھی دعائیں مانگیں۔ وہ تعداد میں سات تھے۔ ان کی عمریں بیس اور تیس کے درمیان تھیں۔ رنگ برنگی میلی کچیلی دھوتیاں، لنگوٹیوں کی شکل میں ان کے تن پر بندھی ہوئی تھیں۔ سیاہ جلد چمک رہی تھی۔ یہ وہ تھے جو سالہا سال سے یہی کام کر رہے تھے پر پھر بھی پیٹ پالنا ان کے لیے مشکل تھا۔ پو پھٹنے سے بہت پہلے وہ اپنے جالوں کو دریا میں پھینکتے۔ مچھلیاں پکڑتے اور انہیں شہر میں اونے پونے بیچ آتے۔

آج وہ خوش تھے پر ان میں وہ مخلص الرحمٰن جو ابھی بیس سے بھی کچھ کم ہی تھا، اداس تھا۔ اس کی پاربتی جو جا رہی تھی۔ اس کے بغیر وہ بھلا کیسے جی سکے گا؟ یہی اسے سمجھ نہ آ رہی تھی اور یوں یہ اس کا بھی دیش تھا۔ اس کی جنم بھومی تھا۔ کیسے روئی تھی وہ رات اس کے سینے سے لگ کر۔ تب اس نے گھٹی گھٹی آواز میں اس سے کہا تھا۔ تم مت جاؤ یہیں رہ جاؤ۔

پر وہ سسکتے ہوئے بولی۔ ''نہیں یہ دیش اب مسلمانوں کا ہے۔ ماتا کہتی ہیں کہ وہ ہمیں مار ڈالیں گے کیونکہ اب ان کی تعداد زیادہ ہو جائے گی اور یوں بھی ہم تو زمیندار بابو کے خادم ہیں

جہاں وہ جائیں گے ہمیں وہیں جانا پڑے گا۔''

وہ چپ رہا۔ کہتا بھی کیا؟ پاربتی کے ہم مذہبوں نے تو اس کی قوم کو اقتصادی موت مار ڈالا تھا۔ اب مسلمان حاکم آ جائیں گے تو وہ ان سے نہ جانے کیسا سلوک کریں وہ اسے ٹھہرنے پر زور بھی دیتا تو کس بل بوتے پر؟

بدلیاں جھوم جھوم کر آ رہی تھیں۔ وہ اٹھے، انہوں نے کشتیوں میں پڑے جالوں میں تڑپتی مچھلیوں کو نکالا اور شہر کی جانب ایک نئے عزم کے ساتھ چل دیے۔

یہاں سلہٹ کی ان اونچی نیچی سرسبز پہاڑیوں پر پودوں سے چائے کے پتے توڑتے ہوئے اسے بے حد تھکان کا احساس ہوا۔ اس کی آنکھیں درد کر رہی تھیں اور جی بھی ماندا تھا۔ ان دنوں اس کے کام کی رفتار بہت سست تھی، دن بھر میں من پتے بھی نہ توڑ پاتی۔ پیٹ میں ایک اور جان بھی کلبل کلبل کرتی تھی۔ اللہ ماری جانے کیسی شیطانی روح تھی جو اسے کسی پل چین ہی نہ لینے دیتی۔

کمر کے پیچھے لٹکی ٹوکری اب بھر رہی تھی اور اٹھانی مشکل ہو رہی تھی۔ رابعہ نے جو اسے یوں ڈھیلا ڈھیلا دیکھا تو بولی...... ''سلطان کیا کرتا ہے؟ وہ پتے کاہے کو نہیں توڑتا؟''

''اے کیا کہوں؟ وہ وہاں باشا میں تاڑی پیتا ہے اور پاکستان کی باتیں کرتا ہے۔ بولتا ہے، سوراج مل گیا ہے۔ سلہٹ پاکستان میں آ گیا ہے۔ میں کہوں ہمیں کیا فرق پڑا؟ تو چلاتا ہے اور گالیاں دیتا ہے۔''

اور نارائن گنج کے اس گاؤں میں گھٹنوں گھٹنوں پانی کھڑا تھا۔ وہ اب تھک گیا تھا، اس نے ایک نظر اپنے بابا کو دیکھا۔ جس کا پیٹ ساتھ چپکا ہوا تھا۔ ریڑھ کی ہڈی بہت ابھری ہوئی تھی اور جو وقت سے بہت پہلے بوڑھا ہو گیا تھا۔

''بابا تم آرام کرو باقی کام میں کیے لوں گا۔''

یہ ابو منصور تھا۔ کہنے کو وہ بائیس تیئس سال کا تھا پر اس کی صورت دیکھ کر یہی جان پڑتا تھا

کہ اس نے پانچ چھ سال یونہی ہضم کر لیے ہیں۔ تھکن کے باوجود اس کے چہرے پر بشاشت تھی۔ اسے اپنے گرد و پیش کی ہر چیز بہت سندر نظر آ رہی تھی۔ یہ کھیت جس میں وہ اس وقت کھڑا تھا، پار سال دریا کاٹ کر لے گیا تھا۔ یہی تو ان کی کُل کائنات تھی۔ اللہ نے کرم کیا۔ دوہری خوشیاں دکھائیں۔ کھیت بھی اس سال دریا چھوڑ گیا اور پاکستان بھی انہیں مل گیا۔

اور وہ لڑکا جو پاکستان بن جانے کی خوشی اس دھوم دھام سے منا رہا تھا کہ کسی طرف متوجہ ہی نہ ہو سکا تھا۔ اب چونکا۔ دادو بہت خاموش تھے اور پریشان بھی۔

''ارے! یہ دادو خوش نہیں۔ اب یہ کیوں چپ ہیں؟ پاکستان تو ہمیں مل گیا ہے۔''

تب وہ ان کے پاس جا بیٹھا۔ ایک ٹک انہیں پڑھتے دیکھتا رہا۔ تب بولا۔ ''دادو!''

انہوں نے کتاب پر جھکا سر اٹھایا، نظر بھر کر اس لڑکے کو دیکھا جو انہیں مایوسی سے دیکھ رہا تھا اور پوچھا۔ ''یہ جھنڈا جو تم نے باشا پر لہرا رکھا ہے۔ بہت اچھا ہے کس نے بنایا ہے؟''

''میں نے اور عبداللہ کی بہن جھرنا نے۔ دادی ماں کی سبز ساڑھی پھٹ گئی تھی، بس اسی سے بنایا ہے۔

''دادو!'' ......وہ کچھ دیر بعد بولا...... ''آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟''

اور فی الواقع وہ بہت پریشان تھے۔ ڈھیر سارے لوگوں میں بیٹھ کر اور ان سے باتیں کرتے ہوئے ان کی آنکھیں بار بار بھیگتیں۔ ان کی آواز کبھی تیز اور کبھی ڈوب جاتی۔ ایسے دکھ کے سمے ان کا من کتابوں میں بھی نہ لگتا۔ وہ جو رسیا تھے پڑھنے کے۔ اب کتاب اٹھاتے، اس پر نظریں جماتے اور اُکتا کر پھینک دیتے۔ کیسی عجیب بات تھی کہ وہ اُداس تھے۔ انہوں نے تو منزل پا لی تھی۔ جس دیش کی تمنا کی تھی وہ انہیں مل گیا تھا پر پھر بھی اداسی طاری تھی اُن پر۔ یہ بہار اور پنجاب میں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح جو بہنے لگا تھا۔ اس نے تو انہیں اس نئے دیش کی خوشی منانے کی مہلت بھی نہ دی تھی۔

''دادو! میں نے آپ سے کیا پوچھا ہے؟'' ......انہیں یوں دیکھ کر اس لڑکے کا دل

کٹنے لگا تھا۔

''بچہ! یہ مسلمانوں کا قتلِ عام جو ہو رہا ہے۔''

اسے ان کے تفکر کا تھوڑا اندازہ ہوا، پھر وہ بولا۔''آپ اتنے پریشان نہ ہوں۔ وہ لوگ تو اتنی دور ہیں آپ سے۔''

''یہ تم ابھی نہیں سمجھ سکتے۔ جوان ہو جاؤ گے تو معلوم ہوگا کہ یہ روحوں کا تعلق ہے جس میں فاصلوں کی کوئی گنجائش نہیں۔''......انہوں نے اپنے آپ سے کہتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں۔

اور جب اسے نوکر نے یہ اطلاع دی کہ باہر منورنجن گپتا آئے ہیں تو ایک لمحے کے لیے وہ حیران ہوا، اس نے اپنے خادم کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں شناخت کا یقین پا کر اس نے ستار خود سے جدا کیا اور اپنی دھرم پتنی کی طرف جھکا جو قالین پر تکیوں کے سہارے نیم دراز تھی۔

''سومیتا! تم نے سنا؟ گپتا آیا ہے۔''

اس نے اپنی بیمار آنکھوں کو پوری طرح کھولا اور نحیف سی آواز سے کہا۔

''مَیں حیران ہوں کہ گپتا دادا (ہندو بنگال میں رشتے کے بڑے بھائیوں کو عام طور پر دادا کہتے ہیں) اتنے عرصے بعد کہاں سے ایکا ایکی آ گیا ہے۔''

''تھا تو یہیں شمالی ہند میں ہی، بس ہڈ حرام ہے۔ پتر لکھنا تو عذاب سمجھتا ہے۔''

''میں تو خوب لڑوں گی۔ ہمیشہ کہتا تھا کہ تیرے گونا پر تجھے بہت نفیس تحفہ دوں گا پر تحفہ دینا تو در کنار خود بھی نہ آیا۔ رنیش! یہیں بلا لو نا۔''

''یہاں اس نے اس کی ملگجی ساڑھی اور بکھرے بالوں کو بغور دیکھا اور بولا'' یہاں بلانا کچھ مناسب نہیں رہے گا۔ چلو میں تمہیں ڈرائنگ روم میں لے چلوں، وہ بھی وہیں ہو گا۔''

اور جب اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ چکرا کر تکیوں پر گری، اس کے دھرم پتی نے بیتاب ہوکر اس کے نازک سے وجود کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اس کا رنگ پیلا ہو رہا تھا اور سانس بھی بہت تیز تھا۔ اس کی سندر سی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھتے ہوئے اس نے بھاری غمگین آواز میں کہا۔

''سومیتا! کمر تو میری بھی ٹوٹ گئی ہے پر تم نے یہ کیسا روگ جان کو لگا لیا ہے؟ یہ غم تو مردوں کے کرنے کے ہیں۔ کوئی یوں بھی ہلکان ہوتا ہے؟''

اس نے اناس کا رس گھونٹ گھونٹ اسے پلایا اور جب اسے کچھ توانائی محسوس ہوئی تو بولی۔ رنیش! تم جاؤ۔ گپتا دادا انتظار میں ہوگا۔''

اسے کمرے ہی میں چھوڑ کر وہ ڈرائنگ روم میں آیا۔ طویل عرصے بعد ملنے والے دو دوست جب اچھی طرح مل چکے تو اس نے کہا۔

''تمہیں مبارک ہو! سومیتا کیسی ہے؟''

''اب کیا بتاؤں! اس تقسیم نے تو اس پر اس درجہ ذہنی و جذباتی اثر ڈالا ہے کہ وہ اس نئے وجود سے بھی محروم ہوگئی ہے جو اس کے اندر تین ماہ سے پرورش پا رہا تھا۔ تمہارے آنے سے قبل میں اسے موسیقی سے بہلا رہا تھا۔ چلو! وہ تمہیں ملنا چاہتی ہے۔''

وہ اپنے اس رشتے کے بھائی کو تقریباً دو سال بعد دیکھ رہی تھی، وہ کچھ دبلا ہو رہا تھا پر اس کا رنگ نکھرا ہوا تھا۔

''گپتا دادا! تم نے تو بنگال سے اپنا ناطہ ہی توڑ لیا ہے۔ ادھر جی بہت لگ گیا ہے تمہارا کیا؟''

وہ دیر تک ذاتی باتیں کرتے رہے۔ جب رنیش نے اس سے پوچھا۔ ''کچھ ادھر کا حال سناؤ۔''

''حال سب جگہ ایک سا ہے۔ میں کہتا ہوں ہندو کو اب سیاست سے کنارا کشی کر لینی

چاہیے۔ یہ اب اس کے بس کا روگ نہیں۔''

''پر گیتا! یہ طوفان ہی کچھ ایسا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔''

''ارے لعنت بھیجو اس طوفان پر۔ کانگریس کی سیاست پھر کیا ہوئی؟''...... ''یعنی کل آپ سے خالصتان کا مطالبہ ہوگا۔ گاندھی جی تھال میں ڈال کر انہیں پیش کر دیں گے؟''

''بھئی گاندھی کو مورد الزام تو مت ٹھہراؤ...... ان جیسا زیرک اور نبض شناس لیڈر ہندوستان کبھی پیدا نہیں کر سکتا۔ اب دیکھو تحریکِ خلافت کی افادیت صرف گاندھی نے سمجھی اور مسلمانوں کی اس تحریک کی حمایت کر کے سالوں تک ان کے مسلمہ لیڈر بن کر بندے ماترم اور گاندھی کی جے کے ان سے بھی نعرے لگوائے۔ حماقتیں تو کانگریس کے لیڈروں نے کیں۔ اب سوامی شردھانند کو شدھی تحریک کا برسر عام پرچار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مسلمان جذباتی اور احمق قوم۔ جو کانگریس تحریک خلافت میں اسی شردھانند کو دلی کی جامع مسجد کے منبر سے خطاب کرواتی ہے۔''

''مگر میں کہتا ہوں''...... گیتا کی آواز جوش غضب سے کانپ رہی تھی...... ''یہ ہمارے پرکھوں کا ہند ہے، باہر سے آئے ہوئے ان اٹھائی گیروں کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ وہ اس کا بٹوارہ کرتے پھریں؟ اور تمہارے اس بنگال نے تو لٹیا ہی ڈبو دی۔ سارا عاشق ہے جناح پر۔ تم لوگ بھی یار بو نگے نکلے۔ فضل الحق کو بھی استعمال نہ کر سکے۔''

''واہ گیتا!...... فضل الحق کی حقیقت سن لو پھر کہنا۔''

میمن سنگھ کا ایک سٹیشن جمال پور ہے جہاں ایک بڑا جلسہ تھا۔ فضل الحق جونہی سٹیج پر آئے، لوگوں نے شور مچا دیا...... ''نہیں، واپس، واپس، واپس جاؤ فضلو بھائی! ہم تمہیں سننا نہیں چاہتے۔''...... فضل الحق حیران پریشان چند لمحے سوچنے کے بعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ قبرستان کی طرف چلنے لگے۔ اب لوگ حیران۔ انہوں نے بھی تعاقب کیا۔ قبرستان کے عین مرکز میں کھڑے ہو کر انہوں نے شیر جیسی آواز میں قبروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا...... ''دیکھ

لو میرے سنگی میرے ساتھیو۔ تمہارے بیٹوں اور عزیزوں نے مجھے سننے سے انکار کر دیا ہے۔''......اتنی جذباتی اپیل پر مجمع نے رونا شروع کر دیا اور ساتھ ہی شیرِ بنگال جندہ باد کے نعرے شروع ہو گئے۔

مگر الیکشن میں ووٹ جناح کو دیے اور فضل الحق کے امیدوار کی ضمانت ضبط کروادی۔

''اب دوسرا واقعہ سن لو ذرا...... باقر گنج جو فضل الحق کا آبائی وطن ہے۔ وہاں کے طلبہ نے قائداعظم کو لکھا۔

''ہم آپ کو خوش آمدید کہنے کو بے قرار ہیں۔ آپ کی آمد کی خبر نے ہمارے تنِ مردہ میں زندگی کی روح پھونک دی ہے۔ آپ خود دیکھیں گے کہ آپ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والے شیرِ بنگال کو ہم نے اس کے اپنے ضلع میں کیسے زیر کیا ہے۔''

آخر میں طلبہ نے لکھا تھا۔

''ہم ہیں آپ کے چاہنے والے۔''

''ابھی گپتا! وقت نہیں آیا...... تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو والی پالیسی پر چلو۔''

''کیا کہتے ہو بنگال کے بارے میں؟''...... گپتا نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''کہنا کیا ہے۔ پہلے کلکتہ کی منڈی تھا، اب پنجاب کی ہو جائے گا۔''

رنیش نے بے حد گہری نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

''پر انہیں اپنی کثرت کا بہت خیال ہے۔''...... گپتا بولا۔

رنیش کھلکھلا کر ہنسا۔

''کام کے نہ کاج کے دشمن اناج کے۔ کثرت پر نازاں ہیں، پنجاب اس پر چھائے گا نہیں تو اور کیا ہوگا اور دیکھو یہی اس کا مقامِ گرفت ہوگا۔''

تب ان سب نے پوچھا۔.....''ہوں، تو شبلی! کوئی نئی خبر؟''

اور اماوس رات کے ان لمحوں میں، جب ہوا بانس کے درختوں سے ٹکرا کر سائیں سائیں کرتی تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ اب انہیں کیا بتائے کہ اس کے پاس نت نئی خبروں کا سارا اسٹاک ختم ہو گیا ہے اور اپنے ان ساتھیوں پر معلومات کا رعب جھاڑنے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ پھر بھی وہ بولا۔''دادو کہتے ہیں کہ اب پاکستان بن گیا ہے۔ تم لوگ محنت سے پڑھو اور قابل بنو تا کہ اس نئے دیش کی خدمت کر سکو۔''

یوں اسے اس بات کا افسوس بھی تھا کہ خبروں کا سارا جوش و خروش ختم ہو گیا ہے۔ دادو کے وقت کا کچھ حصہ کھیتوں اور بقیہ مطالعے میں گزرتا۔ وہ اپنی کتابوں میں جُتا رہتا یا پھر کھیتوں میں کام کرتا۔ اس کا وہ ذہن جو ہمہ وقت پاکستان سے متعلق خبریں جاننے، جھنڈے بنانے اور ساتھیوں کے ساتھ نت نئی ترکیبوں کے تانے بانے میں الجھا رہتا، اب ایک دم پُرسکون تھا اور یہی سکون اکثر اسے اذیت ناک محسوس ہوتا۔

''پر شبلی! تمہارے دادو نئی حکومت کے بارے میں کچھ تو بتاتے ہوں گے؟'' تمیز الدین نے پوچھا۔

''کچھ نہیں بتاتے اب وہ۔ ایک بات ہے تمیج! یہ خبروں میں اب کوئی کشش نہیں رہی''......وہ قدرے اکتاہٹ سے بولا۔

اور یہ بات تو وہ اپنے ساتھیوں سے یکسر چھپا گیا تھا کہ ابھی چند دن پہلے دادو اس کے دیر تک باہر رہنے اور پڑھنے میں عدم دلچسپی پر ناراض ہوئے تھے......''تم نہیں جانتے ہو!''......وہ خفگی سے بولے تھے......''ہم نے کیسے پڑھا...... یہ کاغذ جو آج تمہیں حاصل ہے، ہمیں کب میسر تھا؟ ہم نے تو لکھنا کیلے کے پتوں پر سیکھا تھا۔ ہمارے وقتوں میں سلیٹ، تختی کہاں تھی؟ روشنائی ہنڈیا کے نیچے لگی کالک سے بناتے تھے۔ کوسوں چل کر کسی کے گھر میں پڑھنے جاتے تھے۔ دو لفظ کسی نے بتا دیے تو اس کا احسان مانتے تھے۔ بچے! قدر کرو وقت کی اور چیزوں کی۔ جی جان سے محنت کرو کہ سب بھاگ اسی سے لگتے ہیں۔''

یہ عبدل چاچا کی باشاتھی جوان کے مرنے کے بعد اب خالی ہی تھی اور یہیں وہ دیے کی مدھم روشنی میں ایک دوسرے کے قریب قریب بیٹھے تھے۔ اسے عبدل چاچا کے مرنے کا کچھ اتنا غم نہ تھا بلکہ وہ ان سے آخری دنوں میں ناراض ہو گیا تھا۔ پاکستان بننے کی خوشخبری انہیں سنانے کے لیے وہ کیسے بھاگا بھاگا ان کے پاس گیا تھا پر وہ اتنی سرد مہری سے بولے تھے......''ارے بچہ! تُو نہیں جانتا پاکستان بن جائے یا یہ ہندوستان رہے، ہمیں تو جیون نے ایک بات سکھائی ہے کہ غریب کو دال بھات کبھی نہیں ملے گا۔ دیکھ نا! ان داغوں کا پھیلاؤ کتنا بڑھ گیا ہے؟ موت کا انتظار ہے جواب آ بھی نہیں چکتی۔ مجھے بتا کہ میں کاہے کی خوشی مناؤں؟ یہ غریب پر جا تو یونہی سسک سسک کر مر جائے گی۔ ارے بچہ! یہاں کون سراج الدولہ بیٹھا ہے جو انہیں سنے گا۔''

ان کی ان باتوں پر اس نے بہت غصہ کھایا...... کتنے عجیب ہیں یہ عبدل چاچا بھی!......وہ خود سے بولا اور بوجھل دل سے گھر لوٹ آیا۔

''دادو، عبدل چاچا کو پاکستان کی ذرا خوشی نہیں۔ انہیں مسلمانوں کے کٹنے مرنے کا بھی کوئی دکھ نہیں۔''......اس نے دادو کے سامنے اپنے غم کا اظہار کیا۔

''بیمار ہے نا بیٹے! جب انسان کو شانتی نہ ملے تو وہ بد دل ہو جاتا ہے۔ تب کوئی چیز اچھی نہیں لگتی۔''

''پر دادو! وہ ڈلڈل کا بابا کتنا بیمار ہے لیکن کہتا تھا کہ کوئی ہماری جان لے لے اور اس کے عوض ہمیں پاکستان دے دے۔''

''ہاں بچہ! ہر آدمی ایک جیسے خیال کا مالک نہیں ہوتا۔'' انہوں نے آہستگی سے کہا۔

''نہیں دادو! عبدل چاچا کو تو خوش ہونا چاہیے تھا۔ ان کو اگر شانتی نہیں ملی تو کیا ہوا؟ پاکستان بننے سے لاکھوں لوگ تو شانت ہو گئے ہیں نا!''

وہ خاصا پریشان جان پڑتا تھا۔ آنکھوں میں کچھ کہنے کی تشنگی تھی پر معلوم ہوتا تھا کہ اپنے مافی الضمیر کو صحیح ادا نہیں کر پا رہا ہے۔

تب دادو نے اس کی مشکل کو سمجھا اور اسے اپنے قریب کر لیا۔

''ایسا ہوتا ہے۔ اتنا اثر نہیں لیتے۔ آؤ! میں تمہیں کچھ سناتا ہوں۔''

انہوں نے ''آ گنی بینا'' اٹھائی اور اس نظم کو پڑھنے لگے جس کی وہ اکثر فرمائش کیا کرتا تھا۔

''اپنے سہمے ہوئے وطن کو میں جرأت کا درس دیتا ہوں۔''

اور میری جانبازی، روشن میناروں سے طوفان کی آرتی اتارتی ہے۔

جب مستقبل کی کوئی شام آزادی کا پرچم لہراتے ہوئے اس طرف آئے تو لوگو! ایک نظر آسمان کی طرف دیکھ لینا۔

اس کی خوبصورت آنکھوں میں ہلکی سی نمی اتری۔ وہ کچھ اور زیادہ ملول ہوا۔ دادو کے گھٹنے پر ٹھوڑی رکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''دادو! جس نے یہ کویتا لکھی ہے وہ کہاں ہے؟''

''وہیں کلکتے میں بیٹے! بہت بیمار ہے''......ان کی آواز میں غم تھا۔

''آ گنی بینا'' اس کی گود میں گر گئی تھی اور ان کے گھٹنے سے ٹکا وہ گھنے بالوں والا لڑکا

دادی ماں کے بُلاوے پر باہر جا چکا تھا۔ وہ اس وقت بہت رنجیدہ نظر آ رہے تھے، انقلابی شاعر کے دردناک انجام کے خیال نے ان پر افسردگی طاری کر دی تھی۔ وہ کلکتہ میں بسترِ مرگ پر جو تھا۔ تنگدستی اور افلاس اسے بالآخر وہاں گھسیٹ لایا تھا جہاں زندگی کی آس ٹوٹتی نظر آ رہی تھی۔

''پر قاضی نذرُالاسلام! تم یقیناً خوش ہوں گے کہ آزادی کی وہ سحر جس کا تمہیں انتظار تھا تمہاری زندگی میں ہی طلوع ہو گئی۔''

اخبار کی یہ نمایاں سرخی انہوں نے ایک مرتبہ پڑھی، دوبارہ پڑھی اور اب سہ بار اس پر جھکے ہوئے تھے۔ تب انہوں نے اپنا سفید بالوں والا سر اٹھایا اور بوجھل آواز میں اس سے مخاطب ہوئے، جو یہ اخبار لے کر تھوڑی دیر قبل ان کے پاس آیا تھا اور اب چوک کے پاس کھڑا پریشانی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

''حیدر علی! عظیم قائد نے یہ کیسا حکم دے دیا ہے؟ ہم تعلیمی اور سماجی طور پر پس ماندہ ضرور ہیں پر ہماری زبان وسیع علمی اثاثہ کی مالک ہے۔ اس کی موت تو بنگال کی تہذیب وثقافت کی موت ہوگی۔''

اور وہ جو کونے میں چٹائی پر بیٹھا حساب کے سوال حل کر رہا تھا۔ چونکا، اس کے دادو کی آواز میں شکستگی تھی اور وہ بہت دکھی نظر آ رہے تھے۔

''سوال تو یہ ہے بابا!''...... حیدر علی کہہ رہا تھا کہ...... ''تعلیم جب صوبائی معاملہ ہے تو اُردو کو ملک بھر کی سرکاری زبان قرار دینا کسی طور بھی قرین مصلحت نہیں۔''

یہ خبر اسے بہت اہم محسوس ہوئی۔ سلیٹ اور کاپی وہیں چھوڑ، وہ ان دونوں کے قریب چلا آیا۔

تھوڑی دیر وہ انہیں سنتا رہا اور جب حیدر علی چلا گیا تو اس نے اس نئے مسئلہ کے بارے

میں پوچھا، تب اسے معلوم ہوا کہ عظیم قائد نے ڈھاکا یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے اردو کو ملک بھر کی قومی زبان قرار دیا ہے۔

اور اس ''قومی زبان'' کا مطلب جب اسے پوری طرح سمجھ میں آ گیا تو وہ واپس اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔ دادو تخت پر لیٹ گئے تھے۔ اس نے کتاب اٹھائی اور سوال حل کرنے کی کوشش کی پر اس کا ذہن الجھ رہا تھا۔

''ٹھیک تو کہتے ہیں دادو، جب ہمارے پاس اپنی زبان ہے، تو ہم پر ایک نئی زبان لادنے کا فائدہ؟'' اس کی سوچ باغیانہ تھی۔

دادو کچھ زیادہ ہی مضطرب جان پڑتے تھے۔ تب ہی دو منٹ بعد اٹھ بیٹھے تھے۔ وہ مدھم آواز میں بڑبڑا رہے تھے۔ اس نے غور سے سنا اور سمجھا...... ''تم اس قوم کے نجات دہندہ ہو جو صدیوں سے ظلم کی چکی میں پستی چلی آئی ہے۔ جن کی آواز اور رائے کا ہمیشہ گلا گھونٹا گیا ہے پر تم سے ہمیں اس سلوک کی توقع نہ تھی۔ عروج کی طرف جاتی یہ زبان اب تمہاری بے اعتنائی سے ختم ہو جائے گی۔ آنے والی نسلیں نذر الاسلام کو بھول جائیں گی۔ انہیں جسیم الدین یاد نہیں رہے گا، وہ ٹیگور کو نہیں پڑھ سکیں گے۔''

''دادو نے اس خبر سے گہرا غم کھایا ہے۔''...... اس نے سوچا اور دوبارہ کام کی طرف متوجہ ہوا پر ذہن گڈ مڈ ہو رہا تھا۔ وہ باہر آ گیا۔

سورج ڈوب رہا تھا۔ باشاؤں سے نیلا نیلا دھواں اٹھ کر فضا میں گھل رہا تھا۔ دھان کے ہرے بھرے کھیت لہلہاتے تھے۔ وہ جو انہیں یوں لہلہاتا دیکھ کر اپنے من میں ہمیشہ ایک نئی امنگ محسوس کرتا، اس وقت اس حسن سے متاثر نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ سب اسے آج اچھا معلوم نہیں ہو رہا تھا۔

''اللہ، میں کیسے اپنے دادا کا غم غلط کروں؟ اگر میرے بس میں ہو تو میں دنیا کے نظام کو اپنے دادو کی مرضی کے تابع کر دوں لیکن میں ہوں کیا؟ میری سمجھ بھی ابھی بہت چھوٹی ہے۔ دادو

باتیں کرتے ہیں تو مجھے کتنی ہی باتیں جاننے کے لیے ان سے پوچھنا پڑتا ہے۔''

وہ یوں ہی خود سے باتیں کرتا کیلوں کے جھنڈ کے پاس آیا تو کتنے ہی گچھے لٹک رہے تھے۔

''لو! انہیں تو میں نے دیکھا ہی نہیں، یہ تو پکانے والے ہو گئے ہیں۔ چلو! اچھا ہوا پرسوں ہاٹ ہے۔ بیچ آؤں گا تو کچھ پیسے مل جائیں گے۔''

اور دھان بوتے کاٹتے، مچھلیاں پکڑتے، جال ٹوکریاں بناتے، دل جمعی سے کتابوں کو پڑھتے اور اس نئے ملک کی نئی نئی خبروں کو سنتے سنتے اس نے اپنے قدموں کو کچھ آگے بڑھا لیا تھا۔ اس کی ذہانت عمر کی حد کو کافی پیچھے چھوڑ گئی تھی۔ گفتگو میں جوشیلا پن عود آیا تھا۔ دادو کی کوئی بات بھی اب اس کے لیے ناقابل فہم نہ تھی۔ کسی خاموش تماشائی کی طرح باتیں سننے کے بجائے وہ اب ان سے اکثر مسائل پر الجھ پڑتا اور یہ خواہش کرتا کہ دادو اس کی بات کاٹنے کی بجائے اس سے اتفاق کریں۔

اور دادو کا وجود جسے وقت نے بڑی سنجیدگی دی تھی، اکثر کہتا۔۔۔۔۔۔''تمہاری سوچ میں اعتدال کا فقدان ہے۔ یوں اس میں کچھ تمہارا ابھی قصور نہیں، یہ عمر ہی ایسی ہے جس میں جذبات عقل پر چھائے رہتے ہیں۔''۔۔۔۔۔۔تب وہ چڑ جاتا اور قدرے تیز آواز میں کہتا۔۔۔۔۔۔''دادو آپ کیسی باتیں کرتے ہیں؟''

چیت کے یہ دن گرم تھے۔ باریسال کے اس سکول میں پھٹی پرانی بوری پر وہ ابھی آ کر بیٹھا تھا جس کے چار پانچ کمرے اور ٹین کی ٹوٹی پھوٹی چھتوں والے برآمدے بلا کی گرمی میں دہک رہے تھے۔ اس نے اب مطمئن ہو کر پیشانی کو دھوتی کے پلو سے صاف کیا اور بستے میں سے ملگجا کاغذ نکال کر پڑھنے لگا۔

تقریر مکمل دہرائی گئی تو اسے وہاں گرمی کی شدت کا کچھ زیادہ احساس ہوا، قمیص پسینے سے بھیگ گئی تھی۔ وہ اٹھ کر باہر آ گیا۔ اسکول میں یوں تو چھٹی ہو گئی تھی، پر لڑکے سبھی موجود

تھے اور طلبا کے اس گروہ کے انتظار میں اِدھر اُدھر گھوم پھر کر وقت کاٹ رہے تھے جو بنگلہ کو قومی زبان بنانے کی تحریک کے سلسلے میں گزشتہ دن ڈھاکا سے باریسال آیا تھا اور آج ایک بجے سکول آرہا تھا۔

''اس بار یہ چیت کچھ زیادہ ہی گرم ہے۔''...... اسوک کے درخت کی چھاؤں تلے کھڑے ہو کر اس نے سوچا۔

جلدی ہی طلبا کا گروہ آ گیا اور اس کے ساتھ ہی اسکول میں ہنگامہ شروع ہو گیا۔ جوشیلی تقریروں کا آغاز ہوا۔ آتشیں جذبات نے معصوم اور کم عمر لڑکوں کے چہروں کو تپا ڈالا تھا۔ ان سب کے بعد وہ آیا۔ اس کی آنکھیں اندرونی غضب سے کئی بار اُبلیں اور ڈھاکا یونیورسٹی کے لڑکوں نے محسوس کیا کہ یہ لڑکا جو ابھی چودہ پندرہ کے پیٹے میں ہے نذرالاسلام کی ''ودروہی'' کی مکمل تفسیر ہے۔

یہ اس آگ کی طرح ہے جس کے شعلے جب چٹختے ہیں تو قیامت آجاتی ہے۔

اور پھر وہ ان سب کے درمیان گھرا کھڑا تھا۔ وہ اس کی تقریر سے بہت متاثر تھے۔ خاص طور پر انہوں نے پوچھا تھا کہ اسے کس نے لکھا ہے؟ تب اس نے بہت فخر سے اپنے دادو کے متعلق بتایا۔

''جبھی تم میں اتنی کم عمری میں یہ صلاحتیں موجود ہیں کیونکہ ایک تجربہ کار ہاتھ تمہیں سنوار رہا ہے۔''......ان سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

چلتے چلتے وہ رُک گیا۔ جھک کر نگاہ اس نے اپنے پاؤں پر ڈالی۔ آج یہ کچھ زیادہ ہی گندے ہو رہے تھے۔ پیچھے خالی دھان کے پانی سے بھرے کھیتوں سے جو گزر آیا تھا۔ باڑی (مکان) اب قریب ہی تھی۔ بائیں ہاتھ میں پکڑی جوتے کی جوڑی دیکھ کر اس کا خوشگوار موڈ ایک دم ہی خراب ہو گیا۔ جُو کے کنارے بیٹھ کر وہ غصے سے خود سے بولا۔

''اتنے سالوں کا ہو گیا تُو! ڈھنگ کا جوتا کبھی نصیب نہ ہوا!''......اب جو شامتِ اعمال سے میرے اس عقل مند بابا نے ڈھاکا سے یہ میرے لیے بھیج ہی دیا تو دادو چاہتے ہیں کہ اس خشک موسم میں میں اسے پہن کر سکول ضرور جاؤں، اب یہ انہیں کون سمجھائے کہ صاحب رائے سے باریسال تک آنے جانے کا یہ دس کوس کا پینڈا، اس لوہے جیسی کھال والے جوتے کو پہن کر طے کرنا ہرگز ممکن نہیں۔ پاؤں کٹوانے ہیں کیا مجھے اپنے اچھے بھلے؟ کچھ کہو تو کہتے ہیں...... ''پہنو گے تو ٹھیک ہو جائے گا''......میں کہتا ہوں آدھ پاؤ تیل پی کر تو یہ ٹھیک نہ ہوا، میرے پاؤں اسے خاک ٹھیک کریں گے۔ غصہ آتا ہے مجھے اپنے بابا پر، ساری عمر پیچھے میرے لیے جو ایک چیز بھیجی ہی بھیجی تو وہ بھی ایسی کہ جی چاہے اٹھا کر پوکھر میں پھینک دے۔''

بُڑ بُڑ کرتے ندی کے پانی سے اس نے منہ ہاتھ دھویا، جی بھر کر پانی پیا۔ پاؤں دھوئے اور جوتا پہن کر اپنے چاروں طرف دیکھا۔ دھوپ کی شدت ابھی تک ویسے ہی تھی۔ نیلے آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہ تھا...... ''یہ دن بڑے سخت ہیں۔ پیدل چلنا تو اور بھی تکلیف دہ ہے۔ جُو کا پانی بھی ان دنوں گہرا نہیں ہوتا کہ انسان نوکا ہی چلا لے۔ یوں یہ بات بھی ہے کہ ان دنوں میں ٹانگیں چلتی ہیں اور بقیہ دنوں میں بازو۔ اب بارشیں ہونے والی ہیں۔ تب ہر سو پانی ہی پانی نظر آئے گا۔ جل تھل ہوگا۔ سیلاب آئیں گے۔ ساحلی لوگ اور ان کی باشائیں بہہ جائیں گی۔''

وہ چلتے چلتے یہ سب سوچ رہا تھا۔ اس کی ٹخنوں سے کہیں اونچی، ملگجی دھوتی کے نیچے اب سیاہ بوٹ آ گئے تھے۔

اور جب وہ اپنے پوکھر کے اوپر سے گزرتے ہوئے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے سوچا دادو کو جب میں بتاؤں گا کہ میری تقریر کتنی کامیاب رہی تو وہ کتنے خوش ہوں گے۔ وہ اندر آیا۔ اس نے دادو کو آداب کیا۔ پر وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ دادو اپنی وہ خاص اکلوتی دھوتی اور کرتا جو وہ کہیں آنے جانے کے لیے ہی استعمال کرتے ہیں، پہنے تیار بیٹھے ہیں۔ یہ اس وقت کہاں جانے والے ہیں؟ جبکہ انہوں نے صبح مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔

''تم آج بہت دیر سے آئے ہو۔ میں کب سے تمہاری راہ تک رہا ہوں، اب جلدی سے بھات کھالو۔ ہم ڈھاکا چلنے والے ہیں۔''...... انہوں نے بجھی بجھی آواز میں کہا۔

''کیوں دادو؟''...... وہ گھبرا کر بولا۔...... ''آپ وہاں کیوں جا رہے ہیں؟''

''ہر وقت سوال جواب نہیں کرتے۔ جیسے میں کہہ رہا ہوں ویسے کرو۔''

دادو آج کیسے بول رہے ہیں۔ کتنی تلخی ہے ان کے لہجے میں۔ کیا بابا نے مجھے اپنے پاس بلا لیا ہے؟ جس کی وجہ سے یہ ایسا کہہ رہے ہیں۔ پر ایسی بات تو ممکن نہیں، اس نے یہ سب اپنے دل میں سوچا اور باشا کے پچھلے دروازے سے باہر آیا۔

یہاں وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی تھیں۔ وہ جو ہمہ وقت کام میں جتی رہتیں اور جب بھی

وہ اسکول سے آتا انہیں تیز سبز ساڑھی کا آنچل سر پر ڈالے دھان کوٹتے پاتا۔

وہ پریشان ہوا اور ان کے قریب بیٹھ کر شاکی لہجے میں بولا۔

''دادی ماں! کیا آپ اپنے شلپی کو نہیں بتائیں گی کہ دادو ڈھا کا کیوں جا رہے ہیں؟ اور آپ اتنی مغموم کیوں ہیں؟''

ان بوڑھی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک فوارہ اُبلا۔ وہ اور زیادہ مضطرب ہوا۔ تب اس نے سنا، دادی ماں کہہ رہی تھیں کہ اس کے بابا کا شہر میں ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ انہیں بہت چوٹیں آئی ہیں اور وہ ہسپتال میں ہیں۔

اس کا معصوم دل سُن سا ہوا۔ اور وہ بے قراری سے ان کے گھٹنے پر جھک گیا۔

ان کی ساری رات لانچ میں انتہائی تکلیف سے گزری۔ صبح دن چڑھے وہ نرائن گنج میں لنگر انداز ہوئے۔ غم اور تھکن نے ان دونوں کو نڈھال کر رکھا تھا اور ابھی انہیں پھر کشتی پر ڈھا کا کے لیے سوار ہونا تھا۔

جب وہ نواب پور روڈ کے روت کھولا محلے کے اس خستہ حال مکان میں داخل ہوا جہاں اس کی ماں اور بابا رہتے تھے۔ اس وقت تک اسے یہ سمجھ نہ آئی تھی کہ وہ اپنی ماں کا سامنا کیسے کرے گا۔

تب تنگ و تاریک گھر کے ایک کمرے سے وہ نکلی۔ جس کی پیلی ساڑھی گندی تھی، جس کے گھٹنوں تک لانبے بال رسیوں کی طرح بٹے اس کے آنچل سے نیچے لٹک رہے تھے۔ خوبصورت آنکھیں بے نور تھیں۔ رنگت پیلی پڑی تھی۔ وہ اس معمر آدمی کے قدموں میں جھکی اور ان کے پاؤں کو چھوا۔ جو کہنے کو اس کا سسر تھا پر جن کی شفقت میں اس نے ہمیشہ پدرانہ محبت پائی۔ یہ اس کی ماں تھی۔ نیم تاریک صحن میں کھڑا وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل اندر ہی اندر گھٹا جا رہا تھا۔ اس کی ماں باریسال کی حسین عورتوں میں سے ایک تھی جسے اس کے بابا نے ٹوٹ کر پسند کیا تھا۔ دادی ماں اکثر اسے بتایا کرتیں کہ تمہاری ماں تو بہت اونچے گھرانے کی بیٹی

ہے۔تمہارے بابا نے جب مجھے بتایا تو میں نے سوچا کہ یہ رشتہ کیونکر ہوگا؟ ہم لوگ تو ان کے پاسنگ بھی نہیں، بھلا ہم جیسوں کو وہ اپنی اتنی لاڈلی اکلوتی بیٹی کیسے دیں گے؟ پر بہو کے والدین نے تمہارے دادا کی علمیت کی قدر کی اور بہو تو بالکل فرشتہ ہے۔ دیکھو تو! اپنے گھر میں کیسی تنگی سے گزر کر رہی ہے۔ وہ دادی ماں کی یہ باتیں اکثر سنتا اور بہت کم ان پر کان دھرتا۔ اسے تو اپنی ماں بس اس حد تک ہی یاد رہتی تھی۔ صاف ستھری اجلی ساڑھی والی جس کے شانوں پر لانبے بالوں کا بھاری سا جوڑا پڑا رہتا اور جو آنکھوں میں بہت نفاست سے کاجل لگاتی۔ جس کی شفاف پیشانی پر خوبصورت بندیا چمکتی۔ جب بھی وہ ان کے پاس رہنے کے لیے آتا تو وہ اسے بھی ہمیشہ صاف ستھرا رکھنے کی کوشش کرتیں۔

اور یہ اس کی وہی ماں تھی۔ جس کی ساڑھی گندی تھی، جس کے بال بکھرے تھے، جس کی آنکھوں میں کاجل کی دھاریاں نہ تھیں اور جب وہ اس کے پاؤں چھونے کے لیے جھکا تو جانے کیا ہوا۔ اس کی چیخیں نکل گئیں۔ شاید ماں کو اُسی کا انتظار تھا۔ تبھی وہ پھوٹ کر رونے لگی۔ دادو نے رندھی آواز میں انہیں خاموش کروایا۔ تین سالہ فخر الرحمٰن کو دادو نے گود میں اٹھاتے ہوئے اس کے بابا کے بارے میں دریافت کیا، ماں نے انہیں بتایا کہ اب خطرے سے حالت باہر ہے۔

اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو پیار کرتے ہوئے سوچا۔ یہ اس سے کتنا چھوٹا ہے؟ گھر اس بار اس کے چچا سے خالی تھا۔ وہ پچھمی پاکستان میں کیڈٹ کی ٹریننگ جو لے رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ ڈھاکا میڈیکل ہسپتال جانے لگے تو اس نے دیکھا کہ ماں اسی حلیے میں جانے کے لیے تیار کھڑی ہے تو کیا حالات کا یہ کڑا موڑ میری اتنی نفیس مزاج ماں کو یوں تباہ کر دے گا کہ اسے اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہ رہے گا! اس نے دکھ سے یہ سب سوچا اور آگے بڑھا۔ ماں کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ کر اس کی چمک سے خالی آنکھوں میں جھانکا۔

’’ماں آپ ساڑھی بدلیں، بالوں میں کنگھی کریں۔‘‘...... اس نے کپکپاتے ہونٹوں سے کہا۔

''شلپی!''...... ماں نے سسکی بھری۔

''ہاں ماں! اس حال میں آپ کو دیکھ کر میرا کلیجہ کٹ رہا ہے۔''

دادو کی آنکھیں بھر آئیں۔ تب ماں نے سرخ کنارے والی سفید ابرق لگی ساڑھی پہنی۔ بالوں کو سلجھا کر جوڑا بنایا۔ یہ سب کرتے ہوئے اس کا دل کئی بار ڈوبا کہ وہ جانے ہسپتال کس حال میں ہو جس سے اس کے جیون کی ہر خوشی وابستہ ہے۔

اور جب وہ باہر نکلی، اس نے دیکھا کہ اس کے دروازے کے عین سامنے کھڑا وہ سفید بالوں والا ناتواں بوڑھا فقیر جس کے درد بھرے گیت وہ گھنٹوں سنا کرتی، اپنی پُرسوز آواز میں اکتارہ پر نقشی ''کتھا ماٹھ'' کی ہیروئن ''روپا'' کے ہجر کی داستان گا رہا ہے۔

جانے کیوں اس کا جی چاہا۔ اس کا اکتارہ چھین لے، اس کے منہ کو بند کر دے کہ اس سے کوئی آواز نہ نکلنے پائے۔

''یہ آواز کیسے میرا جگر چیر گئی ہے۔ اے اللہ، یہ درد یہ کسک تو مجھے نہ دیجیو کہ میں نے دنیا میں ابھی کچھ نہیں دیکھا۔''

سوچ نے اس کا حلق کڑوا کر دیا اور آنکھوں میں امنڈی ڈھیر ساری نمی اس نے بہت مشکل سے واپس لوٹائی۔

یہ میرے بابا ہیں۔

سرجیکل وارڈ کے اس کمرے میں جہاں تیز دواؤں کی بو پھیلی تھی۔ انہیں اُجلے بستر پر سفید پٹیوں میں جکڑے جکڑائے دیکھ کر بھی اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ تھا۔ ''کیا انہیں ایسی حالت میں دیکھنے کی مجھے توقع نہ تھی؟'' سوچتے ہوئے وہ ان پر جھکا، ان کے ہاتھ اس نے پکڑنے چاہے۔ پر وہ مجروح تھے۔ ان کے سینے پر اس نے سر رکھنا چاہا۔ پر وہ زخمی تھا۔ اس کا دل بھاری ہو رہا تھا، ایک نظر اس نے دادو پر ڈالی۔ وہ ان کے سرہانے کھڑے تھے۔ ان کی آنکھیں لال بوٹی ہوئی جا رہی تھیں۔ شاید یہ آنسوؤں کو روکنے کا نتیجہ تھا۔ ''تم نے انہیں روک لیا ہے۔ بہنے کیوں نہیں دیتے...... دادو! تاکہ تمہارے دل پر پڑا دکھ کا یہ بوجھ ہلکا ہو جائے'' ...... وہ خود سے بولا اور اپنی ماں کو دیکھا جو زار زار رو رہی تھی۔

اس نے اپنے دانت سختی سے کاٹے...... تب ملاقات ختم ہونے کی گھنٹی بجی اور وہ بوجھل قدموں سے اپنی ماں اور دادو کے ساتھ باہر آ گیا۔

وہ صرف چھ دن ہسپتال باقاعدگی سے گیا اور اس کے بعد اس باقاعدگی میں کمی شروع ہو

گئی۔ لوہے کے بستروں پر پڑے بے بس انسانوں کو دیکھ کر اس کا دل بہت گھبراتا...... ان کی موٹی موٹی آنکھوں میں لہریں مارتا یاس اسے تڑپا دیتا۔ جتنا وقت وہ وہاں رہتا، کڑھتا اور اپنا خون پیتا۔ یوں بابا اب پہلے سے بہت بہتر تھے۔ یہ اطمینان بھی دل کو تھا۔

پر ایک اور وجہ بھی تھی۔ وہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ اب باہر گزارنے لگ گیا تھا۔ ڈھاکا کی سیاسی فضا بہت کشیدہ تھی۔ بنگلہ کو قومی زبان بنانے کی تحریک خاصا زور پکڑ گئی تھی۔

اور چند دن بعد دادو چونکے...... وہ دن بھر غائب رہتا۔ رات کو دیر سے آتا...... دادو نے اس سے پوچھا۔ ''اجتبیٰ الرحمٰن! تم اپنے بابا کو دیکھنے ہسپتال نہیں جاتے؟''...... اور وہ بولا...... ''کیا جاؤ! بابا کو تو اب آرام ہی ہے۔ وہاں جا کر من بہت گھبراتا ہے۔''

اور باہر جو کچھ ہو رہا تھا دادو اس سے کچھ بے خبر نہ تھے...... آئے دن جلوس نکلتے اور گولی چلتی، نوجوان طبقہ بہت سرکشی پر اترا ہوا تھا۔ ان حالات میں اس جوان خون کے یوں ہنگاموں میں الجھ جانے پر وہ بہت فکر میں پڑ گئے تھے۔

انہوں نے بہو اور بیٹے سے بات کی اور بیٹا جو ابھی بستر پر ہی پڑا تھا۔ پریشانی سے بولا...... ''بابا! آپ اسے فوراً لے جائیے۔ یہاں جانے کیا ہو۔ میرا اب اتنا فکر نہ کریں۔ قدرت نے بچا لیا ہے ویسے بھی دھان کی بوائی کا وقت بہت قریب ہے اور اس کی پڑھائی کا حرج بھی ہو رہا ہے۔''

اور جب انہوں نے اسے ساتھ چلنے کے لیے کہا تو اس نے تعجب سے انہیں دیکھا۔

''لیجئے ابھی سے دادو، آپ بھی کمال کرتے ہیں بابا کو آرام تو آنے دیں۔''

''وہ اب ٹھیک ہے۔ پیچھے تمہاری دادی ماں اکیلی ہے۔''

پر وہ جانے کے لیے ہرگز تیار نہ تھا۔ تیار ہوتا بھی تو کیسے......

اس کی تو یہاں آ کر آنکھیں کھل گئی تھیں...... کام کرنے کا اتنا وسیع میدان، چند دنوں میں ہی اس نے سینکڑوں لوگوں سے راہ رسم پیدا کر لی تھی۔ وہ ان سب لڑکوں سے بھی مل چکا تھا۔

جو باریسال آئے تھے۔ ان کے ہمراہ چار پانچ بار اس نے ڈھاکا کی مختلف جگہوں پر تقریریں بھی کیں اور اُن کا اصرار تھا کہ اسے اب ہرگز واپس نہیں جانا چاہیے کیونکہ ان کٹھن لمحات میں جنتا کو اس کی ضرورت ہے۔

اور جب دادو نے اسے سمجھانا چاہا...... تو وہ تلملاتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال ہے دادو! بنگلہ کو قومی زبان بنانا آپ کی بھی تمنا ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو پر میں تعمیری جدوجہد پر یقین رکھتا ہوں۔''

''تو یہ کیا تخریبی ہے؟''...... وہ قدرے غصے سے بولا۔

''اتنی تباہی جو مچ رہی ہے۔''...... انہوں نے رسان سے کہا۔

وہ تو مچے گی۔ ڈھاکا کی ارسٹوکریسی اور حکمران کلاس کو بنگلہ سے کوئی واسطہ نہیں۔ ویسٹ پاکستانی اس کی جون اور ہیئت (رسم الخط) بدل دینے کی بات کریں یا اسے کھڈے لائن لگا دینے کا سوچیں، انہیں صرف اپنی کرسیوں کی فکر ہے۔ یاد رکھیے دادو! تباہی کے بغیر حصول مقصد میں کبھی کامیابی نہیں ہوئی۔

اور وہ بوڑھا جو داس کی گفتگو سن کر دنگ رہ گیا تھا۔ دیر بعد صرف اتنا ہی کہہ سکے۔

''مجھے تمہاری رائے سے اتفاق نہیں۔ یہ ہمارا اپنا ملک ہے۔ یہ حکومت ہماری اپنی ہے۔ ہم پُرسکون طریقے سے بھی اپنا مطالبہ منوا سکتے ہیں۔''

''میں پوچھتا ہوں تو اس مطالبہ کو مان کیوں نہیں لیا گیا؟...... کتنے سال ہو گئے ہیں تحریک کو چلتے ہوئے...... یہ پکڑ دھکڑ، سنسناتی گولیاں، یہ سب کس لیے ہیں؟ دادو! میں حیران ہوں آپ کتنی معصوم باتیں کرتے ہیں!''

اس معمر وجود نے اس پر گہری نظر ڈالی، ان کے سامنے کھڑا پانچ فٹ نو انچ کا نوعمر لڑکا انہیں بے وقوف سمجھ رہا تھا اور سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ خفیف سا مسکرائے...... اور خاموش ہو گئے کہ اس کے سوا اب کوئی اور چارہ کار نہ تھا۔

کمرے میں پھیلی مدھم سی زرد روشنی میں اس نے دادی ماں کو دیکھا، وہ چوک پر بچھی نرم چٹائی پر دراز سکون کی نیند سوتی دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ چہرے پر بے چینی سی تھی۔اس نے دوسری نظر دادو پر ڈالی، وہ کرٹ بدلے لیتے تھے۔لالٹین کو اس نے پھونک ماری اوراِس کے بجھتے ہی کمرے میں گھُپ اندھیرا اچھیل گیا۔اندر اندھیرے کا ایک طوفان تھا اور باہر بادوباراں کا۔آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ اپنی چوک تک آیا۔ابھی لیٹا بھی نہ تھا کہ ایک مہیب آواز نے لرزا دیا۔دادی ماں فوراً ہی لاحول پڑھتے اٹھ بیٹھیں، دادو نے بھی استغفراللہ پڑھا۔اس نے قیاس کیا کہ باشا کے سامنے کا درخت ٹوٹ کر گرا ہے۔دادی ماں نے قرآنی آیات کا ورد شروع کر دیا تھا۔پچھلے دس بارہ دن سے متواتر بارشیں ہو رہی تھیں۔دریا لوگوں کے گھر اور کھیت کاٹ لیے جا رہا تھا۔

وہ یوں تو لیٹ گیا پر یہ سوچ اس کی آنکھوں میں نیند نہ لا سکی کہ ان کا یہ ٹیلا جس پر ان کے سمیت سات آٹھ گھر آباد ہیں، کب تک انہیں اس طوفان سے پناہ دے گا؟ جو پانی کے چاروں طرف پھیلنے سے جزیرہ بن چکا ہے۔...... ''یہ رات بھاری نظر آتی ہے۔مچان کا بندوبست کرنا

چاہیے تھا۔‘‘ ......اس نے دادی ماں کی قدرے خوف زدہ آواز کو سنا اور سوچا یہ ٹھیک کہتی ہیں، باشا کی ایکر اور گاب کی دیواریں لاکھ مضبوط سہی، پر پانی کے تیز بہاؤ کے سامنے تو یہ مٹی کے ڈھیر سے زیادہ نہیں۔ پھر بھی وہ ان کو دلاسا دینے کے لیے بولا۔...... ’’آپ سوچا یئے کچھ نہیں ہوگا۔ ہمارا ٹیلا کافی اونچا ہے۔‘‘ ......یوں اپنی اس بات کا اسے ذرا بھی یقین نہ تھا کیونکہ اس سرزمین کے مقدر میں قدرت نے طوفان اور بارشیں لکھ ڈالی تھیں۔ یہاں کسے خبر تھی کہ پانی کے ریلے میں کب ایک ہنستا مسکراتا خاندان بہہ جائے گا۔ ہر سال ہی ایسا ہوتا، اس بار کچھ نئی بات تو تھی نہیں۔

اور جب وہ غنودگی میں تھا۔ اس نے دادی کی آواز سنی۔...... ’’چھت میں سوراخ ہوگئے ہیں۔ اجتبیٰ الرحمٰن اٹھ جاؤ۔‘‘ ......اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ پانی بوچھاڑ کی شکل میں اندر آرہا تھا۔ اندھیری رات میں جب بارش برچھی کی طرح ان کے جسموں سے ٹکرا رہی تھی، انہوں نے بہت تکلیف سے مچان باندھا۔ اپنے چہرے کو ہاتھوں سے صاف کرتے ہوئے کئی بار اس نے سوچا کہ وہ اتنا کاہل بھلا کاہے کو ہوگیا ہے۔ عبداللہ اور تمیج کے ساتھ ہی اگر وہ رات کو اس کا بندوبست کر لیتا تو دادو کو اس وقت تکلیف تو نہ کرنی پڑتی۔

اور اس مچان پر وہ چار دن رہے۔ پانی ان کے ٹیلے پر بھی دندناتا آ گیا۔ باشا کی چھن کی چھت ڈھے گئی۔ دیواریں بیٹھ گئیں۔ ان دنوں میں ان دونوں پر بھی بہت نقاہت اور کمزوری غالب رہی جن کے بال ایسے ہی طوفانوں سے لڑتے لڑتے سفید ہوگئے تھے۔ کھانے کے لیے کٹھل کے سوا کسی بھی دوسری چیز کے ملنے کا سوال نہ تھا۔ سینکڑوں لوگ ڈوب گئے۔ بہت نقصان ہوا۔ صندوق میں رکھی دادو کی کتابیں جو ان کے جیون کا اثاثہ تھیں اب گلنا شروع ہوگئی تھیں اور دادو کو سب سے زیادہ ان ہی کا غم تھا۔ اس نے ان سے کہا بھی کہ آپ کیوں چنتا کرتے ہیں؟ یہ سوکھ کر سب ٹھیک ہو جائیں گی پر وہ غم زدہ آواز میں بولے تھے...... ’’بچہ! سورج نکلے گا تب سوکھیں گی نا اور اس کے نکلنے کی آس کہاں ہے۔‘‘

گھر بہنے کا غم، قیمتی کتابوں کے ضائع ہونے کا صدمہ، آسمان کی ہر دم ٹپکتی چھت تلے بھوکے پیٹ اور بے سکونی کی حالت، ان کی قوت ارادی کے دن انہیں مضبوط رکھتی۔ وہ بیمار پڑ گئے تھے اور وہ جوان کی نصف بہتر تھیں، انہیں بھی بخار نے آ دبوچا تھا۔ ساتھ کی باشاؤں کے بہت سے لوگ بھی بیماری کا شکار ہو رہے تھے۔ حیدر علی کا چھوٹا بچہ رات میں مر گیا تھا۔ ایسے میں اس پندرہ سالہ لڑکے نے اپنی مجبوریوں پر بہت غم کھایا۔ یہ میرے دادو اور دادی میرے ہوتے ہوئے بھی اتنے لاچار ہو جائیں، کیسے ممکن ہے، تمیز کی ایک نوکا جانے کیسے بچ گئی تھی۔ اسی میں وہ شہر کے لیے چل دیا۔ ایک افراتفری مچی تھی وہاں، بہت دوڑ دھوپ کی تب کہیں جا کر ایک امدادی کیمپ سے اس نے چاول اور دوائی پائی۔

اس کی ہر کوشش بے کار گئی۔ دادو کا بخار نہ اتر سکا۔ اس کے سامنے اور بھی بہت سے سنگین مسائل اب آن کھڑے ہوئے تھے۔ وہ جو یوں ننگے سر بارہ دن سے بیٹھے تھے اسے ڈھانپنا بھی تھا۔ اپنے حوصلے کو بھی برقرار رکھنا تھا۔ کڑے وقت میں ہمت بندھانے والا تو اس وقت آنکھیں بند کیے اس کے رحم و کرم پر پڑا تھا۔ اس دن عبداللہ کی بہن جھرنا کو ان کے پاس بٹھا کر وہ خود شہر کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ امدادی دفتروں کے چکر لگائے پر وہ سیر بھر چاول بھی نہ حاصل کر سکا۔ اپنے بیمار دادو کے لیے اسے گندم کے آٹے کی ضرورت تھی۔

باریسال شہر کی سڑکوں پر پھرتے پھرتے اس کے پاؤں دُکھنے لگے تھے پر امید کی ایک کرن نہ جھلملائی۔ یوں خالی ہاتھ وہ گھر بھی جانا نہ چاہ رہا تھا۔ وقت گزر رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا دل بھی ڈوب رہا تھا۔

''وہ اب کیا کرے؟''...... گوپال چند رائے کی عظیم الشان حویلی کے پاس کھڑے کھڑے اس نے یاس سے یہ سوچا اور کچھ دیر بعد وہ تیزی سے مخالف راستے پر بڑھ رہا تھا۔ دو کنال کے رقبے میں پھیلی نہایت عالی شان حویلی کے سامنے وہ رُکا۔

دربان کو اس نے اپنا مدعا بتایا، اپنے سامنے کھڑے اس لڑکے کو جس کے چہرے پر تھکن

کی گرد پڑی تھی۔ جس کے پاؤں ننگے تھے، جس کی دھوتی میلی چکٹ تھی پر دربان نے گہری نظر ڈالی اور اطمینان سے بیڑی پیتے ہوئے بولا...... ''جاؤ اور اپنا کام کرو۔'' ...... وہ جھلایا اور تلخ لہجے میں بولا...... ''باہر اس چبوترے پر تم ہی حاکم اعلیٰ بنے بیٹھے ہو، مجھے اندر تو جانے دو۔''

''دماغ خراب ہے تمہارا! مجھے نوکری سے کیا ہاتھ دھونے ہیں؟'' اس نے اس کے بے باک لہجے کو سخت ناپسند کیا۔

مزید تکرار اس نے مناسب نہیں سمجھی، وہ عمارت کی پچھلی طرف آیا۔ عقبی دیوار زیادہ اونچی نہ تھی۔ اس نے جائزہ لیا، اُچکا اور پھلانگ کر باغ میں آ گیا۔ یہ ڈی سی کا گھر تھا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ برآمدے میں پہنچ گیا۔ یہاں اس کی مڈبھیڑ ایک اور ملازم سے ہوئی۔ وہ صاحب سے ملنے پر مصر تھا اور ملازم باہر نکالنے پر۔ اس نے نرم لہجے میں اس سے کہا...... ''دیکھو! یہ میری ملازمت کا معاملہ ہے۔ تم چاہتے ہو کہ صاحب مجھے ابھی دروازے سے باہر کر دیں؟''

''کیا کہتے ہو تم؟ یہ پاکستان ہے، حاکمِ ضلع ہمارا اپنا ہے۔ ہمیں حق ہے کہ ہم اپنی شکایات اس کے کانوں تک پہنچائیں۔'' ...... وہ بہت غصے سے بولا۔

''تم فضول میں اتنا اونچا بول رہے ہو، حق تو اس وقت ہوتا ہے جب کوئی سمجھے، خدا کے لیے تم یہاں سے نکل جاؤ ورنہ تمہارے ساتھ میں بھی پس جاؤں گا۔ صاحب کو تم نہیں جانتے۔''

ڈھائی پسلی کا وہ ملازم منمنایا۔

''ارے بھئی! کیا بزدل آدمی ہو؟ پیچھے ہٹو، مجھے کیا وہ نگل جائے گا؟''

اور اس شور وغل کی آواز پر برآمدے میں تیسرے کمرے کا دروازہ کھلا، بھارے جسم کا ایک سرخ وسفید رنگت والا حسین مرد، سفید بے داغ کرتے شلوار میں نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر رعونت محسوس کرتے ہوئے بھی وہ اس کی طرف دوڑا۔

''ٹھہرو!'' ...... اس کی کرخت آواز نے اسے وہیں رکنے پر مجبور کر دیا۔

''کون ہو تم؟'' ...... بے زاری سے پوچھا گیا۔

ہے۔ہم لوگ ذلیل ہیں، نکمے اور سست ہیں۔تم اگر یہ سب باتیں سنو تو تمہارا کیا حال ہو؟ یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں پر مجھے ایک بات کا دکھ ہے، تم نے ہمیں جھوٹے خواب دکھائے، ان کی تعبیر اگر تمہیں میرے چہرے، ہاتھوں اور جسم پر نظر آ جائے تو شاید تم زندہ نہ بچو۔

اس نے چپو چھوڑ دیا۔نوکا کھلے پانی پر بہتا رہا اور موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ نوکا میں بچھی چٹائی پر گرتے رہے۔

وہ جب صاحب رائے پہنچا تو وہاں چند لوگوں کے درمیان وہ ساکت وصامت پڑے تھے۔بنگال کے جید عالم نے دوائی کا انتظار نہیں کیا تھا۔سرہانے ان کی جیون ساتھی تپتے جسم کے ساتھ یوں اپنے اکیلی رہ جانے پر ان سے گلہ کر رہی تھی۔

اس نے یہ سب دیکھا۔اس کی آنکھوں سے جو آنسو نکلے، اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کا جگر پھٹ گیا ہے اور وہ آنکھوں کے راستے باہر آیا ہے۔میرے مولا! تمہارا سارا جیون ایسی ہی بے سروسامانی میں گزر گیا۔فرید پور میں تمہارے کھیتوں اور حویلی کو پدما کی بے رحم موجوں نے اتنی بار تاک تاک کر نشانہ بنایا کہ تم اپنی پُرکھوں کی جائیداد کو اونے پونے بیچ کر باریسال آ گئے۔یہاں بھی حالات کی کٹھنائیوں نے تمہیں ریزہ ریزہ کیے رکھا۔

پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔اپنے سیاہی مائل موٹے ہونٹوں کو ان کی فراخ پیشانی پر رکھتے ہوئے وہ چیخا۔

''دادو! تُو نے کیا اس پاکستان کی تمنا کی تھی!''

''یوں اکڑے ہوئے میرے سر پر کیا کھڑے ہو؟ کہہ جو دیا ہے ایک بار کہ مجھے بھات نہیں کھانا''...... سفید پٹی بندھے زخمی بازو کو آہستگی سے اس نے اوپر کیا اور کروٹ بدلی، ایسا کرنے میں اسے بہت تکلف محسوس ہوئی تھی کیونکہ اس کا رنگ اندرونی تکلیف سے پیلا پڑ گیا تھا۔

''مصلحت اگر میرا دامن نہ پکڑے ہوتی تو اسی ڈنڈے سے تیرا بھیجا نکال دیتا۔ تم ہو کیا؟ دو ٹکے کے مسلمان چھوکرے اور بات اتنی رعونت سے کرتے ہو؟''

یہ سب اس نے سوچا جس کا قد ناٹا اور جسم کسرتی تھا اور جو خاکی کپڑے پہنے ہاتھ میں بڑا سا ڈنڈا پکڑے اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔

اس نے اپنے حلق کی کڑواہٹ کو کم کیا اور نرمی سے بولا...... ''دیکھو! یوں بھوکے رہو گے تو کمزوری بڑھے گی۔''

تب اس نوعمر لڑکے نے اک ذرا گردن موڑی اور اسے دیکھا۔ اس کی موٹی سرخ آنکھیں اسے بے حد خطرناک نظر آئیں۔

''کیا نام ہے تمہارا اور یہاں تم کیا کام کرتے ہو؟''......اس نے تیزی سے پوچھا۔

''میں بسنتا کمارداس ہوں اور یہاں چوکیداری کا کام کرتا ہوں۔''

یہ ڈھاکا سنٹرل جیل کا ایک کمرہ تھا جہاں ادھر ادھر آٹھ نو لڑکے سو رہے تھے، وہ اس بسنتا کمارداس سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کے پاس ہی ایک تھالی میں بھات اور دال پڑی تھی جس کی طرف اس نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔

ان لوگوں کی گرفتاری پرسوں اس وقت ہوئی تھی جب یہ کومیلا اس جلوس کی قیادت کر رہے تھے جو بنگلہ کو قومی زبان بنانے کی تحریک کے سلسلے میں حکومت کو لعن طعن کر رہا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ چوٹیں اسے آئی تھیں جس کا نام شبلی تھا جو اس کارروائی میں پیش پیش تھا۔

''میں جانتا ہوں تم سے یہ بھات کھایا نہیں جا رہا، پر مجبوری ہے، میں کوشش کروں گا کل تمہارے لیے کوئی اچھی چیز لا سکوں۔''

''یہاں میں اچھا دال بھات کھانے نہیں آیا۔ بس میرا جی نہیں چاہ رہا۔''

''نہیں تمہیں خود کا خیال رکھنا چاہیے کیونکہ اس جنتا کو تمہارے جیسے ہونہاروں کی ضرورت ہے۔''

وہ چپ رہا اور جب وہ چلا گیا تو اس نے کمرے میں نظر دوڑائی، اس کے چند ساتھی یہاں تھے اور بقیہ دوسرے کمروں میں۔

یہ اس بسنتا کمارداس کو مجھ سے بہت ہمدردی ہو گئی ہے، کتنا فکرمند ہے وہ میرے بارے میں، کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس کا نام سن کر ہی دھتکار دیتا پر ہندوؤں سے نفرت اب دب سی گئی تھی۔ اس مشترکہ جدوجہد میں ہندو نہ صرف ان کے شانہ بشانہ لڑ رہے تھے بلکہ مالی معاونت بھی کر رہے تھے۔

اور بسنتا کمارداس یہاں سے نکل کر دفتر میں آیا، وہاں بڑی بڑی مونچھوں والا نیلمبر بابو رجسٹر پر جھکا لکھنے میں مگن تھا۔ اس کے اندر آنے پر اس نے سر اٹھایا اور اس لڑکے کے بارے میں پوچھا۔

''بہت خود سر اور بدتمیز ہے جو تم نے مجھے اتنی تاکید نہ کی ہوتی تو میں اسے پیٹ بیٹھتا۔''...... ''اب ایسی غلطی بھی نہ کر بیٹھنا۔ جانتے نہیں کون ہے وہ؟''

''معلوم ہے مجھے۔ باریسال کے مولوی حبیب الرحمٰن کا پوتا ہے۔''

''مر گیا ہے! بھگوان نے بہت کرم کیا۔ اس نے تو باریسال میں آگ لگا رکھی تھی۔''

''ایک بات ہے نیلمبر بابو! پاکستان کا بخار ان لوگوں کے سروں سے جلد ہی اتر جائے گا۔'' ''اتر جائے گا نہیں، اتر رہا ہے میرے یار!...... یہ ایک دوسرے سے جلد ہی کٹ جائیں گے گھبراؤ نہیں، اقلیتیں چاہیں تو تخت الٹ جاتے ہیں۔ آسٹریا اور ہنگری یاد نہیں کیا؟''

اور اس شام جب سورج اولڈ ڈھاکا کی شکستہ، پرانی عمارتوں کے بہت نیچے جا رہا تھا۔ وہ اپنے جیون ساتھی کے ساتھ سائیکل رکشے میں بیٹھی تنگ تنگ گلیوں سے گزرتی سنٹرل جیل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے ساتھی نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا ہوا تھا۔ اس کی خوبصورت آنکھیں بھر بھر آتیں اور جب وہ انہیں خشک کرنے کے لیے جھکتی تو وہ اس کے شانے تھپتھپاتا ہوا کہتا۔

''غویثی بانو! تم یوں ہی پریشان ہو رہی ہو۔ لوگ تو تمہیں خوش قسمت ماں سمجھتے ہیں جس نے اتنے جری اور دلیر بیٹے کو جنا۔ حوصلہ رکھو اور اللہ سے اچھائی کی دعا کرو۔''

''وہ سب تو ٹھیک ہے پر یہ ماں کا دل ہے نا۔ اسی لیے گھبراتا ہے۔ الٹے سیدھے وہم آتے ہیں کہ کہیں ہاتھ پاؤں سے ہی بیکار نہ ہو جائے۔''

''کچھ نہیں ہوتا...... شانتی رکھو۔''

اور جب اسے یہ پیغام ملا کہ باہر تمہارے ماں باپ تم سے ملنا چاہتے ہیں تو اس نے اپنی زخمی ٹانگ اور بازو کو دیکھتے ہوئے سوچا...... ''اب اگر میں ان کے سامنے اس حال میں چلا گیا تو وہ کتنا روئیں گی مجھے یوں دیکھ کر...... یہ اچھا نہ ہوگا۔''

تب اس نے اپنے ساتھی لڑکے سے کہا...... ''شہید، تم باہر جا کر میری ماں اور بابا سے کہہ آؤ کہ وہ اب ٹھیک ہے اور اس وقت سو رہا ہے۔ ڈاکٹر نے اسے آرام کی تاکید کی ہے۔''

''بنگلہ آمار بھاشا''......(بنگلہ ہماری زبان)

حلق پھاڑ کر وہ چلایا۔ اس کے دائیں بازو کا گھونسا ہوا میں لہرا رہا تھا۔ گلے کی پھولی نیلی رگیں نمایاں تھیں اور اس کی سرخ آنکھوں سے دیوانگی مترشح تھی۔

یہ 21 فروری 1952ء کی ہلکی ہلکی خنکی والی ایک سہ پہر تھی۔ بنگلہ کو قومی زبان بنانے کا مسئلہ سنگین تر ہو گیا تھا۔ صوبائی حکومت صورت حال پر قابو پانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی اور اس سہ پہر جب لاکھوں انسانوں کا اجتماع ڈھاکا میڈیکل کالج کے سامنے سے گزر رہا تھا، پولیس نے گولی چلا دی۔

''بنگلہ آمار بھاشا''......

اس نے فلک شگاف نعرہ لگایا اور اس کے ساتھ ہی ہزاروں آوازیں فضا میں گونجیں۔

بوڑھوں، جوانوں اور اُدھیڑ عمروں کے اس جلوس کی جو قیادت کر رہا تھا وہ اٹھارہ سالہ لڑکا تھا۔ اس کی آواز میں بلا کی گھن گرج تھی اور وہ شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا۔

وہ لڑکھڑایا تھا۔ گولی سن سے اس کی ٹانگ چیر گئی تھی۔ جلوس میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ اندھا

دھند گولیاں چلنی شروع ہوگئی تھیں۔

''اردو چلیبے نا...... چلیبے نا''

(اردو نہیں چلے گی...... نہیں چلے گی۔)

''راشٹر بھاشا بنگلہ چائی''

(ملک کی سرکاری زبان بنگلہ چاہتے ہیں۔)

وہ بل کھا کر چیخا۔ سرخ خون اس کی ٹانگ سے فوارے کی طرح اُبلا اور سڑک پر بہنے لگا۔ ہجوم منتشر ہو رہا تھا۔ سڑک پر کتنے ہی زخمی پڑے تھے۔ کتنے جاں بلب تھے۔ تازہ سرخ خون سڑک کو گلنار بنا رہا تھا۔

اور جب اُسے ہسپتال لے جانے کے لیے ایمبولینس میں ڈالا جانے لگا تو اوندھے منہ لیٹے لیٹے اس نے ان کے ہاتھ درشتی سے جھٹک دے۔

''مرنے دو ہمیں، بنگال میر جعفروں سے کبھی خالی نہ ہوگا۔''

اٹھانے والے سانولے سلونے سپاہیوں کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ بے بسی سے انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اُس بوجھل نوکیلے وار کو خاموشی سے سہہ گئے۔

اور ڈھاکا میڈیکل کالج کے اس جنرل وارڈ میں بے ہوشی میں ڈوبی اس کی لڑکھڑاتی آواز بہت دور تک سنائی دی۔ سفید اکڑی ساڑھی پر اوورکوٹ پہنے وہ لڑکی جس کے بھاری جوڑے پر چھوٹی سی کیپ چنی تھی، نے چونک کر اسے دیکھا، اس کے ہاتھ میں پکڑی سرنج کانپی تھی اور اس کی آنکھوں میں نمی اُمنڈی تھی جس نے اس جگہ کو بھی دھندلا دیا تھا جہاں وہ انجکشن لگانے جا رہی تھی۔

تب دھیرے سے اس نے اپنی آنکھیں صاف کیں اور اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا، اس کا جی چاہا تھا وہ اس پر پیار کرے۔ اس کا دل بھاری ہو رہا تھا۔ کُڑھ کر اس نے سوچا...... ''یہ جو قربانیاں دے رہے ہیں، کون جانتا ہے ہمیں اس کا ثمر ملے گا بھی یا نہیں؟''

اور جب وہ وارڈ سے باہر آ رہی تھی، اس کی ساتھی سسٹر نورالنہار کا چہرہ تپ رہا تھا۔اس نے بوجھل آواز میں اسے بتایا تھا کہ دو لڑکے شہید ہو گئے ہیں۔

وہ بہت غصے سے بولی......''میں کہتی ہوں ہماری قوم کی غیرت کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ ہاتھ جو اپنے ہی جگر گوشوں پر گولیاں چلا رہے ہیں۔ٹوٹ کیوں نہیں جاتے؟ یہ پچھمی پاکستان والوں سے اتنا خائف ہیں؟''

اور نورالنہار نے آہستگی سے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا......''فردوسی! اتنا اونچا کاہے کو بولتی ہو۔نوکری سے ہاتھ دھونے ہیں تمہیں؟''

''پر تم ہی بتاؤ! ان خون سے لتے پتے زخمیوں کو دیکھ کر دل نہیں کٹتا! یہ ہماری متاع ہے جسے ہم یوں ضائع کر رہے ہیں۔''

جب وہ نرسنگ روم میں آئی تو اس نے اس بہاری لڑکی کو بہت نفرت سے دیکھا جو اس کی روم میٹ ہونے کے ساتھ اس کی اچھی دوست بھی تھی اور جس سے وہ اپنے فارغ وقت میں نہایت شوق سے اردو لکھنا پڑھنا سیکھا کرتی۔

اس کی بے رخی محسوس کرتے ہوئے اس گوری رنگت والی لڑکی نے جو پھولدار بادامی قمیص اور ہم رنگ شلوار پہنے تھی، نے خود سے کہا تھا......'تمہاری نفرت اور کشیدگی کی وجہ کم از کم میری سمجھ سے تو بالاتر ہے۔ باہر تمہارے بھائی بندوں پر اگر گولیاں چل رہی ہیں تو اس میں میرا کیا قصور! تمہارا میری طرف ان ٹیڑھی میڑھی نظروں سے دیکھنا شاید اس لیے ہے کہ میری مادری زبان اُردو ہے تو اس میں بھی میری کوئی خطا نہیں۔ میں اب تم لوگوں سے فضول بحث میں الجھنا نہیں چاہتی وگرنہ میرا جی تو چاہا تھا کہ تم لوگوں سے پوچھوں کہ ان دو لڑکوں کو جو اس ہنگامے میں مارے گئے ہیں، شہید کس لیے کہہ رہی ہو؟

'لسانی تعصبات کو فتنہ بنا کر اس میں مرنے والے اگر شہید ہیں تو مجھے افسوس ہے کہ تمہیں شہادت کا مفہوم ہی نہیں معلوم۔ بنگلہ کو قومی زبان بنانے کے سلسلے میں یہ جدوجہد تعمیری ہے؟ ذرا

اپنے ضمیر سے پوچھو۔ ایک ملک کی وحدت و سالمیت کے لیے اس سے بڑھ کر اور المیہ کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی زبان ایک نہ ہو۔'

اور جب وہ فیض آباد کی گوری رنگت والی لڑکی اپنی رات کی ڈیوٹی پر وارڈ میں آئی تو ایک نحیف، ٹوٹی آواز...... ''آمار...... بھاشا...... بنگلہ''...... اس نے سنی...... ''یہ کچھ زیادہ ہی جنونی معلوم ہوتا ہے''...... وہ خود سے کہتی ہوئی اس طرف بڑھی جدھر سے یہ آواز آ رہی تھی، وہ کھلے ہاتھ پاؤں اور اچھے قد کاٹھ کا ایک نوعمر لڑکا تھا جو پورے بستر پر پھیلا پڑا تھا۔ گلوکوز قطرہ قطرہ اس کے جسم میں جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ گہرا سانولا ہونے کے باوجود ملیح تھا۔ پر یہ ملاحت اسے زہر لگی۔ بہت تلخی سے اس نے سوچا...... ''انہیں کون سمجھائے کہ ملّی وحدت کے لیے ایک زبان کا ہونا کس قدر ضروری ہے۔ اردو سے یہ کیسا تعصب ہے؟''

وہ اس کے بیڈ کے قریب آئی، جانے کس جذبے کے تحت اس نے اس کا دایاں ہاتھ جو پٹی پر پڑا تھا سیدھا کیا، وہ دست شناسی میں کافی ماہر تھی۔ لیڈی ازبلا تھوبرن کالج لکھنؤ میں جب وہ سال اول میں پڑھتی تھی وہیں اسے ہاتھ کی ریکھاؤں سے دلچسپی پیدا ہوئی جو بڑھتے بڑھتے جنون کی صورت اختیار کر گئی۔

اور اس سولہ سالہ لڑکے، جس کا نام اس کے دادو نے بہت چاؤ سے اجتبیٰ الرحمٰن رکھا تھا، کا ہاتھ دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ دماغ کی ریکھا پوری ہتھیلی کو کراس کرتی بہت نیچے کو آ گئی تھی، ہر لکیر غیر معمولی تھی۔ یہ ایک ایسا ہاتھ تھا جو اگر تعمیری راستے پر چل نکلا تو دنیا کو بہت کچھ دے گیا اور اگر تخریب میں پھنس گیا تو تباہی کا باعث بنا۔

کوئی مریض کراہ رہا تھا۔ وہ چونکی اور واپس لوٹتے ہوئے ڈوبتی آواز میں بولی۔

''اے اللہ! تُو اسے امن اور سلامتی کا درس سکھانا۔''

اور پھر بہار کی ایک حسین شام کے ہلکے ہلکے دھندلکے میں اس کا چہرہ مسکرا رہا تھا۔ اس کی خوبصورت ماں اس کے بستر کے سامنے سٹول پر بیٹھی ہونٹوں پر مسروری مسکراہٹ لیے اسے

دیکھ رہی تھی۔

واقعہ یہ تھا کہ مرکزی حکومت نے بنگالی کو قومی زبان کا درجہ دے دیا تھا۔

''ماں! آج اگر دادو زندہ ہوتے تو کتنا خوش ہوتے!''...... وہ خوشی سے چہکتے ہوئے بولا۔

''اگر زندہ ہوتے تو جس حال سے تو گزرا ہے اسے دیکھ کر مرنے سے پہلے ہی مر جاتے۔''...... ماں کا چہرہ دکھی ہو گیا تھا۔

''یہ مت کہو ماں! اپنے حق کے لیے آواز اٹھانے والی قومیں کبھی پھلی پھولی نہیں۔ ان چند سالوں میں جتنے شہید اور زخمی ہوئے ان کے والدین کی اگر یہ سوچ ہوتی تو یہ دن کبھی دیکھنے کو نہ ملتا۔ اپنی ذات سے پیار کرنے والوں کو بھی کبھی بقا ملی ہے؟''

اور جب ملاقات ختم ہونے کی گھنٹی بجی تو اس نے ماں کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ ''میں اگر آج گھر ہوتا تو چراغاں کرتا۔ ماں! اب تم میری جگہ یہ کام کرو گی۔''

''پر بیٹے! ابھی تو شہر کی فضا بہت غمزدہ ہے، ایسے میں چراغاں کرنا کچھ اچھا معلوم نہیں ہو گا۔''

''چھوڑو ماں! ہم نے ایک عظیم مقصد کے لیے طویل جدوجہد کی ہے۔ آج جب ہمیں منزل مل گئی ہے تو خوشی ضرور منانی چاہیے۔''

''خوشی کیوں نہیں منائیں گے! پر تم صحت یاب ہو کر گھر تو آ جاؤ۔''

''اس کی فکر مت کرو، میں اب بالکل تندرست ہوں۔ ماں! تم آج گھر پر چراغاں ضرور کرو گی۔''...... وہ فیصلہ کن آواز میں بولا۔

گلابی جل پدو دھوپ میں چمکتے تھے۔ کنارے کنارے پھیلی جل بیل خوبصورت لگتی تھی، سبزی مائل پانی میں ناچتی پھرتی مچھلیاں دل لبھاتی تھیں اور پوربی ہوائیں سرسراتی پھرتی تھیں۔

پر یہاں پوکھر میں تیرتے ہوئے اسے یہ سب قطعی اچھا نہ لگ رہا تھا، کیونکہ ابھی ابھی اسے یوں لگا تھا جیسے اس نے کہا ہو۔...... ''سومیتا! تم تیرتے میں جل پری لگتی ہو۔'' ......اس نے گردن گھما کر اپنی پشت کو دیکھا تھا، اس کے لانبے سیاہ بال پانی میں مچلتے تھے اور آسمانی ساڑھی پھولی پڑ رہی تھی۔

''کان ہی بجتے ہیں نا میرے۔'' ......اس نے دکھ سے سوچا اور چاہا کہ ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دے اور بہت نیچے گہرائیوں میں ڈوب جائے۔

تب پوکھر کا چکر پورا کیے بغیر وہ کنارے کی اور آ گئی۔ سیڑھیوں پر بیٹھ کر اس نے خالی خالی ویران آنکھوں سے اپنے چاروں اور دیکھا۔ اس کا سڈول گداز جسم گیلی ساڑھی میں سے پھوٹا پڑتا تھا...... ''ہنسی چھن گئی ہے کہ اب وہ نہیں، جو کہے گا سومیتا! یہ تم ہنسی ہو یا کہیں

گھنٹیاں بجی ہیں۔"

اور جب وہ تولیے کا گاؤن کندھوں پر ڈالے راجباڑی کے عقبی کمروں کی اور بڑھ رہی تھی، اس نے چلتے چلتے خود سے کہا تھا۔

"جدائی اذیت ناک ہے، جسم اور روح فرقت کی آگ میں جلتے ہیں اور یوں ہی جلتے جلتے ایک دن راکھ ہو جائیں گے۔ تم نظریات بدلنے کی جدوجہد میں گم ہو اور کون جانے کب تک گم رہو گے؟ یہاں ڈستی تنہائیاں اور خطرات کی سولیاں ہیں جن کے پھندے ہر آن گردن کی اور بڑھتے نظر آتے ہیں۔"

اس نے کمرے میں آ کر ساڑھی بدلی۔ ناریل کا تیل سر میں ڈالا، کنگھی کی، مانگ میں سیندور انڈیلا اور ماتھے پر ٹیکہ لگایا۔ وہ یہ سب کام کرتی رہی پر من ویران ہی رہا۔

ابھی شام ہونے میں دیر تھی۔ اروما اور سوشیل، اس کے دونوں بچے سو رہے تھے۔ نوکر اسے بتا گیا تھا کہ وہ بلیدان کے لیے بکرا خرید لایا ہے پر ابھی کالی مندر جانے میں دیر تھی۔ وہ عبادت خانے کی اور چلی گئی جہاں سَرسوتی اور دُرگا کی مورتیوں کے سامنے بیٹھی وہ اشلوک پڑھتی رہی اور گھنٹہ بھر بعد جب وہ وہاں سے اٹھی تو ویسی ہی بے سکون تھی۔

اس سے کیا بہتر نہ تھا کہ ہم میں سے ایک موت کی بھینٹ چڑھ جاتا۔ بھگوان صبر تو دے دیتا۔ اب تو یوں لگتا ہے، جیون یوں ہی غم کی صلیب پر چڑھے چڑھے گزر جائے گا۔

اور جب وہ کالی ماتا کے چرنوں میں چڑھاوے کے لیے تھال میں پھول بتاشے، ناریل اور کیلے سجا رہی تھی، اسے رنیش کا خط ملا جسے اس کا سسر خصوصی راز داری سے اسے خود دینے آیا تھا۔ اس نے سارے کواڑ کھڑکیاں بند کیں اور پڑھنے بیٹھ گئی۔

اس کا جسم لرز رہا تھا، اس کی آنکھوں سے بھادوں کی جھڑی لگ گئی تھی۔

"رنیش!"...... اس نے کانپتے ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹا...... "مجھے ہندو دھرم اور سواستک کی عظمت کے لیے جدوجہد کرنے کا سبق نہ دو۔ میں نے چاہا خود کو تمہارے فلسفے میں گم

کر دوں، دھرم میں ڈوب جاؤں، ہر لمحے تمہاری ان کاوشوں کی بارآوری کے لیے دعائیں مانگتی رہوں جو تم پاکستان کو ختم کرنے کے لیے کر رہے ہو پر یہ سب کچھ کرتے ہوئے بھی میں بے سکون ہوں۔ یہ آنکھیں تمہاری دید کو ترس گئی ہیں رنیش!''

اس نے برستی آنکھیں پونچھیں اور خط پھر پڑھنے لگی۔ القاب و دعا کے بعد اس نے لکھا تھا......'سویتا! یہ تم ہو؟ کمال عبداللہ کے ہاتھ بھیجی گئی تصویریں اس وقت میری میز پر پڑی ہیں، تمہاری آنکھیں ویران ہیں اور چہرے پر یاس کے سائے۔ سویتا! انہیں دیکھ کر میرا دل کٹتا ہے۔ میں جو راہ چن بیٹھا ہوں اس پر مجھے کوئی پچھتاوا نہیں۔ ہندو دھرم اور سواستک کی عظمت ہندو جاتی سے قربانیاں چاہتی ہیں۔ میں نے قربانی دی ہے اور دے رہا ہوں۔ میرا دل اور پاؤں دونوں لہو لہان ہیں پر مجھے غم نہیں کیونکہ منزل کے نشان نظر آنے لگے ہیں۔...... تمہیں چند دن بعد معلوم ہو جائے گا کہ حکومتِ پاکستان نے میرا اور شنگھرام کا پوربو بنگال میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا ہے۔ میں تمہیں کہوں گا کہ حوصلہ رکھو اور اچھے دنوں کا انتظار کرو۔ یہ میرا وچن ہے تمہیں کہ تم کلکتہ پاسپورٹ اور ویزا کے بغیر آؤ گی۔'

'وہ سب تو ٹھیک ہے۔ وہ سسکتی رہی۔ پر اس دل کو کیسے سمجھاؤں جو بھٹکتا رہتا ہے۔ میرا دھرم تو تم ہو رنیش!'

اور جب وہ تباہی کے دیوتا بھیروں کی انتہائی ڈراؤنی بدصورت بیوی ماتا دیوی کے حضور پھول چڑھا رہی تھی۔ اس کے بارہ سالہ بیٹے نے مارے خوف کے آنکھیں بند کر لی تھیں اور دس سالہ لڑکی نے اس کے آنچل کو پکڑ کر ہکلاتے ہوئے کہا تھا۔'' ماں! اس کی زبان سے خون کا ہے کو ٹپکتا ہے؟ اس کی تین آنکھیں اور چار بازو کیوں ہیں؟ ماں! باہر چلو ڈر لگتا ہے۔''

اس نے سر کا آنچل درست کرتے ہوئے انہیں بازوؤں میں سمیٹا اور بولی......'' ماتا کے حضور ایسے نہیں بولتے بیٹے۔ ماتا سے کہو رام تمہارے بابا کو دیش جلدی واپس لائے۔''

دونوں بچوں نے ماں کے الفاظ دہرائے اور اس کے ساتھ باہر آ گئے۔ ملحقہ احاطے میں

بکرے کا بلیدان دیا جا چکا تھا۔ کٹا سر تانبے کی کٹوری پر رکھا تھا۔ قطرہ قطرہ خون رس رہا تھا۔ اس نے انگلیاں ڈبو کر اپنے بچوں کے ماتھے پر خون کے قرمزی قشقے لگائے اور بعد میں اشلوک پڑھتے ہوئے اپنے ماتھے پر بھی۔

اور جب وہ گھر کی اور واپس آ رہی تھی۔ سوشیل نے اس سے کہا۔

''ماں! بھگوان کیا ہم سے ناراض ہیں؟ اتنی دعائیں مانگی ہیں بابا کے لیے، پر وہ سنتا ہی نہیں۔'' اور اس نے چلتے چلتے دل میں کہا۔ ''ہاں شاید! ناراض ہی ہیں۔''

"تمہیں کرنل محسن یقیناً یاد ہوں گے۔ ان کی بھتیجی ایم۔ اے کے لیے ڈھاکا یونیورسٹی آنا چاہتی ہے۔ یہ لڑکی بنگلہ کلچر اور پوربو پاکستان کے مسائل میں گہری دلچسپی رکھتی ہے۔"

اس نے مونوگرام والا یہ خط یہیں تک پڑھا، نظریں اٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھا، اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ تب ایک اچٹتی سی نظر اس نے خط کے اوپر بائیں طرف ڈالی جہاں کرنل نذرُالاسلام پنجاب رجمنٹ چمک رہا تھا۔

'کرنل نذرُالاسلام! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ جس دنیا میں مگن ہیں اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'

اور پھر یوں ہوا کہ اس نے خط پورا پڑھے بغیر لاپروائی سے ٹرے میں پھینک دیا اور انتہائی کمینے پن سے خود سے بولا...... "میں نہیں جانتا کسی کرنل ورنل کو اور تُف ہے! پچھمی دیش کی ان الٹرا ماڈرن لڑکیوں پر جنہیں ہمارے مسائل میں بھی گلیمر نظر آتا ہے اور جو اسے اتنی ہی دلچسپی ہے بنگلہ کلچر سے تو یہ اپنے اُن کولونیل مزاج کے انکلوں سے کیوں نہیں پوچھ لیتی جو یہاں ہم پر حکومت کرنے آتے ہیں۔ وہ ناک چڑھا چڑھا کر اس کی تفصیلات بتانے میں بلاشبہ فخر محسوس کرتے۔"

اس نے بقیہ خطوں کو دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ انہیں پڑھتا اور ڈائری میں اہم نوٹس لیتا جاتا تھا۔ ڈھیر ساری ڈاک ابھی دیکھنے والی پڑی تھی۔ پچیس دن بعد وہ ابھی کل مغربی جرمنی سے لوٹا تھا اور خطوں کا انبار اکٹھا ہو گیا تھا۔

جب وہ کام نمٹا کر اٹھنے کے قریب تھا، ابو منصور کمرے میں آیا اور اس نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی صحافیوں کے ساتھ پریس کانفرنس کی تفصیلات سے اسے آگاہ کیا۔ وہ گھنے بالوں سے پُر مضبوط ہاتھ ٹھوڑی پر رکھے نہایت سکون سے اس کی باتیں سنتا رہا اور دیر بعد آہستگی سے بولا۔...... ''یہ سنگینوں اور تلواروں کے بل پر ہمارا دماغ درست رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا انجام یقیناً اس سے مختلف نہ ہوگا۔ جوڈین بین پھو میں فرانسیسی فوجوں کا قوم پرستوں کے ہاتھوں ہوا تھا۔''

وہ جانے کے لیے کھڑا ہوا، اس لمحے اسے اپنے اعصاب پر شدید دباؤ کا احساس ہوا۔ طبیعت میں مایوسی اور افسردگی بھی محسوس ہو رہی تھی پر اس کے باوجود اس نے ہاتھ بڑھا کر اس خط کو اٹھا کر بریف کیس میں ڈالا جسے تھوڑی دیر قبل اس نے نہایت لاپروائی سے بغیر پڑھے پھینک دیا تھا۔ وہ گھر جا رہا تھا، خط اس کے چچا کا تھا جو اسے اپنی ماں کو دینا تھا۔ جس نے صبح چلتے ہوئے تاکید کی تھی کہ اپنی ڈاک دیکھنا کہیں نذرُل کا پتر نہ ہو، اتنے دن ہو گئے ہیں کوئی خیر خبر نہیں ملی۔

اور جب اس مختصر سے برآمدے میں ایزی چیئر میں دھنسی ہوئی خوبصورت عورت نے جو ٹنگا ئیل کی دھانی رنگی ساڑھی پہنے تھی، وہ خط پڑھا تو ان کا چہرہ چمکا۔

''لو نذرُل نے یہ کیا لکھا ہے کہ چند دن بعد وہ ہاسٹل چلی جائے گی۔ میں اسے ہال میں تو کبھی نہ رہنے دوں گی۔ اس گھر میں لڑکی کی تو ہمیشہ سے کمی ہے اندر باہر گھومتی پھرتی سندر لگے گی۔''

پر جب انہیں یہ خیال آیا کہ اونچے گھرانے کی یہ لڑکی جو یقیناً کوٹھیوں بنگلوں میں رہنے کی عادی ہے، کیا میرے چھوٹے چھوٹے کمروں والے اس فلیٹ میں رہ سکے گی؟ اور چپاتی تو

مجھے پکانی آتی ہے نہ سکینہ کو جو وہ روٹی کی عادی ہوئی تو اور بھی دشواری ہوگی۔

انہوں نے خط دوبارہ پڑھا...... ''ارے تو یہ وہی لڑکی ہے!''...... وہ چونکیں جس کے بارے میں نذرل اکثر لکھا کرتا تھا...... ''میں پہچانی ہی نہیں۔ خیر اب فکر کی کوئی بات نہیں۔''...... انہوں نے خود کو تسلی دی اور اونچی آواز میں بولیں...... ''اے شبلی! نذرل کو تم خط لکھ دو گے یا میں لکھوں۔''

اس نے چوک پر چت لیٹے اپنی ماں کی آواز سنی۔ جس میں چھلکتی خوشی اسے ان کا چہرہ دیکھے بغیر محسوس ہوگئی تھی...... ''میری ماں کو تو لڑکیوں کا ہوکا ہے۔ اللہ نے انہیں بیٹی نہ دے کر اچھا نہیں کیا۔ اب فوجیوں کے خاندان کی اس لڑکی کی یہاں آمد کا جان کر خوشی سے بے قابو ہو رہی ہیں۔ پر وہ اس دڑبے نما گھر میں رہے گی کیا؟''

ماں نے اس کو پھر پکارا...... ''تم کچھ بولے نہیں شبلی!''

اس نے رخ پھیرا، تکیے کو دوہرا کیا اور آنکھیں موندتے ہوئے بولا...... ''ماں! آپ ہی لکھ دیں۔ میرے پاس تو وقت نہیں۔''

وہ اپنے اُس چچا سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا تھا جو پچھمی پاکستان میں رہتا تھا، جو وہاں کے باسیوں سے محبت کرتا تھا۔ جو خاکی وردی پہنتا تھا اور شانوں پر چاند ستارے اور پھول سجاتا تھا اور جب ڈھاکہ آتا، عزیزوں، رشتہ داروں کے پاس بیٹھ کر کہتا تھا...... ''یہ کاہل بیکار قوم ہرگز جمہوریت کے قابل نہیں۔ اسے صرف ڈنڈے کی ضرورت ہے۔''

ماں کو اپنے بیٹے کے اس لاتعلق سے جواب پر غصہ آیا...... اپنے گھنے لانبے بالوں کو سمیٹ کر اٹھتے ہوئے وہ خود سے بولیں...... ''میرے اس لڑکے کا تو دماغ ہی ٹھکانے نہیں۔ اللہ مارا جانے کن فضول نظریات میں الجھا ہوا ہے کہ خونی رشتوں کو بھی ان ہی زاویوں کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ کوئی بات ہے بھلا!''

وہ زیر لب مسکرائی تھی۔

نذرل چچا نے سگار پیتے ہوئے کس اطمینان سے اسے ایک ایک بات کی تفصیل بتائی۔

''ہاں تو بھئی میں کہہ رہا تھا، میری بھابی کا ناک قطعی بنگالیوں جیسا نہیں بلکہ......''

وہ سگار کا دھواں چھوڑنے کے لیے رکے اور اس نے ہنستے ہوئے فقرہ پورا کر دیا۔

''افغانیوں جیسا ہے۔''

''یہ تم اتنی عقل مند ہوتی جا رہی ہو۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے اسے بغور دیکھا تھا۔

پھر وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ''ناک کا بانس خوب اونچا، اچھا گورا رنگ، موٹی آنکھیں اور سمارٹ سے جسم پر لمبا قد، یہ میری بھابی ہیں۔ ایئرپورٹ پر انہیں ڈھونڈنے میں تمہیں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوگی۔ یوں میں تمہارے متعلق بھی انہیں کافی لکھ چکا ہوں۔ بہت شفیق ہیں۔ اپنے پہنچنے کی مجھے فوراً اطلاع دینا اور گاہے بگاہے خط بھی لکھتی رہنا......''

یہ سب سمعیہ علی سوچ رہی تھیں جو اس وقت پی۔ آئی۔ اے کے سفید اور سبز بوئنگ میں بیٹھی وہاں جا رہی تھی جہاں خوبصورت جزیرے ہیں، گنگناتی ندیاں ہیں، حسین آبشاریں اور

خوبصورت جھیلیں ہیں اور جس کے باسیوں کو مشرق کے اطالوی کہا جاتا ہے۔

اس نے شیشے سے جھانک کر دیکھا۔ بادلوں کی گہری تہوں کے سوا کچھ نظر نہ پڑا، وہ دلّی کے اوپر سے گزر رہی تھی۔ کچھ مبہم مبہم سے اندیشے، نامعلوم سے وسوسے، ان گنت سنی سنائی کہانیاں دماغ میں آئیں۔ اس نے سر جھٹکا اور چائے کے لیے بٹن دبا دیا۔ ''الٹی سیدھی سوچوں سے قبل از وقت ذہن کو نڈھال کرنے سے فائدہ؟'' وہ خود سے بولی اور اطمینان سے چائے پینے میں جت گئی۔

انہیں حفاظتی پٹیاں باندھنے اور وقت کو ایک گھنٹے آگے کرنے کی ہدایات دی گئیں اس نے دونوں کام کیے اور سر پشت سے ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ ایک مہیب آواز کے ساتھ جہاز رکا، اس نے بیگ کندھے پر لٹکایا۔ پھلوں کی ٹوکری ہاتھ میں پکڑی اور سیڑھیاں اُترتے اُترتے اپنے گرد و پیش کو دیکھا۔ تیج گاؤں کا ہوائی اڈہ جس پر بدلیاں جھوم کر آئی تھیں۔ چمکیلا سبزہ آنکھوں کو طراوت دے رہا تھا۔ مین بلڈنگ بہت معمولی تھی۔ اس نے حیرت سے اسے دیکھا اور سوچا۔

''یہ صوبائی دار الخلافہ کا ایروڈرم ہے جہاں قدرت کا حسن بلاشبہ بکھرا پڑا ہے پر انسانی کاریگری اور شان کا فقدان ہے۔ ایسا کیوں ہے؟''

اس نے اوپر گیلری میں کھڑے لوگوں کو دیکھا۔ نیچے نظر دوڑائی پر وہ ستواں ناک کہیں نظر نہ آیا جو بقول نذرُل چچا ان کی بھابھی کی پہچان کا امتیازی نشان تھا۔

''یہ تو اچھا نہ ہوا! اب اس اجنبی شہر میں احمقوں کی طرح منہ اٹھائے مجھے ان کا گھر ڈھونڈنا پڑے گا اور اس کام سے مجھے ازلی نفرت ہے۔''...... وہ رک گئی تھی کیونکہ اس کی پشت سے کوئی بولا تھا۔

''آپ اکیلی ہیں؟''...... اس نے دیکھا یہ بھورے رنگ کا ادھیڑ عمر کا آدمی تھا جو چار بچوں اور ایک سانولی سی عورت جس نے بڑے بڑے پھولوں والی ٹیرِ ون کی ساڑھی پہنی تھی، کے ساتھ کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

''جی ہاں''......اس نے کہا اور جب انہوں نے اسے مطلوبہ جگہ پہنچانے کی پیشکش کی تو اس نے ان کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ خدا کا بھی شکر ادا کیا۔ جس نے اتنی جلدی اسے اس بڑی مصیبت سے نجات دلا دی۔

اندر پہنچ کر اُس نے اپنا سامان پہچانا اور باہر نکلنے کے لیے اس راہداری سے گزرنے لگی جس کے دونوں طرف ڈھیر سارے لوگ کھڑے تھے۔

تب اچانک اُسے محسوس ہوا کہ وہاں موجود ایک خاتون ہو بہو ویسی ہی ہیں۔ جیسی نذرُل چچا نے بتائی تھی۔ اس نے غور سے دیکھا۔ سفید سوتی ساڑھی میں ان کی چمپئی رنگت چمک رہی تھی، ناک کی بلندی نے ذرا بھی شبہ نہ رہنے دیا۔

تب نرم اور محبت گھلی آواز میں اس سے اس کا نام اور جگہ پوچھی گئی۔ جہاں سے وہ آ رہی تھی۔ بنگلہ زبان میں یہ استفسار اسے کچھ زیادہ سمجھ نہ آیا، بس اس نے قیاس سے کام لیا اور ان آنکھوں سے ٹپکتی محبت اور نرمی پر یقین کیا۔ ان لوگوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس نے انہیں بتایا کہ وہ جس خاتون کی متلاشی تھی وہ مل گئی ہیں۔ ان کے ساتھ وہ ویٹنگ روم میں آ گئی۔ وسیع ویٹنگ روم جہاں لوگوں کی گہما گہمی تھی۔ اسے تعجب ہوا کہ یہاں بیٹھنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔

گہرے سبز رنگ کی ٹیوٹا جسے ایک نوعمر لڑکا چلا رہا تھا ایئر پورٹ روڈ پر تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ باہر گہری گھٹائیں تھیں۔ رم جھم برستی بارش اور طراوت بخشتا سبزہ۔

راستے کی مختلف عمارتوں کے متعلق وہ اسے بتاتی جا رہی تھیں۔ ریڈیو پاکستان، کونٹی نینٹل سنٹرل پبلک لائبریری، یونیورسٹی گرلز رقیہ ہال، نیو کیمپس، یونیورسٹی اساتذہ کے فلیٹ، وائس چانسلر کی رہائش گاہ، یہ سب ان کے نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے شوق اور دلچسپی سے دیکھے۔

''ہم اب عظیم پور جا رہے ہیں۔''......چار منزلہ فلیٹ کے سامنے کار رک گئی۔

سیڑھیاں ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں، انہوں نے مسکراتے ہوئے اپنے ساتھ ساتھ

اس لڑکی کو دیکھا جو نڈھال سی ہو رہی تھی۔ تب محبت سے اپنا بازو اس کے شانے پر رکھتے ہوئے وہ بنگلہ میں بولیں۔

''تھک گئی ہو؟''......

اور اس لڑکی نے بہت خجالت محسوس کی۔ خود پر ہزار بار لعنت بھیجتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے کہا۔...... ''بھلا مجھ سے بڑا کوئی احمق بھی ہوگا؟ گھر سے چلی آئی ہوں بنگال پڑھنے اور بنگلہ بولنی آتی ہے نہ سمجھنی۔''

یہ آخری فلیٹ تھا شاید، جس کے سبز دروازے کے سامنے وہ کھڑی تھیں۔ انہوں نے گھنٹی بجائی۔ دروازہ کھلا، نحیف سی ملازمہ نے اسے دیکھ کر اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیری۔ یہ کمرہ جس میں وہ اس وقت تھی ڈرائنگ روم تھا۔ صاف ستھرا چھوٹا سا...... ملازمہ کو چائے لانے کے لیے کہا گیا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھی الجھن سی محسوس کر رہی تھی۔

اس کم بخت ماری زبان نے اسے ہراساں کر دیا تھا۔ وگرنہ وہ اس خاتون سے پل بھر میں گھل مل جاتی۔ ابھی تو ان کی آنکھوں میں ایسی محبت بھری مسکراہٹ تھی۔ جو اسے بہت حد تک سہارا دیے ہوئے تھی۔

ملازمہ چائے کی ٹرالی کمرے میں لے آئی۔ بہت ساری چیزیں تھیں۔ پر اس نے صرف وہ کھایا جس کا نام انہوں نے پیازو بتایا تھا۔ یہ واقعی بہت لذیذ تھا۔ شاید چنے کی دال کا تھا...... ''اب اگر مجھے بنگلہ بولنی آتی تو میں اس کی ترکیب پوچھتی اور اس کی تعریف کرتی۔ پر مصیبت تو یہ ہے کہ اتنی لمبی زبان منہ میں رکھتے ہوئے بھی میں گونگی بن گئی ہوں۔ کتنی عاجز تھیں ماں جی میری اس زبان سے، اب جو مجھے یوں چپ چاپ بیٹھے دیکھ لیں تو شاید یقین نہ کر پائیں کہ یہ میں ہوں۔''

اور ماں جی کا خیال آتے ہی اسے اپنا بھائی بھاوج اور پھولی پھولی گالوں والے بھتیجے بے طرح یاد آئے۔

اسے یاد آیا۔ اناؤنسر نے جب ڈھاکا کے لیے پی۔ آئی۔ اے کی بوئنگ کی پرواز کا

اعلان کرتے ہوئے مسافروں سے طیارے کی طرف جانے کی درخواست کی تھی تو وہ تیزی سے اپنے بھائی کی طرف مڑی تھی۔ پیشانی پر اس سے پیار لیتے ہوئے اس نے دیکھا تھا کہ اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ تب ایک دم اس کا جی چاہا تھا کہ وہ اپنا جانا ملتوی کر دے پر ایسا ممکن تو نہ تھا۔

اور اب ہزار میل دور یہاں بیٹھے ہوئے اس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ تب ہی دو لڑکے کمرے میں آئے...... ''یہ فخر الرحمٰن ہے۔''...... انہوں نے اس لڑکے کی طرف اشارہ کیا جس کا رنگ گندمی تھا اور ڈیل ڈول اچھا تھا۔ وہ ڈھاکہ انجینئرنگ یونیورسٹی کے سال دوم میں تھا۔

یہ نور العباد ہے اور فضائیہ کے شاہین اسکول میں دسویں درجے میں پڑھتا ہے۔

''ہمارے نام کافی لمبے ہیں، نور العباد کو سب بینو اور مجھے فخر کہتے ہیں''...... اس نے رواں انگریزی میں انتہائی بے تکلفی سے اُسے بتایا جس کے بارے میں اسے ابھی ابھی معلوم ہوا تھا کہ وہ فخر الرحمٰن ہے۔

ماں ہنستے ہوئے انہیں شاید یہ بتا رہی تھی کہ غریب لڑکی بنگلہ نہیں سمجھ سکتی اور پریشان ہے۔

وہ دونوں خاصے بے تکلف اور باتونی ثابت ہوئے، ان کی انگریزی بہت اچھی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اسے اس برآمدے میں لے آئے جو دراصل بینو اور اس سے بڑے بھائی کا اسٹڈی روم تھا۔ یہاں ڈھیروں کتابیں بانس کے بک شیلفوں میں چنی تھیں۔ دو پلنگ تھے۔ دیواروں پر منی پلانٹ کی بیلیں تھیں اور گملوں میں پتہ بہار کے بوٹے تھے۔ بستر پر بیٹھی تو اس کی سختی کا بھرپور احساس ہوا۔ پتہ چلا کہ یہاں بان کی چارپائیوں کا کوئی تصور نہیں لکڑی کے تختے والے پلنگ چلتے ہیں۔

انہوں نے اس سے تاش کے بارے میں پوچھا اور یہ جاننے پر کہ اسے رمی، سویپ، برج سبھی کھیل آتے ہیں وہ بہت خوش ہوئے، آناً فاناً انہوں نے میز پر کھڑکھڑاتے پتے بکھیر کر ماں کو آواز دے ڈالی۔ کھیل خوب جما اور اسے یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ ماں بہت اچھا کھیلتی ہیں۔

اور پھر ان دونوں کے درمیان کا تیسرا لڑکا بھی آ گیا۔ عطاء الرحمٰن جو بُلبُل کہلاتا تھا اجی

سی صورت رکھتا تھا۔ پر تیزی میں وہ ان دونوں سے آگے تھا۔ یہ آئی۔ ایس۔ سی (ایف ایس سی) کے دوسرے سال میں تھا۔ ماں کام کے لیے اٹھ گئی اور وہ ان کی جگہ آ گیا۔

اور اس خوبصورت موسم میں اس برآمدے میں جہاں روکھوریدی اور منی پلانٹ کی بیلیں دیدہ زیب لگتی تھیں۔ ان سب کے درمیان بیٹھے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ مجھے اس وقت یہ قطعی احساس نہیں ہے کہ میں ایک اجنبی جگہ پر اجنبی لوگوں کے درمیان ہوں۔ ان لوگوں کے خلوص اور ایک تیسری زبان نے اس غیریت کو ختم کر دیا ہے۔ اس سمے اسے بہت شدت سے یہ خیال آیا کہ یہ ہم جو فارسی وارسی پڑھنے میں وقت کا اتنا ضیاع کرتے ہیں تو اس کا فائدہ اور مصرف؟ مانا کہ ان کے ساتھ ہماری تہذیبی قرابت داری ہے پر ایسی اقربا پروری کس کام کی کہ اپنے بالکل نظر انداز ہو جائیں۔ اس قومی زبان کو اگر سکول میں پڑھایا ہوتا تو آج میں یوں گونگی تو نہ بنتی اور نہ ہی کسی غیر زبان کو اجنبیت کی دیواریں توڑنے کے لیے استعمال کرتی۔

گھرے گھرے بادلوں نے سرِ شام ہی اندھیرا کر دیا تھا۔ مچھلی کی خوشبو سارے گھر میں پھیلی تھی۔

اور پھر اس کا تعارف ان سے ہوا جو اس گھر کا سربراہ تھا۔ ان کا قد بس درمیانہ تھا، اس نے مؤدبانہ طریق سے انہیں تسلیم کہی تھی۔ جس کا جواب بہت شفقت سے دیا گیا تھا۔ انہوں نے اس سے سفر کے بارے میں، لاہور کے موسم کی بابت اور گھر والوں کے متعلق بہت سی باتیں کیں۔

''اِس گھر کے لوگ مخلص اور محبت کرنے والے ہیں، نذرُل چچا اور زہرت چچی کی طرح۔''......اس نے ان کے اٹھ جانے کے بعد سوچا۔

اور کھانے کی میز پر جب وہ ان تینوں کے ساتھ آ کر بیٹھی تو گھر کے بادشاہ اور وزیرِ اعظم نے اپنے اپنے طور پر سوچا تھا کہ نذرُل نے ٹھیک ہی لکھا تھا، یہ لڑکی بہت خوش طبع اور پسندیدہ عادات والی ہے۔ اب کتنی جلدی ان میں گھل مل گئی ہے۔ یوں اس گھر میں ایک لڑکی کی کمی کبھی کبھی بہت کھٹکتی ہے اور یہ اس وقت ان کے درمیان بیٹھی کتنی اچھی لگتی ہے۔

اس نے میز کا بغور جائزہ لیا تھا۔ خشک تلی ہوئی مچھلی۔ شوربہ، بھنا ہوا گوشت، مسور کی نرم دال، سلاد اور سفید موٹا چاول، اس نے چاول پلیٹ میں ڈالے۔ بینو نے خشک مچھلی کے قتلے اس کی پلیٹ میں رکھے۔ بلبل نے شوربہ ڈال دیا اور فخر نے بھنا ہوا گوشت۔

ماں اور بابا نے دلچسپی سے یہ دیکھا اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

''کھایئے سومی آپا!''...... بینو نے یوں کہا تھا جیسے وہ اس گھر میں ہمیشہ سے رہتی چلی آئی ہو۔

اُسے انہیں کیسے مخاطب کرنا تھا۔ یہ کٹھن کام بھی انہوں نے اپنی عقل مندی سے جلد ہی نپٹا لیا تھا۔ بلبل نے تاش کھیلتے کھیلتے کچھ محسوس کیا اور بولا ''یہ تو طے ہی نہیں ہوا کہ ہمیں آپ کو کیا کہہ کر پکارنا ہے؟''

اس نے پتوں پر جمی نظریں اٹھائیں۔ ان سب کی طرف دیکھا اور بولی ''میرا نام شاید آپ کو معلوم ہی ہو سمیعہ علی ہے۔ یوں گھر میں مجھے سومی کہا جاتا ہے۔ اب آپ لوگ جس نام سے چاہیں بُلا سکتے ہیں۔''

''تو ٹھیک ہے ہم آپ کو سومی آپا کہیں گے۔''...... بلبل نے فیصلہ صادر کیا اور اطمینان سے پتہ پھینکا۔

باہر کار رکی تھی...... ماں نے کھاتے کھاتے رک کر کہا۔ ''شاید شبلی آیا ہے۔''

سیڑھیاں چڑھنے کی آواز مانوس سی تھی۔ تبھی ملازمہ نے فوراً بڑھ کر دروازہ کھولا تھا۔ کوئی اندر آیا۔ اس نے اس آنے والے کو دیکھا۔ جس کے پاؤں میں عام سی کھلی چپل تھی اور جو سفید کھادی کے کُرتے اور پاجامے میں ملبوس تھا۔ پونے چھ فٹ سے نکلتے اس نوجوان کی چھاتی چوڑی اور رنگت گہری سانولی تھی۔ آنکھیں حسین تھیں اور باقی نقوش بس گوارا ہی تھے۔

وہ کھانے کی کرسی پر ہاتھ رکھے ماں سے باتیں کر رہا تھا۔ کبھی کبھی اپنے باپ کو بھی دیکھ لیتا تھا۔

''بیٹھونا! بھات نہیں کھاؤ گے؟''...... ماں نے اس سے کہا تھا اور اس نے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے اسے دیکھا جس کے شانوں تک کٹے ہوئے بالوں کے درمیان گلابی رنگ کا چہرہ اس کے گلابی لباس کے عکس سے کچھ زیادہ ہی گلابی نظر آ رہا تھا اور جو اطمینان سے کیوٹکس لگے ناخنوں والے ہاتھ سے بھات کھا رہی تھی۔

''ہوں! تو یہ ہیں نذرُل چچا کی بھتیجی۔''......اس نے اپنے دل میں کہا۔ بابا فون سننے کے لیے اٹھ گئے تھے۔ جب اس سے شستہ انگریزی میں پوچھا گیا کہ وہ مغربی پاکستان کے کس حصے سے آئی ہے۔

''لاہور سے'' ......اس نے جواب تو ضرور دیا پر سوچا کہ اگر یہ اسی گھر کا فرد ہے تو کیا اسے نہیں معلوم؟

''تو گویا حکمران طبقے سے آئی ہیں۔''

مانوس سے اس محبت بھرے ماحول میں طنز بھری مسکراہٹ کی تلخی لیے یہ جملہ پہلے تو اسے سمجھ ہی نہ آیا۔ بوکھلا کر وہ بولی...... ''جی'' ...... پر وہ بینو کی طرف متوجہ تھا جو کسی کانفرنس کے بارے میں اس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔

اسے یہ جملہ عجیب لگا تھا۔ ایک لمحے بعد جب اسے سمجھ آئی تو اس کے دل پر جیسے ایک تیر سا لگا۔

ملازمہ نے سیب اور خوبانی لا کر رکھیں جو وہ لاہور سے ان کے لیے لائی تھی پر اس نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا اور فوراً اُٹھ گیا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ بینو تاش کھیلنے پر مصر تھا پر اس نے تھکاوٹ کی آڑ لی۔ ماں نے بینو کو ڈانٹا اور محبت سے اُسے اس کے کمرے میں چھوڑ گئیں۔

اس کی آنکھوں میں تھکن بہت واضح تھی جبھی تو صبح ناشتے کی میز پر ماں اور بابا نے اسے دیکھتے ہی گھبرا کر بنگلہ اور انگریزی میں پوچھا تھا کہ اسے رات نیند کیسی آئی ہے؟

وہ ہلکے سے مسکراتے ہوئے بولی تھی ......''میں تو خوب جی بھر کر سوئی ہوں۔''

یوں وہ اصل بات بالکل چھپا گئی تھی کہ اس کی ساری رات ہی کچھ سوتے اور کچھ جاگتے میں گزری ہے۔ یہ حکمران طبقے سے آنے والی بات اس کے دماغ سے یوں چپک گئی تھی کہ لاکھ چھڑائے بھی نہ چھوٹ رہی تھی۔ اس نے اتنا تو سن رکھا تھا کہ پوربو پاکستان کے باسیوں کا ایک طبقہ ایسا ہے جو مغربی پاکستان اور خصوصاً پنجاب سے بہت متنفر ہے۔ پر یہ تو سنی سنائی باتیں تھیں جن کی صحت پر اُسے بہت کم یقین تھا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ رائی کے پہاڑ بنانا، باتوں میں سنسنی پیدا کرنا اور انہیں خوفناک رنگ میں پیش کرنا ہمارے لوگوں کی ایک خصوصیت ہے۔

پر رات کے تاریک لمحوں اور ہلکی ہلکی صبح کی روشنی میں اس کا دل کتنی ہی بار ڈوبا تھا صرف یہ سوچتے ہوئے کہ سنی سنائی باتیں حقیقت پر مبنی ہیں۔ یوں وہ یہ بھی نہ سمجھ پا رہی تھی کہ نذرل چچا کا یہ خاندان جو اتنا مہربان اور مخلص نظر آتا ہے، اس کا کوئی فرد ایسی بھی سوچ رکھتا ہے۔ خود نذرل

چچا اتنے محبِ وطن کہ انہیں پاکستان سے دیوانگی کی حد تک پیار ہے اور جو ریٹائرمنٹ کے بعد مستقل مغربی پاکستان میں سکونت پذیر ہونے کا سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں۔

''ممکن ہے ازراہِ مذاق ایسا کہا گیا ہو'' ......اس نے خود کو بہلانا چاہا۔

وہ اب تیار ہو رہی تھی۔ اسے آج یونیورسٹی داخلے کے لیے جانا تھا اور وہیں سے وہ ہوسٹل منتقل ہو جانا چاہتی تھی۔

اس نے بالوں کو سلجھا کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں خود کو دیکھا، پھولدار چاکلیٹی بیل باٹم میں وہ بہت دلکش نظر آ رہی تھی۔

تبھی ساتھ والے کمرے سے کچھ آوازیں بلند ہوئیں۔ وہ جان گئی تھی کہ کون کون بول رہا تھا۔ گفتگو بنگلہ میں ہو رہی تھی اور ماں بابا اور ان کے سب سے بڑے بیٹے کے درمیان تھی۔ اچانک اس نے سنا وہ انگریزی میں اپنے باپ سے کہہ رہا تھا۔

''بابا! یہ آپ مجھ سے اس مسئلے پر مت الجھا کریں۔ ان بیوروکریٹس اور فوجی حکمران ٹولے نے ہمیں پیس کر رکھ دیا ہے۔ بنگالی نیشنلزم یونہی نہیں ابھرا ہے، اسے ابھارا گیا ہے۔ اگر آپ کی کھلی آنکھیں اس سنہرے دیش کو کالونی بنے نہیں دیکھ رہی ہیں تو میں انہیں کھولنے سے رہا۔ آپ قومیت اور حُب الوطنی، خلاؤں میں پروان چڑھانا چاہتے ہیں۔ جو ممکن نہیں۔

وہ شاید اس کے بعد کمرے سے نکل گیا تھا کیونکہ اس نے اس کی بے حد تلخ آواز میں صرف یہ سنا تھا۔ ''یہاں ہڈیوں سے گوشت تک نوچ لیا گیا ہے اور یہ ہیں کہ بھائی چارے کا راگ الاپ رہے ہیں۔''

بابا نے اس کا کیا جواب دیا۔ یہ شاید اسے سننے کی اب فرصت نہ تھی۔ ایک ٹک اس نے اس دیوار کو دیکھا جو دونوں کمروں کے درمیان تھی تب ڈوبتی آواز میں اس نے خود سے کہا تھا ''تو تمہارا تعلق اس خاص گروہ سے ہے جو علیحدگی کو اپنی نجات سمجھتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ تمہیں میرے وجود سے تکلیف پہنچی ہے۔ تو یقین کرو مجھے اپنی اس حماقت پر خود بھی بہت افسوس ہے، پر

میں حیران ہوں کہ تم نذرل چچا کے بھتیجے ہو!''

ایک نظر اس نے کھڑکی سے باہر ڈالی پھوار پڑ رہی تھی۔ ''موسم تو بھیگا ہوا ہے۔ پر میرے چاروں طرف یہ آگ کیسی لگ گئی ہے؟'' اس نے رنج سے یہ سوچا۔ آنکھوں میں امڈتے آنسوؤں کو پونچھا اور کرسی کے ہتھے پر ٹک گئی۔

دیر بعد اس نے خود پر قابو پایا۔ باہر نکلی۔ کمرے سے اب صرف ایک تلخ آواز سنائی دے رہی تھی اور وہ ماں کی تھی۔ خدا جانے وہ کیا کہہ رہی تھیں۔

ماں نے شاید پردے کے نیچے سے اس کے پاؤں کی جھلک دیکھ لی تھی، تب ہی اسے پکارا تھا۔ وہ کمرے میں آئی، وہاں وہ دونوں ہی تھے۔ انہوں نے اسے بغور دیکھا۔ شاید وہ یہ جاننے کے متمنی تھے کہ اس نے کچھ سنا تو نہیں؟ اور ذرا ذرا سی باتوں پر سیخ پا ہونے والی لڑکی نے کمال ضبط سے کام لیا اور بابا کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ یہ مسکراہٹ مصنوعی تھی جسے جانے کس دِقت سے اس نے اپنے لبوں تک گھسیٹا تھا۔

اس نے ان دونوں سے جانے کی اجازت طلب کی۔ جس پر بابا بولے۔

''ارے کہاں بیٹے! تمہاری ماں تمہیں یونیورسٹی لے کر جائے گی۔''

اس نے فوراً انکار کیا، ماں کو بلاوجہ تکلیف دینے کا عذر پیش کیا۔ خود اپنے متعلق بتایا کہ وہ باآسانی لوگوں سے پوچھ پوچھ کر اپنا سارا کام کر لے گی۔ پر وہ نہ مانے۔

ماں کے ساتھ وہ نیچے آئی۔ یہاں سائیکل رکشا ان کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اس کی ساری جان اُسے دیکھ کر لرزی تھی۔ جو سائیکل کا ڈنڈا ہاتھ میں پکڑے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی سیاہ جلد کے نیچے ساری ہڈیاں گنی جاسکتی تھیں۔

''تو کیا اس کی ہڈیوں پر سے گوشت ہم نے نوچا ہے؟'' اس کا جی الٹا۔ ''نہیں! غلط ہے۔''......اس نے خود ہی تردید کی۔ پر جانے کیوں اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

ماں اچک کر رکشے میں بیٹھ گئی تھیں اور اسے بیٹھنے کا کہہ رہی تھیں۔

یہ بیسویں صدی کا ایک ترقی پذیر ملک ہے جہاں انسان انسان کو گھسیٹ رہا ہے۔

اور یہاں کھلی سڑک پر اس نے دیکھا، اس جیسے اس کے کتنے ہی بھائی بند انسانوں کو اس کھینچا تانی میں اپنی ہڈیاں توڑ رہے تھے۔ موسم بہت حسین تھا۔ بادل بدستور چھائے تھے۔ پر اسے موسم میں زہر گھلا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ دل اتنا بھاری تھا جیسے من من بھر کے پتھروں تلے آ گیا ہو۔ سڑک پر لوگ آ جا رہے تھے۔ چارخانی دھوتیاں، ملگجی بنیانوں اور ننگے پاؤں والوں کی اکثریت تھی۔ ان کے پاس سے گزرتی تیز رفتار کاریں بورژوا ذہنیت کی عکاس تھیں۔

تب اس سمے اس کا جی دھم سے سڑک پر کود جانے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہا پر اس کے ساتھ ایک انتہائی معزز خاتون تھیں جن کا بوجھل جوڑا ان کے شانوں پر بہت خوبصورت لگتا تھا۔

نیو کیمپس کی چار منزلہ عمارت کے کشادہ آنگن میں آ کر وہ رُک گیا۔ ماں کے ساتھ وہ بھی اتری، انہوں نے اسے چھ آنے دیے۔ ڈھائی تین من بوجھ اٹھانے کا معاوضہ...... اس کی لاغر ٹانگیں اب بھی کانپ رہی تھیں۔

اس نے اپنے اردگرد دیکھا۔ یہ سانولے سلونے لوگوں کا دیس ہے۔ پر اسے تو وہاں نکھرے رنگوں والے بھی کافی نظر آ رہے تھے۔ نازک اندام لڑکیاں سوتی ساڑھیوں میں لپٹی کتابیں کاپیاں ہاتھوں میں پکڑے اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔

وہ چھوٹے گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ طویل راہداریوں سے گزری۔ دروازے، کھڑکیاں شیشوں کی بجائے لکڑیوں کے تھے۔ کلاسوں میں بڑے بڑے بینچ اور ڈیسک تھے اور کوریڈورز کی دیواریں رنگین بنگلہ میں چھپے پوسٹروں سے بجی تھیں۔

لڑکوں کی ایک ٹولی ماں کو دیکھ کر رک گئی۔ تقریباً سبھوں نے ان کے ساتھ چلتی جدید وضع کی اس خوبصورت اور پُر اعتماد لڑکی کو قدرے حیرت سے دیکھا۔ انہوں نے شاید ماں سے یونیورسٹی آنے کی وجہ دریافت کی تھی اور وہ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں کچھ بتا رہی

تھیں۔ تب دولڑکے انہیں ہیڈ آف دی سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ کے کمرے کے سامنے چھوڑ کر چلے گئے۔ کمرے میں آرام کرسی پر نیم دراز ایک بے حد فربہ انسان کو اس نے دیکھا۔

''یہ تمہاری زہرت چچی کے ماموں ہیں۔''...... ماں نے اسے بتایا۔ تھوڑی دیر تک وہ ان کی احوال پُرسی کرتی رہیں۔ وہ بیمار تھے تب اس کا تعارف ان سے کروایا گیا۔

''بھئی! میں تو ان کا بہت دنوں سے انتظار کر رہا تھا۔ زہرت نے تو خطوں کی ڈاک بٹھا دی ہے۔ ابھی کل ٹرنک کال بھی کی تھی، بہت فکر ہے اسے اپنی بھتیجی کا۔'' وہ خوش دلی سے اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے تھے۔

انہوں نے فون پر کسی سے کچھ دیر باتیں کیں اور پھر انہیں اپنے ملازم کے ساتھ شعبۂ سیاسیات بھیج دیا۔ وہاں سے وہ رجسٹرار آفس گئیں اور جب سمعیہ علی ڈھاکا یونیورسٹی میں ایم اے کے سال اول میں داخل ہو گئیں تو اس نے سکھ کا لمبا سانس بھرا۔

اور پھر ہرے بھرے زمین کے اس قطعے میں سے گزرتے ہوئے جس کے ایک ہاتھ ادارۂ تعلیم و تحقیق کی عالی شان عمارت تھی اور دوسری طرف جناح ہال تھا۔ جہاں فواروں سے پانی اچھل اچھل کر نیچے گرتے ہوئے بہت اچھا لگتا تھا۔ اس نے ماں سے یہ کہا تھا کہ وہ اب ہوسٹل چلی جانا چاہتی ہے اور ماں نے اسے یوں دیکھا تھا جیسے اس نے کوئی بہت ہی غلط بات کہہ دی ہو۔ انہوں نے مزید کچھ بولنے کا موقع ہی نہ دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر جانے کے لیے رکشا میں جا بیٹھیں۔

وہ اس گھر میں مزید نہیں رہنا چاہتی تھی۔ یوں اتنے خلوص کا منہ توڑ جواب دینا بھی بری بات تھی۔ بابا کام سے آ چکے تھے۔ انہوں نے داخلے کی تمام تفصیل دریافت کی اور سب کچھ بتانے کے بعد اس نے ہوسٹل جانے کا پھر کہا۔

''یہ تمہارا اپنا گھر ہے بیٹے! اور گھر کے ہوتے ہوئے ہوسٹل کس لیے جانا چاہتی ہو؟''

وہ الجھی...... ''اے میرے اللہ! میں اب کیا کروں؟ کس جنجال میں پھنس گئی ہوں؟ اس

گھر میں مجھے ہرگز نہیں رہنا، وہ کیا آ کر پھر میری صورت دیکھے گا؟ یہ نہیں ہوگا''......اس نے یہ سب کڑھ کر سوچا اور ملتجی انداز میں بولی۔......''میں آپ کے خلوص اور محبت کی شکرگزار ہوں لیکن مجھے ہوسٹل میں رہنا زیادہ فائدہ مند نظر آتا ہے۔''

اس نے بہت سی دلیلیں دیں، جھوٹ موٹ اس لڑکی کا حوالہ دیا جو اسے رجسٹرار آفس میں ملی تھی اور جس نے ہال میں سیٹ کے لیے فوری کوشش کے لیے کہا تھا۔

بینو، بلبل اور فجر میں سے کوئی بھی اس کے ہوسٹل جانے پر رضامند نہ تھا۔ پر اس کی ضد کے سامنے بالآخر سبھی خاموش ہو گئے۔

بابا فخر سے کہہ رہے تھے۔......''تم بازار سے دہی کا ایک پیالہ لے آؤ۔ کل تمہاری ماں کو منگوانا یاد نہیں رہا تھا۔''

اور بلبل سے باتیں کرتے کرتے اس نے بابا کی یہ بات سنی اور اپنے دل میں سوچا کہ......''دہی تو مجھے کبھی اچھا نہیں لگا اور نہ ہی میں اسے شوق سے کھاتی ہوں اور کہہ دوں کہ یہ اگر میرے لیے منگوانا ہے تو تکلیف نہ کریں۔''......اور یہ کہنے ہی لگی تھی پر جانے کیا سوچ کر چپکی ہو رہی۔......''نہیں کہتی میں۔ کیا معلوم محسوس کریں۔''

اور کھانے کے بعد جب یہ دہی اس کے سامنے لایا گیا تو وہ حیران ہوئی، یہ گائے کا میٹھا زعفران ڈلا دہی تھا۔ نہایت لذیذ، خوش ہوئی وہ اسے کھا کر۔

اور اب اسے جلدی تھی کہ کسی طرح وہ اس گھر سے فوراً نکل جائے۔ ہر ہلکی سی آہٹ پر اسے محسوس ہوتا کہ وہ پونے چھ فٹا متعصب نوجوان آ گیا ہے۔

ماں افسردہ تھیں۔

رقیہ ہال کے سامنے گاڑی رکی تو بابا مسکرائے اور بولے۔

''لو یہ تمہارا جیل خانہ۔''......ہال کی پرووسٹ سے بابا کی اچھی راہ و رسم تھی۔ سیٹ آسانی سے اسے مل گئی۔ لوکل گارجین بابا اس کے خود بنے تھے اور جب وہ لوگ واپس چلے گئے تو

جانے کیا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کا سامان آفس کے سامنے برآمدے میں پڑا تھا اور وہ خود وہیں سیمنٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ باہر بارش کسی مہارانی کی طرح سبک خرامی سے اتر رہی تھی۔

یہ بہت وسیع ہال تھا۔ پانچ منزلہ جدید عمارت ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلی تھی۔ اس کے قریب ہی قوس کی شکل کی ایک اور عمارت تھی۔ ہرے بھرے لان جن میں پتہ بہار کے بڑے بڑے بوٹے بہت آن سے کھڑے تھے۔ اسوک کے لال پھول کھلے تھے، خوبصورت روشیں اور دائیں بائیں برآمدے مختلف عمارتوں کو آپس میں ملا رہے تھے۔ سائیکل رکشے دھڑا دھڑ آ جا رہے تھے۔

گھٹنے پر ٹھوڑی ٹکائے وہ خالی خالی نظروں سے اپنے سامنے دیکھ رہی تھی، بارش تیز ہو گئی تھی۔

اور ملازموں نے اس اتنی اسمارٹ اور خوش شکل لڑکی کو وہاں زمین پر یوں بیٹھے دیکھ کر حیرانی کا اظہار کیا اور اس سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں مؤدبانہ درخواست کی کہ وہ ملحقہ کامن روم میں بیٹھے۔ اس کا سامان وہ مین بلڈنگ میں جلد ہی پہنچائے دیتے ہیں۔

پر وہ بال کٹی لڑکی بہت نرمی سے بولی۔...... ''میں یہاں بالکل ٹھیک ہوں، تم کچھ فکر نہ کرو۔''

اور رقیہ ہال کے یہ ملازم جن کی عمریں یہاں گزر گئی تھیں۔ اس کے اتنے نرم اور میٹھے لہجے میں بات کرنے پر چونکے تھے۔ ان میں سے دو نے ایک دوسرے سے کہا۔...... ''یہ کسی اعلیٰ گھر کی لڑکی ہے۔''

وہ پژمردہ سی ہو رہی تھی۔ بنگال آ کر پڑھنے کی ساری اُمنگ بلبلے کی طرح بیٹھتی نظر آ رہی تھی۔

یہ حساس ذہن بھی کیا مصیبت ہے، بس ذرا تکلیف وہ احساس ملا تو یوں چھٹنے لگتا ہے کہ

مانو ابھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔

ایک بوڑھا سائیکل رکشے والا اوپر سے گزرنے کے بجائے برآمدے میں سے گزرا، پھٹی قمیص بھیگی ہوئی تھی۔...... ''اللہ!''......اس نے لمبی سانس لی اور گھٹنے پر رکھی ٹھوڑی اوپر اُٹھا لی۔خود پر اس نے شدید غصہ کھایا۔...... ''کیا بکواس ہے؟ آتے ہی سوچوں کے کن جھمیلوں میں پھنس گئی ہوں۔''

سامنے آڈیٹوریم میں لگے آٹومیٹک فون کے پاس کھڑی تین چار لڑکیاں باتیں کر رہی تھیں۔ڈھیلی ڈھالی ساڑھیوں اور کھلے بالوں میں وہ کسی طور بھی یونیورسٹی گرلز نظر نہیں آ رہی تھیں۔

اس کی نظر اپنے پاؤں پر پڑی، سفید گداز نرم پاؤں جن کے بڑھے ناخن سلیقے سے کیوٹکس میں ڈوبے تھے۔

''تمہیں میں اچھی طرح جانتی نہیں تھی ورنہ بتاتی کہ تم نے جو میرے کٹے بالوں اور فیشن ایبل لباس کو دیکھ کر سوچا ہوگا کہ جانے میرا تعلق کتنی اعلیٰ طبقے سے ہے تو ایسی کوئی بات نہیں۔''

ڈھاکا کے سینکڑوں گنجان گلی محلوں کی طرح میں بھی لاہور کی ایک ایسی ہی جگہ سے اٹھ کر آئی ہوں۔

اب میں یہ کیا بتاؤں کہ معاشی الجھنوں نے میرے گھرانے کو کتنا پریشان کیا۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور معاشرے میں اپنے لیے آبرومندانہ مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

تب وہ اس جہاز نما بلڈنگ کے ایک تلہ کے کمرہ نمبر 9 میں داخل ہوئی۔ملازم اس کا بستر بند لکڑی کے تختوں والے چھوٹے سے پلنگ پر پھینکتا ہوا بولا۔

''یہ ہے آپ کا کمرہ اور یہ ہیں آپ کی بندھولوگ۔''

اس نے ان تینوں لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا جو اپنے اپنے بستروں پر بیٹھی کتابوں پر سے سر اٹھائے اسے خاصی بے اعتنائی سے دیکھ رہی تھیں۔

یہ ایک مستطیل کمرہ تھا۔ جہاں چار پلنگ بچھے تھے۔ تین پلنگ کمرے میں موجود لڑکیوں کے تصرف میں تھے اور چوتھا یقیناً اس کے انتظار میں تھا۔ ہر پلنگ کے ساتھ ایک ایک ڈیسک اور کرسی تھی۔ دیواریں ہلکی سبز تھیں، کھڑکیاں اور دروازے جدید وضع کے تھے۔

تب ان میں سے ایک نے پوچھا کہ وہ کہاں سے آئی ہے؟ اپنے بارے میں اس نے انہیں بتایا اور ان کے متعلق تفصیلی جانا۔

وہ جو آخری کونے میں بیٹھی تھی دیناج پور کی لیل النہار تھی پر لیلیٰ کہلاتی تھی۔ اس کا رنگ اچھا کھلتا تھا۔ وہ بائیو کیمسٹری میں ایم۔ ایس۔ سی کے سال آخر میں تھی۔ دوسری شمس النہار تھی۔ جس کو مینی کہا جاتا تھا۔ یہ بنگلہ ادب میں آنرز کے سال اول میں تھی۔ تیسری کا تعلق پٹنہ سے تھا، یہ فلاسفی میں آنرز کر رہی تھی۔

اور تعارف مکمل ہونے تک وہ یہ جان چکی تھی کہ ان میں سے کوئی بھی ڈھنگ کی انگریزی نہیں بول سکتی۔

مجھے اب فی الفور بنگلہ سیکھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اس نے سوچا اور اپنی چیزوں کو ٹھکانے لگانے کے خیال سے اٹھی۔ تخت پر گدا بچھاتے ہوئے اس نے خود سے کہا۔...... ''یہ تین سیر کی کمزوری جان اس کی سختی دور کرنے میں کہاں کامیاب ہوگی۔ اس پر تو مجھے ڈھنگ کی نیند بھی شاید نہ آئے۔''...... تبھی کاسنی قمیص پاجامے میں ایک خوش شکل لڑکی کمرے میں آئی جس نے شستہ اردو میں اسے مشرقی پاکستان آنے پر خوش آمدید کہا۔ اسے انجانی سی خوشی کا احساس ہوا۔ یقیناً یہ زبان کی وجہ تھی۔ وہ کام ادھورا چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کا نام روشن آرا احمد تھا۔ وہ اتر پردیش کی رہنے والی تھی اور اب تقسیم کے بعد سے لال منیر ہاٹ میں قیام پذیر تھی۔ ڈھاکا یونیورسٹی میں ایم۔ اے فائنل کی طالبہ تھی۔

''تم اپنے اس کام سے نپٹ جاؤ، میں تمہارا تعارف ایک اور اُردو اسپیکنگ لڑکی سے کراؤں گی۔''

اور جب وہ چھوٹے سے تاریک غسل خانے میں شاور کے ٹھنڈے پانی سے نہاتے ہوئے لطف اٹھا رہی تھی، اسے یونہی خیال آیا کہ میرے تو وہم و گمان میں بھی کبھی یہ بات نہ آئی ہوگی کہ میں ایک دن یوں ڈھاکا کے اس غسل خانے میں نہاؤں گی۔ زندگی کتنی حسین اور خوبصورت ہے۔ یکا یک کیسے ڈرامائی موڑ مڑتی ہے۔

اس سمے اسے کچھ یاد نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ پانی ٹھنڈا ہے اور اسے نہانے میں لطف آ رہا ہے۔

اور جب باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی وہ اس سے ملنے چوتھی منزل پر جا رہی تھی جس کے متعلق سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے روشن آرا احمد بہت سی باتیں بتا چکی تھیں۔ وہ سفید چادر اوڑھے سو رہی تھی اور کمرے میں ایک بے حد خوبصورت لڑکی ننگے پاؤں ساڑھی کے پلو کو دائیں بائیں گھماتی چائے پکانے کے اہتمام میں اِدھر اُدھر بھاگتی پھر رہی تھی۔

''اُف خدایا! روشن نے لمبا سانس بھرا۔ یہ بیوٹی سلیپ لے رہی ہے۔''

اور سمیعہ علی پر سخت رعب پڑا۔...... ''جانے کتنی خوبصورت ہے؟''......اس نے مرعوب ہو کر سوچا۔

''اب ہزار بار کہا ہے کہ بی بی! یہ بیگموں والے بھاری بھرکم چونچلے کم از کم ہماری اس لاپروا اور لااُبالی سٹوڈنٹ لائف پر ہرگز نہیں جچتے''......اس نے چادر اس پر سے کھینچ دی۔

اور اس بیوٹی سلیپ لینے والی کے چہرے سے جب چادر ہٹی اور اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ مسکرائے بنا نہ رہ سکی تھی...... ''جو یہ کہیں حسین ہوتی تو کیا ہوتا؟''......اس نے چپکے سے اپنے دل میں کہا۔

پر جس غایت دلچسپی اور توجہ سے اس بیوٹی سلیپ لینے والی نے اس سے باتیں کیں، سمعیہ علی بہت متاثر ہوئی۔ اس نے اپنے دل میں سوچا کہ اس نے یقیناً کارنیگی کی How To Win Friends پڑھی ہوگی۔

اس نے ان دونوں کو اس بنگالی گھرانے کے متعلق بھی تفصیلاً بتایا جن کی وہ گزشتہ دنوں مہمان تھی اور انہیں شلپی کے نام پر چونکتے دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئی۔

''ہوں تو اس کا بابا تمہارا لوکل گارجین بنا ہے خوب!''......ان کی مسکراہٹ معنی خیز تھی۔

تب اسے معلوم ہوا کہ وہ کھادی کے کُرتے پاجامے والا آکسفورڈ کا تعلیم یافتہ ایک نامی گرامی قانون دان ہے۔ ایک بڑا سیاست دان بھی ہے۔ ڈھاکا یونیورسٹی کے طلبا پر اس کی مکمل حکومت ہے۔

شام کو وہ تینوں لان میں گھومتی رہیں۔ سلیقے سے ترشی ہوئی گھاس گیلی تھی۔ ننگے پاؤں اس پر چلنے کی وجہ سے پاؤں کی انگلیوں میں کھجلی شروع ہو گئی تھی۔

''کیوں نہ پوکھر کی طرف چلیں؟ اگر کوئی کشتی خالی ملی تو تھوڑی دیر چلائیں گے۔''

جہاں آرا کے کہنے پر وہ آرٹس بلڈنگ کے پیچھے اس بینچ پر جا بیٹھیں جس کے سامنے ایک بڑے تالاب میں لانبے کھلے بالوں اور رنگ برنگی سوتی ساڑھیوں والی سانولی نازک لڑکیاں جھوم جھوم کر ٹیگور کے گیت گاتے ہوئے کشتی رانی کر رہی تھیں۔

ہریالی کی جھلک مارتے پانی پر گہری سبز شپلا کنارے کنارے پھیلی تھی۔ بادل گھرے تھے۔ سامنے یونیورسٹی اساتذہ کے فلیٹوں میں چھوٹے چھوٹے بچے شور مچا رہے تھے۔

تب ہی ان کے درمیان سیاست پر باتیں چھڑ گئیں۔ روشن تلخی سے بولی......''ارے! یہ بنگال تو سیاسی ایجی ٹیشن، اضطراب اور بے چینیوں کا مرقع بن گیا ہے۔ سارا سحر اور خوبصورتی نعروں کی نذر ہو گئی ہے۔ گھر بار لٹا کر اور رشتہ داروں کو کٹوا کر پدما اور بوڑھی گنگا کی اس سرزمین میں جہاں مانجھی گیت گاتے ہیں، ہم کیلوں اور ناریل کے درختوں تلے امن کی تلاش میں آ بیٹھے تھے۔ پر یہ اس حسین سرزمین کو اب ایک خاص قوم اور خاص لوگوں کے لیے مخصوص کر دینا چاہتے ہیں۔ یہاں تو ہر لمحے دل دھڑکتا ہے اور روح کانپتی ہے کہ جانے کب ان چڑھتے دریاؤں میں ہمارا خون شامل ہو جائے۔''

''روشن! سیاسی غلطیاں اور محرومیاں انسان کو بددل اور ایک دوسرے سے متنفر کر دیتی ہیں۔ان کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے''......اس نے دیر بعد سوچ سوچ کر کہا۔

ان کے ساتھ اس تیسری لڑکی نے اس گفتگو میں قطعی حصہ نہ لیا۔بس سکون سے گردن بینچ کی پشت پر رکھے کشتی چلاتی لڑکیوں کو دیکھتی رہی۔

کہیں دُور سے اذان کی آواز سنائی دی، اس نے سر ڈھانپا اور اپنے گھر کو یاد کیا جہاں اس وقت بھابھی اور ماں جی جائے نماز پر کھڑی نماز پڑھ رہی ہوں گی۔

''ارے! میں بھی احمق ہوں۔ایک گھنٹہ پہلے ہی انہیں مصلوں پر کھڑا کر دیا۔''

اُسے وقت کا فرق یاد آ گیا تھا۔گھر کا خیال آتے ہی اس کی طبیعت پھر بے چین سی ہوگئی۔

ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی تھی۔وہاں سے وہ ڈائننگ ہال گئیں۔وسیع اور عظیم الشان ہال جس کی انوکھی طرز تعمیر دیکھ کر اسے بے اختیار گودام گھروں کے اندرونی حصے یاد آئے جو وہ لاہور سے شیخوپورہ جاتے ہوئے راستے میں اکثر دیکھا کرتی تھی۔

ڈائننگ ہال کی لمبی میز کے گرد بیٹھ کر جب اس نے مٹیالے رنگ کے موٹے چاول اپنی پلیٹ میں ڈالے اور انہیں کھانا شروع کیا تو جلد ہی اُسے یہ احساس ہوگیا کہ ان کو کھانا اس کے لیے بہت مشکل ہے، اس نے بہت تھوڑے کھائے۔جہاں آرا ہنستے ہوئے بولی۔''ابھی پہلا دن ہے حلق سے نیچے نہیں اترتے ہوں گے۔پر بہت جلد عادی ہو جاؤ گی۔''

مسور کی پتلی دال پلیٹ میں ڈال کر اس نے پی۔جھک کر ہاتھ کی اوک سے واش بیسن کے پائپ سے پانی پیا اور جب سر اٹھا کر وجود سیدھا کیا تو اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ بھوکی ہے۔

''دن کتنا اُداس ہے؟''......یہ اُس نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

وہ اس وقت اس لمبے کوریڈور کے آخری کونے میں کھڑی باہر دیکھ رہی تھی۔جو اس کے کمرے کے سامنے تھا۔بادل گھرے تھے اور رم جھم کا سلسلہ شروع تھا۔ایسا موسم ہمیشہ سے اس

کی کمزوری تھا۔ پر اب وہ اکتا گئی تھی۔ کئی دنوں سے سورج کی ایک کرن نظر نہ آئی تھی۔ ہوا نم آلود تھی۔ ہر سو سیلن تھی۔ بستر گیلا ہو رہا تھا، یوں جیسے کسی نے اچھی طرح نچوڑ کر بچھا دیا ہو۔ وہ چاہتی تھی کہ تھوڑی دیر کے لیے سورج نکل آئے تاکہ وہ اپنے بستر کو دھوپ لگوا سکے۔ کپڑوں میں برسات کی مخصوص ہمک رچ گئی تھی اور اب ایک اور تغیر اسے اپنے اندر محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بہت سست ہو رہی تھی۔ عجیب طرح کی کاہلی اس پر سوار تھی۔ ہر وقت لیٹے رہنے کو جی چاہتا تھا۔

''شاید یہی وجہ ہے۔'' ......اس نے سوچا...... ''کہ یہاں کے لوگ آرام طلب اور سست ہیں۔ یہ یہاں کی مخصوص آب و ہوا کا اثر ہے۔''

گیٹ پر کھڑے رنگ برنگے لوگ نظر آ رہے تھے۔ اتوار تھا نا۔ یہ سب ملاقاتی تھے۔ لڑکیاں انہیں لیے ریسپشن روم (Reception room) کی طرف جا رہی تھیں اور کچھ ملاقات ختم کر کے باہر نکل رہی تھیں۔ ہال بھی تقریباً خالی تھا۔ لڑکیوں کی اکثریت اپنے اپنے عزیزوں کے ہاں جا چکی تھی اور وہ ہوم سکنس کا شکار ہو رہی تھی۔

''کیسے ہیں یہ محسن چچا کے دوست کرنل قریشی اور میجر آغا! ایک بار بھی معلوم کرنے نہیں آئے کہ لڑکی کیسی اور کس حال میں ہے؟''

یوں ایک گھر اور بھی تھا جہاں چند لوگوں کو شائد اس کا انتظار ہو۔ اِن چھ دنوں میں وہ تینوں بھائی باری باری ہال آ چکے تھے۔ دو بار تو وہ باہر تھی اور تیسری بار اس نے ملازم سے کہا کہ وہ اس کے ملاقاتی سے کہہ دے کہ یہ لڑکی کمرے میں موجود نہیں ہے۔ یوں یہ اور بات تھی کہ اس کا دل ماں سے ملنے کو بہت چاہا تھا۔ پر وہ اس کا سامنا کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھی جس نے نفرت اور تعصب کی آگ میں یہ تک نہ سوچا تھا کہ وہ ان کی مہمان ہے۔

ایک لڑکی تیزی سے باہر بھاگی جا رہی تھی۔ دھپ دھپ کرتی اس کی چپل پیچھے سے ساڑھی پر گُل بوٹے بنا رہی تھی۔

سوا گیارہ ہو رہے تھے۔ وہ کمرے میں آ گئی۔...... ''میں کیا کروں، مجھے سمجھ نہیں آ

رہی''...... وہ خود سے بولی۔ کمرے میں اِدھر اُدھر پھرتی رہی۔ چیزوں کو اُلٹ پلٹ کرتی رہی۔ روشن اور جہاں آراء پر غصہ کھاتی رہی۔...... ''ان کم بختوں کو بھی آج ہی بازار جانا تھا پر وہ تو اسے کہہ رہی تھیں ساتھ چلنے کو اس نے ہی انکار کر دیا۔ اب انہیں تو جانا ہی تھا۔''

تب ہی ملازم نے اس کا نام پکارا۔ وہ باہر آئی اس کے ہاتھ سے چٹ لی، پڑھی۔ ماں اسے لینے کے لیے خود آئی تھیں۔

تب کوریڈور کی دیوار سے پشت ٹکا کر اس نے کچھ سوچا......

جانے اور نہ جانے کے متعلق غور کیا اور بالآخر اس سے بولی۔...... ''تم انہیں بتاؤ کہ میں ابھی آ رہی ہوں۔''

اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سٹول پر بیٹھتے ہوئے اس نے فیصلہ کن آواز میں خود سے کہا تھا۔...... ''وہ مجھے لینے آئی ہیں۔ تو میں ضرور جاؤں گی۔''

ان چھ دنوں میں اس نے روزمرہ استعمال اور ماں سے اتفاقیہ ملاقات پر ان کی جانب سے متوقع شکوے شکایت کے ڈھیر سارے بنگلہ جملے اُردو میں لکھوا کر رٹ لیے تھے۔ یوں وہ نادم بھی تھی کہ وہ کیا خیال کریں گی۔

اور جب وہ ان سے ملی ان کی زبان کے ساتھ ساتھ ان کی آنکھوں نے بھی شکوہ کیا۔ وہ ان کی بنگلہ سمجھی اور قدرے ہچکچاتے ہوئے اس زبان میں بولی...... ''ماں، میں دراصل مصروف تھی۔''

ماں نے حیرت اور خوشی سے اُسے دیکھا اور بولی...... ''تم نے اتنی جلدی بنگلہ بولنی سیکھ لی ہے۔''

یوں جس محبت سے انہوں نے اس کی پیشانی پر پیار کیا تھا، وہ اس سے بہت متاثر ہوئی تھی۔

اور وہ تینوں اُسے دیکھتے ہی خوشی سے چلائے۔ آگے بڑھ کر انہوں نے اسے اپنے گھیرے میں لیا اور اتنے دنوں سے نہ آنے اور نہ ملنے کا گلہ کیا۔

بینو بولا...... ''آپ جان بوجھ کر ہمیں ملنے نہیں آئیں۔''

''نہیں تو بینو!''...... وہ مسکرائی اور بنگلہ میں بولی...... ''بس کام زیادہ تھا اس لیے آنا نہ ہوسکا۔''

بابا اسے دیکھ کر شفقت سے بولے...... ''بیٹے! تم نے شاید شلپی کی باتوں کا برا مانا ہے۔''

''نہیں بابا! یونہی نہیں آسکی ورنہ جی تو میرا بھی بہت چاہا تھا''...... وہ بہت خجل ہو رہی تھی اور مصروفیت کی آڑ لے کر بار بار معذرت کر رہی تھی۔

ویسے وہ سب اس کی بنگلہ سیکھنے کی اتنی تیز رفتار سے بہت خوش ہوئے تھے۔ وہ بھی خاصی مسرور تھی، ایک دم گھریلو ماحول میں جو آگئی تھی۔

اس نے جم کر تاش کھیلی...... بلبل اور بینو کو ہرایا۔ ریکارڈ پلیئر پر سینہ یاسمین، بشیر احمد اور فاروق احمد خوندکر کے گانے سنے، مزیدار کھانا کھایا۔

اور شام کی چائے پیتے ہوئے بلبل اس سے پوچھ رہا تھا۔

''سومی آپا! میں قطعی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ مصروفیات نے آپ کو ہمارے گھر آنے سے روکے رکھا۔''

اور تھوڑے سے پس و پیش کے بعد اس نے انہیں بتا دیا کہ وہ ان کے گھر چاہتے ہوئے بھی نہیں آنا چاہ رہی تھی کیونکہ اسے ان کے بڑے بھائی کی باتیں سن کر بہت تکلیف ہوئی تھی۔

''سومی آپا!''...... فخر بشاشت سے ہنسا...... ''آپ تو یونہی ناراض ہوگئیں۔ پر کیا یہ، حقیقت نہیں کہ آپ حکمران طبقے سے آئی ہیں؟''

اس نے رنج سے اسے دیکھا اور شکستہ آواز میں بولی...... ''میرا خیال ہے کہ میری پیشانی پر ایسی کوئی تحریر نہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ میں کسی بورژوا خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ تم لوگوں کو یقیناً نذرل چچا نے ہمارے متعلق بہت کچھ لکھا ہوگا۔''

''میرا مطلب آپ کو آزار پہنچانا نہیں ہے لیکن اس کا اعتراف آپ کو بھی کرنا ہوگا کہ

ہمیں آپ کی قوم سے تلخ تجربات مل رہے ہیں۔''

''فخر! غلط فہمیاں نفرت کو جنم دیتی ہیں۔ حقائق پر جب جذبات غالب آ جائیں تب ایک انسان کے دماغ میں اٹھتی نفرت کی لہر پوری قوم کو متاثر کرتی ہے۔''......اس نے بلبلا کر کسی قدر تند لہجے میں کہا......

''ارے سومی آپا! بائیس (22) سالوں نے ہمیں کیا دیا؟ اقتصادی بدحالی۔ اب ذرا دیکھیے 1947ء سے 1964ء تک ہماری پٹ سن نے پاکستان کو ستر فیصد زرمبادلہ دیا لیکن ہمارے صوبے پر ترقیاتی خرچ صرف پندرہ تا بیس فیصد تھا۔ انڈسٹری اور کارخانے لگانے کی حوصلہ افزائی صرف ویسٹ پاکستان میں ہوئی۔ پوربو پاکستان حکمران کی ترجیح نہیں تھا۔ پاکستان سے پہلے کلکتہ کی منڈی تھے اب ویسٹ پاکستان کی ہیں۔

ہماری سیاسی محرومیاں دیکھ لیں۔ اول تو صحیح معنوں میں نمائندگی ہی نہیں ملی، اگر شومئ قسمت ہمارے لیڈر برسرِ اقتدار آ ہی گئے تو ان کے ساتھ کیا ہوا؟ خواجہ ناظم الدین، محمد علی بوگرہ، پاکستان کا زیرک ترین اور مدبر سیاستدان شہید سہروردی جس سے نہرو بھی خائف تھا، بیروت میں زہریلی گیس سے مروا دیا گیا کیونکہ وہ وطن واپس آ کر ایوب خان کے خلاف تحریک چلانے والے تھے۔ آپ کے حکمران ٹولے، فوج اور نوکر شاہی نے پاکستان کے سینئر ترین جنرل آئی مجید کو عراق کے شاہ فیصل ثانی کو قتل کرنے کی سازش میں ملوث کر کے کمانڈر انچیف کے حق سے محروم کر دیا کیونکہ وہ بنگالی تھا اور اس ایوب خان سے کوئی پوچھتا کہ اس نے مولوی تمیز الدین کے ہوتے ہوئے اقتدار یحییٰ خان کو کیوں سونپا؟ یحییٰ خان کی شہرت آپ اپنے چچاؤں سے پوچھ سکتی ہیں۔

سچی بات ہے سومی آپا! آپ کی بیوروکریسی صرف یہاں ہم پر حکومت کرنے آتی ہے، نہ انہیں ہمارے مسائل سے ہمدردی ہے، نہ کوئی دلچسپی۔ نہ وہ ہماری زبان جانتے ہیں اور نہ ہی جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کالے صاحب ہیں جنہوں نے گورے صاحبوں کی جگہ لے لی

ہے۔ کاش! اگر کہیں جنرل اعظم خان جیسے لوگ آ جاتے تو شاید اس حصے کی تقدیر بدل جاتی۔ کیسا گورنر تھا۔ ہر مشکل گھڑی میں بنگالیوں کے ساتھ۔ سیلابوں میں ان کے ہمراہ کیچڑ میں دھنسا ہوا ٹوٹی پھوٹی سڑکوں پر ٹوٹی پھوٹی گاڑیوں میں سفر کرتا ہوا۔ ہر جگہ موجود، ہر دل میں بستا ہوا، ہمہ وقت ہمیں ہمت اور حوصلہ دیتا ہوا۔ آپ کے حاکم تو اس کی ہر دلعزیزی کو بھی نہ برداشت کر سکے۔''

وہ دم سادھے بیٹھی تھی، یوں جیسے سانس کو اس کے وجود سے کشید کر لیا گیا ہو۔ بُلبل رواں انگریزی میں واقعات کے بخیئے اُدھیڑ اُدھیڑ کر دھجیوں کے یوں ڈھیر لگائے جا رہا تھا کہ رفوگری کے سلسلے میں کوئی بات کہنی اسے سنگین مذاق کے برابر محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں شکستگی اور نا اُمیدی کی لہریں موجزن تھیں۔ دیر تک اس سے کچھ بولا ہی نہ گیا اور جب بولی تو مارے خفت کے یہی کہہ سکی...... ''چلو چھوڑو! میں اس جھمیلے میں نہیں اُلجھنا چاہتی۔''

''آپ ایک جاہل لڑکی نہیں۔ ملک جس دور سے گزر رہا ہے اس کے تمام تر حالات سے آپ کو مکمل واقفیت اور آگہی ہونی چاہیے۔ آخر آپ اس معاشرے کی اہم کڑی ہیں اور یہ جھمیلے میں الجھنے والی بات بھی درست نہیں۔ ہم نہیں اُلجھیں گے تو پھر اُلجھے گا کون؟''

یہ بینو کہہ رہا تھا۔ چودہ پندرہ سالہ بینو...... ''اللہ! اس قوم کے بچوں کا سیاسی شعور کتنا بیدار ہے۔''...... وہ دنگ رہ گئی تھی۔

مزید بحث کا دروازہ اس نے فوراً بند کر دیا۔ وہ فضا کو مکدر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

وہ بہت غصے میں تھا اور اپنے اس چھوٹے بھائی پر پیچ و تاب کھا رہا تھا جو اس کے قریب ہی مسکین سی صورت بنائے کھڑا تھا۔

''اب تمہیں کیسے سمجھایا جائے کہ آخر اتنا قیمتی کپڑا منگوانے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ پیسے کا ضیاع نہیں تو اور کیا ہے؟ ابھی تم دسویں درجے میں ہو پر تمہارا دماغ آسمان پر پہنچ گیا ہے۔ یہی پیسہ کسی غریب کے کام بھی تو آ سکتا تھا۔ باہر لوگ بھوکے مر رہے ہیں اور انہیں ٹیٹرون پہننے سے فرصت نہیں۔''

اور بینو اپنے دل میں بہت افسوس کر رہا تھا کہ ناحق اس نے ترنگ میں آ کر پینٹ کا یہ کپڑا اسے دکھایا جو اس نے حال ہی میں اپنے ایک دوست کے بھائی سے لنڈی کوتل سے منگوایا تھا۔

ماں دوسرے کمرے میں بابا کے جوتوں پر پالش کر رہی تھیں۔ اپنے بڑے بیٹے کی یہ چیخ چیخ سن کر وہ اس کے پاس آئیں اور بولیں...... ''شبلی! یہ تم ہر وقت میرا جی نہ جلایا کرو۔ کیا چاہتے ہو تم کہ یہ کپڑے بھی اتار کر تمہارے غریبوں کو دے دیں؟ تمہاری اتنی ڈھیر ساری کمائی

جوان پر خرچ ہو رہی ہے کیا کافی نہیں یا ہمیں ابھی اور قربانیاں دینے کی ضرورت ہے؟ گھر میں کوئی اچھی چیز آئی اور تمہارا لیکچر شروع ہوا۔ میں پوچھتی ہوں ان بڑے بڑے امیر لوگوں کو ان کا درد کیوں نہیں؟ یا درد کا یہ سارا ٹھیکہ انہوں نے تم سے کر لیا ہے۔ کبھی گھر کے حالات کو بھی دیکھا ہے؟ کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ اپنا ایک مکان بھی نہیں ہے۔ باپ کی کل ملازمت ختم ہو جائے گی تو رہنا چل کر جھونپڑیوں میں۔''

''ماں!''......اس نے بولنا چاہا پر انہوں نے فوراً اس کی بات کاٹ دی۔......''ملک پس ماندہ ہے، جنتا غریب ہے۔ ارے! میں کہتی ہوں کہ یہ ملک ترقی کیسے کرے گا؟ اس جنتا کی حالت کیسے بدلے گی؟ جب کہ اس قوم نے کام ہی نہیں کرنا، بھوکوں مرنے لگیں گے تو کام کریں گے اور جب دو پیسے جیب میں آجائیں گے تو آرام سے بیٹھ کر انہیں ختم کرنے کا سوچیں گے۔''

اس نے ماں سے تکرار فضول سمجھی اور نیچے آ گیا۔......''کہتی ہیں کام نہیں کرتے، یہ انسانوں کو گھسیٹتے، پتھر کوٹتے، بوجھ اٹھاتے اور محنت مزدوری کرتے کیا انہیں نظر نہیں آتے؟ چند سال کوچ بہار میں کیا رہ آئیں۔ بس وہاں کے قصیدے ہی نہیں ختم ہوتے۔ زندگی گزر گئی پر انہیں پوربو بنگال کے مسائل سے ہمدردی نہ ہوئی۔ جب بات کریں گی تو وہی کوچ بہار، وہاں کے لوگ اتنے جفاکش، اتنے محنتی، یہ نہیں سوچتیں کہ ان کے پیٹ خالی ہیں۔ ان کی آنکھیں ویران ہیں اور یہ زندگی سے اکتائے ہوئے ہیں۔''

پارٹی کے مقامی دفتر کے سامنے اس نے گاڑی روکی۔ اس کے وجود کے ساتھ اگر کوئی قیمتی چیز نظر آتی تھی تو وہ کار تھی۔ اگر اس کے چہرے پر علمیت اور آنکھوں میں غیر معمولی ذہانت کی چمک نظر نہ آتی تو اس کا غیر معمولی سادہ لباس دیکھنے والوں کو ضرور اس گاڑی کے شوفر کا تاثر دیتا۔

یہ کمرہ جس میں وہ اس وقت داخل ہوا تھا۔ ریلیف فنڈ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ چند لوگ بنڈلوں کی پیکنگ میں مصروف تھے اور کچھ کھانے پینے کی اشیاء کو بوریوں میں ڈال رہے تھے۔

اس نے تنقیدی جائزہ لیا اور دیوار پر چسپاں بڑے چارٹوں کی طرف متوجہ ہوا۔ نیلی اور سرخ لکیروں کو دیکھتا رہا۔ تب پلٹا اور میز پر پڑے شیشے پر سفید پینسل سے کچھ لکھنے لگا۔ فون کی گھنٹی بجی اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا، اس کی کشادہ پیشانی پر شکنیں پیدا ہوئیں، لہجہ تند ہوا اور جب اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخا تو وہ دھاڑا۔

''ابومنصور! میرے پاس راجشاہی بھیجے جانے والے سامان کی لسٹ لاؤ۔''...... ڈبلا پتلا ابومنصور فائل اٹھا لایا...... ''یہ ہم نے ڈھائی سو بوری دھان میتا پکور اور ڈملا کے لیے بھیجا تھا، نندالالی کے لیے نہیں جہاں کبیر کے رشتہ دار رہتے ہیں۔''

''ابوسعید!''......اس نے اپنے جنرل سیکرٹری کو آواز دی۔

''کبیر کو چٹھی لکھو اور اس سے تفصیل مانگو کہ اس نے سامان کی تقسیم کیسے کی ہے اور وہاں اس کی تحقیق کرو۔''

''ابومنصور! آدم جی والوں سے مزید پیسہ مانگو۔ کپڑوں کا یہ بنڈل مہیش پور شمکور بھیج دو، علاقے کی حالت خراب ہے۔''

اب وہ دوسرے کمرے میں آیا۔ یہاں چٹائی پر بیٹھے وہ سب ستار اور طبلے پر ٹیگور سنگیت کی سریں نکال رہے تھے۔ یہ سب ڈھاکا یونیورسٹی کے طلبہ تھے۔

''کہو! ناٹک کی تیاری کیسی ہے؟''......وہ ان کے پاس بیٹھ گیا۔ ان کے جواب پر اس نے مزید کہا......''میں سوچتا ہوں ہم ٹی۔ ایس۔ سی کی بجائے بنگلہ اکیڈمی کی کھلی گراؤنڈ میں یہ پروگرام پیش کریں تاکہ پبلک بھی اسے دیکھ سکے۔''

''خیال اچھا ہے پر انتظامی نقطہ نظر سے بہت سی تکالیف ہوں گی۔'' ان میں سے چند ایک نے کہا۔

''صرف سٹیج سیٹ کرنی پڑے گی۔ لوگ گھاس پر بیٹھیں۔ اب ہمارے پاس اتنا پیسہ تو ہے نہیں کہ ایسے فضول ضائع کرتے پھریں۔'' عبدالرب بولا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو عبدالرب!'' ......اس نے کہا اور ان پوسٹروں کی طرف متوجہ ہوا جو آج ہی بن کر آئے تھے۔

''بھئی! یہ کیسے بنا ڈالے ہیں؟ ان آنکھوں میں وہ عزم نہیں جو آہنی زنجیریں توڑنے کی ہمت رکھتا ہے۔ واپس بھجوا دو انہیں۔''

باہر تیز ہوا کے ساتھ بارش شروع ہو گئی تھی۔ پوربو بنگال ان دنوں پانی میں ڈوبا ہے، خلیج بنگال کی مون سون چھاجوں پانی برسا رہی ہیں پر اس ڈھاکا یونیورسٹی کی ثقافتی سرگرمیوں پر بے موسم بہار آئی ہوئی ہے۔ طلبا کی سیاسی پارٹیاں رنگا رنگ پروگراموں سے نئے طلبا کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔

''یہ رجحان صحت مند ہے اور قوم کے لیے سیاسی بیداری کی علامت پر ان ہنگاموں میں پیسے کا ضیاع کسی طور بھی مفید نہیں۔ دنیا کے اس غریب ترین ملک کے لوگوں کو پلاننگ (Planning) سے کوئی سروکار نہیں۔'' وہ یہ سب چٹائی پر بیٹھا سوچ رہا تھا۔

محسن ہال میں آج سہ پہر ہونے والے جھگڑے کے متعلق کوئی بات کر رہا تھا۔ اس نے سنا اور قدرے زور سے بولا۔

''اس این۔ ایس۔ ایف کی بے ہوشی ابھی ٹوٹی نہیں؟ اب تو منعم خان کی کرسی کی ایک ٹانگ بھی سلامت نہیں۔''

داہنی طرف چار لڑکوں کا ایک گروپ اشتہاروں کو مختلف ہالوں کی دیواروں اور اندرونی حصوں میں لگانے کے بارے میں اونچے اونچے باتیں کر رہا تھا ''رقیہ ہال، رقیہ ہال'' ہوا تو اسے پچھمی پاکستان کا مہمان یاد آ گیا جو رقیہ ہال سکونت پذیر ہو گیا تھا۔

ماں نے دل سوز لہجے میں اس دن اس سے کہا تھا۔

''ہم مسلمان ہیں اور مہمان کی دل آزاری گناہ سمجھتے ہیں پر شلپی! تمہارے یہ طور طریقے تو کافروں سے بھی بدتر ہیں۔ کوئی ہزار میل دور سے آئی معصوم سی لڑکی کو یوں بھی طعنے مارتا ہے؟''

اس نے حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔ یہ ماں کو کیسے معلوم ہوا؟ اس نے تو انگریزی میں بات کی تھی۔ سؤر بلبل نے بتایا ہوگا۔

اس نے صفائی پیش کی پر ماں ناراض ہی رہیں۔

''نہیں شبلی! تم جن لچھنوں میں پڑ گئے ہو، انہوں نے تمہیں تنگ نظر بنا دیا ہے اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار تم سے چھین لی ہیں۔''

ابو منصور شاید کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ چونکا۔ اس کی بات کا جواب دینے کے بعد اس نے اپنے دل میں کہا تھا۔...... ''ماں غلط سوچتی ہیں، اسے تکلیف پہنچانا ہرگز میرا مقصد نہ تھا۔''

اس نے سر جھٹکا اور رقیہ ہال میں پارٹی کی استقامت کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔

''میں ڈولی کے کام سے مطمئن نہیں۔ وہ کنویسنگ کے لیے مقامی میڈیکل کالج جاتی ہے اور دس (10) روپے کا بل بنا کر بھیج دیتی ہے۔ عبدالرب! اسے سمجھاؤ کہ بنگلہ قوم کے لیے ایثار کی ضرورت ہے۔''

اس نے آڈیٹوریم کے وسیع چکنے فرش پر پورا ڈیڑھ گھنٹہ اسکیٹنگ کی تھی اور اب تھک کر لان میں آ بیٹھی تھی۔ ہری ہری تنکوں والی گھاس پر لیٹ جانے کو جی چاہنے لگا۔ پر اسے ہال کی پر دوست سے بہت ڈر لگتا تھا۔

بوڑھا ڈرل ماسٹر اسے یوں بیٹھے دیکھ کر ہنسا اور بولا...... ''آج جلدی ہمت ہار دی کیوں؟ تھوڑی دیر اور کرونا'' ......وہ بس مسکرائی اور جواباً کچھ نہ بولی۔

یہ ڈرل ماسٹر اسے بہت پسند تھا۔ جتنا وقت وہ سکیٹنگ کرتی وہ اس کے آگے پیچھے بھاگتا پھرتا اور کسی دن جو ناغہ کر جاتی تو اگلے دن بہت محبت سے نہ آنے کی وجہ پوچھنا نہ بھولتا۔ جو وہ یہ کہہ بیٹھتی کہ طبیعت خراب تھی تو فکر مند ہو کر کہتا...... ''تم نے دوائی لی تھی؟ فائدہ ہوا، اب کیسا جی ہے؟''

یہ ایک مخلص اور بے لوث محبت کرنے والا انسان ان سینکڑوں لوگوں کی طرح ہے جو اَن پڑھ اور جاہل کہلاتے ہیں۔ پر جو انسان سے پیار کرنا عبادت سمجھتے ہیں۔ وہ ایسے کتنے لوگوں سے ملی اور بارہا اس کا جی چاہا کہ وہ ان سے پوچھے کہ تمہارے ذہن اس زہریلے پروپیگنڈے سے

کیوں ملوث نہیں جو تمہارے علم کی روشنی رکھنے والے بھائی بند تیزی سے پھیلا رہے ہیں۔

ذکیہ اور ربیہ باہر سے آ رہی تھیں۔ اس کے پاس آن کر رکیں اور بولیں: ''آج بنگلہ اکیڈمی میں ہماری پارٹی اپنا پروگرام پیش کر رہی ہے، چلو گی نا؟'' وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ دونوں کا تعلق کس پارٹی سے ہے۔ معذرت کرتے ہوئے بولی...... ''مجھے افسوس ہے ذکیہ! میں نہ جاسکوں گی۔ چار دن ہو گئے ہیں کتابیں ایشو کروائے ہوئے پر ابھی تک نوٹس نہیں بنا سکی ہوں۔''

انہوں نے تین چار بار اصرار کیا پر وہ بہت شائستگی سے ٹال گئی۔ اس کے انکار پر وہ بد دل ہوئیں اور خاموشی سے آگے بڑھ گئیں۔

اسے بھی افسوس ہوا پر وہ خود سے بولی...... ''اب کیا کروں تمہاری پارٹی کا کام تو میرے لیے سمجھا سمجھایا ہے۔ جان ہی جلے گی نا میری وہاں جا کر۔ یوں تم دونوں اچھی لڑکیاں ہو اور تمہاری دل شکنی سے مجھے بھی تکلیف ہوئی ہے۔ پر یہ نظریاتی اختلاف جو بیچ میں آن کھڑا ہوا ہے، یوں بھی اچھے بھلے راستے کو چھوڑ کر تم لوگوں نے ٹیڑھی سمت چلنا شروع کر دیا ہے۔ اب اسے میری بزدلی کہہ لو یا کچھ اور کہ مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں کہ حقائق کا سامنا کھلی آنکھوں کے ساتھ کروں۔ یوں سیدھی سی بات یہ ہے کہ اس کی ہمیں کسی نے تربیت بھی نہیں دی۔ ہم نے تو ایک بات سیکھی ہے کہ مسائل الجھتے ہیں تو الجھیں، وہ گھمبیر ہوتے ہیں تو ہوں، انہیں سلجھانے کی قطعی ضرورت نہیں۔''

''اے اللہ! اس ملک کا مستقبل کیا ہوگا؟''......اس نے کینٹین کی طرف جاتے ہوئے گہری اداسی سے یہ سب سوچا۔

سنگھاڑے (سموسے) گرم اور خوب مزیدار تھے۔ اس نے دو کی بجائے چار کھائے۔ ایک شندیش کھایا، کنڈنس مِلک سے بنی چائے کا کپ اٹھایا ہی تھا جب وہ لمبی تڑنگی کینیا کی آغا خانی تاج اپنے بڑے بڑے دیدوں کو گھماتی اس کے پاس آ کر بولی۔

''تُم اِدھر میں چا پیتا ہے، اُدھر گیٹ پر تُمھارا وزیٹر لمبی کار کے ساتھ ویٹ کرتا ہے۔''

وہ چائے کا کپ چھوڑ کر بھاگی...... ''میرا وزیٹر؟''...... ''اس نے سوچا کہ کہیں بابا نہ ہوں، ارے! شاید میجر آغا یا کرنل قریشی ہوں''......اور گیٹ تک پہنچتے پہنچتے اسے یقین ہو چکا تھا کہ اس کے چچا کے دوستوں میں سے کوئی ایک ہے۔

اس نے بہت حیرت سے اس لمبی چمکتی سیاہ سٹاف کار کو دیکھا تھا جو رقیہ ہال کے گیٹ کے سامنے بہت آن بان سے کھڑی تھی۔ اس نوجوان کی شان بھی سٹاف کار ہی کی طرح نرالی تھی جو اس کے پاس کھڑا دل کش انداز میں سگریٹ پی رہا تھا۔

''یہ کون ہے اور مجھ سے کس لیے ملنے آیا ہے؟''......اس نے خود سے کہا اور جھجکتے ہوئے آگے بڑھی۔

''اسے اوپر سے نیچے تک تفصیلی دیکھنے کے بعد پوچھا گیا کہ وہ سمعیہ علی ہے اور کرنل محسن کی بھتیجی ہے؟''

یہ کیپٹن نواز تھا۔ گھر والوں نے چند چیزیں اس کے ہاتھ بھیجی تھیں۔ اس نے وہ چیزیں اسے دیں اور ساتھ ہی ایک عدد دعوت نامہ بھی تھما دیا۔ ڈھاکہ آفیسرز میس میں کمانڈر انچیف کے اعزاز میں عشائیہ تھا اور وہ اس میں شرکت کے لیے اسے پُرزور تاکید کر رہا تھا۔

اس نے دعوت نامہ الٹ پلٹ کر دیکھا اور جب وہ پروگرام پڑھ رہی تھی، وہ بولا...... ''شہر کی اہم شخصیات شرکت کر رہی ہیں۔''

تب اس نے بے نیازی سے وہ کارڈ اسے واپس پکڑاتے ہوئے کہا...... ''مجھے کمانڈر انچیف کو دیکھنے کا قطعی شوق نہیں اور نہ ہی مجھے وی آئی پیز سے کوئی دلچسپی ہے، آپ نے زحمت کی...... شکریہ!''

اس نے باسکٹ اٹھائی اور بغیر اس کی طرف دیکھے گیٹ میں داخل ہوگئی۔

جونہی کے بوٹوں کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے کہا تھا۔ لو۔ میرے دماغ میں کیا پھوڑا نکلا ہے جو میں ڈنر کے لیے میس بھاگی پھروں۔ وہاں وہ میری پھوپھیوں اور

خالاؤں کی واقف بیگمات جو سکینڈلز اسپیشلسٹ ہیں۔ اپنی مصنوئی پلکیں جھپکا جھپکا کر مجھے حیرت سے دیکھیں گی اور پھر ایک دن یہ سننے میں آئے گا، اے! وہ ان کی بھانجی بھتیجی ارے ہاں! وہ ڈھاکا میں کیپٹن میجر چھوکروں کے ساتھ گھومتی پھرتی تھی۔ اپنے گھر والوں پر اسے غصہ آیا، بھلا اس کے ہاتھ چیزیں بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔

اور بھورے بالوں والے اس کپتان نے جب اپنے جنرل کی سٹاف کار جناح ایونیو جانے کے لیے رمنا ریس کورس روڈ پر موڑی تو اس نے اپنے آپ سے سوال کیا تھا...... ''کیا بات ہے! اس نے میرا قطعی نوٹس نہیں لیا۔ میں جو اتنا گیلنٹ اور ڈیشنگ نوجوان ہوں۔''

آج ہال میں امپرووڈ ڈائٹ (Improved diet) دی جارہی تھی۔ لڑکیوں نے سرِ شام ہی ڈائننگ ہال کے گرد گھومنا شروع کر دیا تھا۔

''یہ آج تم چھپتی پھر رہی ہو؟''...... جہاں آرا چلائی۔

''میں سمجھی نہیں۔''......اس نے حیرت سے کہا۔

''نہایت کُند ذہن ہو۔ ارے بھئی! تمہارے لوکل گارجین کے بیٹے کی پارٹی آج بنگلہ اکیڈمی میں بہترین پروگرام پیش کر رہی ہے اور تم نے ہمیں مدعو ہی نہیں کیا؟''

''شرم کرو کچھ''......وہ تلخی سے بولی۔

''کیوں کس خوشی میں؟''......اس نے قہقہہ لگایا...... ''ہاں تو چل رہی ہونا؟''

''نہیں بھئی!''

''بس! چار دن میں ہی ڈھیر ہوگئیں؟ ہمیں دیکھو کس دل گردے سے یہاں رہ رہے ہیں۔''......روشن مسکرائی۔

''یہ حوصلہ تمہیں ہی مبارک ہو۔ یہاں تو دل وجگر پھٹنے لگتے ہیں''......وہ دکھ سے بولی۔

''تم اپنے جگر کو سلامت رکھو اور دیکھو! لڑکیاں دھڑا دھڑ اندر جارہی ہیں۔ چلو! ورنہ رانیں وانیں سب ختم ہو جائیں گی۔''...... جہاں آرا نے اسے ڈائننگ ہال کی طرف ہلکا سا دھکا دیا تھا۔

کھانے میں بریانی، مرغ، تلی ہوئی مچھلی، میٹھا دہی اور پان تھے۔ لڑکیاں جلدی جلدی کھا پی کر بنگلہ اکیڈمی بھاگی جارہی تھیں اور وہ کامن روم کے سامنے تذبذب کے عالم میں کھڑی تھی۔

''نہیں بھئی! تم مجھے چھوڑ ہی جاؤ۔ ذکیہ اور ریبا کو بھی میں نے انکار کر دیا تھا، وہاں مجھے دیکھ کر وہ یقیناً محسوس کریں گی۔''......اس نے پختہ ارادے سے کہا۔

''کیا بری عادت ہے تمہاری۔''...... جہاں آرا جل کر بولی۔......''یہ محسوس کرے گا، وہ خیال کرے گا، اب اتنی بھی کمزور شخصیت کیا؟ ہمہ وقت تمہیں لوگوں کے محسوسات کی ہی پڑی رہتی ہے۔''

پر ان سب باتوں کے باوجود وہ نہ گئی اور ان کے جانے کے بعد یوں ہوا کہ بلبل اور بینو اسے لینے کے لیے آ گئے اور انہوں نے اس کی ایک نہ چلنے دی، ساتھ ہی لے کر ٹلے۔

اور ریس کورس روڈ کے کھمبوں کی زرد زرد روشنی میں ان دونوں بھائیوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس نے سوچا......اب اگر ان سے میرا ٹکراؤ ہو گیا تو میری جان کو ہی آئیں گی نہ وہ۔ میں یہاں آ کر بہت بدلتی جارہی ہوں۔ وہ ساری ضدیں اور طنطنہ ماں جی کے ساتھ ہی تھا۔

بنگلہ اکیڈمی میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی، بے شمار گاڑیاں سڑک رو کے کھڑی تھیں۔ اس سے پہلے اس نے جناح ہال، سر سلیم اللہ اور سر جگن ناتھ ہال کے پروگرام دیکھے تھے۔ پر ایسا رش کہیں نہ تھا۔ گزرنے کے لیے راستہ ہی نہ مل رہا تھا۔

اور پھر یوں ہوا کہ عورتوں اور مردوں کا ایسا ریلا آیا جس نے اسے ان دونوں بھائیوں سے جدا کر دیا، اتنے بڑے ہجوم میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ بدقت وہاں سے نکلی، چوروں کی طرح اردگرد کا جائزہ لیتی ہجوم میں گھستی گھساتی وہ سٹیج کے بالکل پاس پہنچ گئی۔

تب گھاس پر چوکڑی مار کر بیٹھتے ہوئے اس نے دائیں بائیں دیکھا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ یاجوج ماجوج کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔

''اے اللہ! اب کس زبان سے تیرا شکر ادا کروں۔ توبہ! کتنی خفت ہوتی اور جو میں انہیں

بتاتی کہ وہ بینواور بلبل نے مجبور کیا تھا تب تو اور بھی شامت آتی۔"

نوعمر لڑکے پمفلٹ بانٹتے پھر رہے تھے۔ جو لڑکا آتا اسے دینا نہ بھولتا۔ وہ بھی دھن و باد (شکریہ) کہتے ہوئے مسکراتی اور اسے پکڑ لیتی۔ ڈھیر سارے جمع ہو گئے تھے اور جب ایک اور لڑکے نے اسے کتابچہ دیا تو جھلاتے ہوئے اس نے کہا..... "اے! بس اب کیا یہی بانٹتے رہو گے یا کچھ دکھاؤ گے بھی؟" اتنی دیر ہو گئی تھی۔ اور سٹیج کا پردہ اٹھنے کا نام نہ لے رہا تھا۔

وہ مبہوت رہ گئی۔ پردہ تیزی سے ایک طرف ہوا، گہرے نیلے آسمان اور سرمئی پہاڑوں کے پس منظر میں کھلے بالوں والی ٹخنوں تک ساڑھی پہنے ایک خوبصورت لڑکی اکارڈین پیانو بجا رہی تھی۔

ڈرامہ شروع ہوا۔ پدما کے سیلاب اور اس کی تباہ کاریوں سے متاثر پوربو بنگال کے باسیوں کی داستان جس انداز میں پیش کی گئی دیکھ کر اس کے آنسو بہہ نکلے۔ جاگیرداروں، نوابوں اور اجارہ داروں کے خلاف اس ڈرامہ میں ڈرامہ پروڈکشن کی ساری جدید تکنیک استعمال کی گئیں۔ بیلے رقص کے بعد بہت سی تقاریر ہوئیں اور اسے اچھی بنگالی نہ جاننے کا بہت دکھ ہوا۔

یہ دکھی لوگ ہیں جو صدیوں سے دکھ سہتے چلے آئے ہیں۔ انہیں ہندوؤں اور انگریزوں نے جی بھر کر لوٹا۔ انہیں اپنوں نے بھی بہت دکھ دیے۔

وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ پر وہ حیران تھی، ماں کا لیڈر بیٹا اسے کہیں نظر نہ آیا تھا۔

"کچھ سمجھ نہیں آتا کہ میں اسے کیا نام دوں۔ میں یہ کہوں کہ قومی جذبۂ اتحاد کی یہ ایک عظیم مثال ہے یا یہ سمجھوں کہ آج کے سائنسی دور میں یہ قطعی احمقانہ حرکت ہے؟"

وہ بے حد حیران تھی۔ گزشتہ تین ماہ کے دوران چوتھی بار ایسا ہوا تھا۔ ہنستا بستا شہر دفعتاً اجڑ جاتا ہے، زندگی کے ہنگاموں سے پُر سڑکوں، بازاروں پر قبرستان کا گمان پڑتا ہے۔ رواں دواں زندگی میں ایسا تعطل نظر نہیں آتا ہے جو انسان کو خوف زدہ کرنے کے لیے کافی ہے۔

یہ اتنا بڑا لیڈر جو آئے دن سٹرائیک کال کرتا ہے، نرا کاٹھ کا الو ہے! اسے کوئی نہیں سمجھاتا کہ روز روز کی یہ ہڑتالیں قومی معیشت پر بُرا اثر ڈالتی ہیں اور یوں بھی یہ روز روز بھونڈا طریق مقصد کو مؤثر کب رہنے دیتا ہے؟ ان سائیکل رکشاؤں والوں کا بھی کوئی نہیں سوچتا۔ جنہیں شام کا دال بھات سارے دن کی مشقت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ کہاں سے کھائیں گے یہ جو کام نہیں کریں گے۔

وہ سخت جلی بھنی کوریڈور میں چکر کاٹ رہی تھی۔ رات اس نے کامن روم میں سنا ضرور تھا کہ کل سٹرائیک ہے پر اس نے دھیان ہی نہیں دیا، وہ ان باتوں کی اب عادی ہوتی جا رہی تھی۔

یوں اگر مجھے اس شُدنی کا پتہ ہوتا تو میں رات ہی عظیم پور نہ چلی جاتی۔ ماں ہسپتال میں بیمار پڑی ہیں۔ ان کا گردے کا اپریشن ہے۔ گھر کی نوکرانی باڑی چلی گئی ہے، اس کی جوان بہن مر گئی ہے۔

شام کو جب بینو اس سے ملنے آیا تو ساری باتیں بتا گیا تھا۔ وہ بہت بگڑی تھی اس پر کہ ماں کی بیماری کی اطلاع انہوں نے اسے فوراً کیوں نہ کی اور جواب میں وہ بولا تھا...... ''سومی آپا! تکلیف یک دم شدت پکڑ گئی تھی۔ ایسے میں انہیں ہسپتال پہنچانے کی جلدی میں لگ گئے تو آپ کو اطلاع نہ کی جا سکی۔''

''اب میں کیسے جاؤں؟ اس نے پاؤں فرش پر پٹخے، اے اللہ انہیں ہدایت دے'' وہ کڑھی۔

عظیم پور ہال سے ایک میل سے کم ہی تھا۔ وہ پیدل ہی چل دیتی پر مصیبت تو یہ تھی کہ یہاں لڑکیوں کا پیدل چلنا معیوب سمجھا جاتا تھا...... ''بھاڑ میں جائے یہ سب'' ...... وہ خود سے بولی۔ اس نے چار دن ہال سے باہر رہنے کی درخواست لکھی۔ بابا کے دستخط خود کیے اور عرضی سُپر آپا کو تھما کر اطمینان سے گھر کی طرف پیدل ہی چل دی۔

بینو اور بلبل باورچی خانے میں گھسے بیٹھے تھے۔ برآمدے میں پڑی کھانے کی میز پر مکھیاں بھن بھن کر رہی تھیں۔ برآمدہ سخت گندا ہو رہا تھا۔

''ارے سومی آپا! آپ کیسے آئیں؟'' بلبل نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''کیسے آتی بھئی! اپنی ٹانگوں پر چل کر آئی ہوں'' ...... وہ بولی۔

سارے برتن باورچی خانے میں اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے اور وہ دونوں چولہے پر پتیلی چڑھائے جانے کیا پکا رہے تھے۔

''یہ گھر میں اتنا گند پھیلا ہوا ہے اور پکا کیا رہے ہو؟ تم لوگ بہت نامعقول ہو، بھلا مجھے کیوں نہ اطلاع دی؟'' وہ ان پر گرم ہوئی تو دونوں مسکرائے اور بولے...... ''سومی آپا! ہم نے

سوچا تھا کہ آپ کو جا کر ہال سے لے کر آئیں پر فخر نے روک دیا کہ وہ کام کاج کی عادی نہیں، انہیں تکلیف ہوگی۔ اب ہم کیا کرتے، صبح سے بیٹھے جھک مار رہے ہیں اور ابھی وہ شہنشاہ فخر آ کر بگڑے گا کہ ہم نے کچھ پکایا بھی نہیں۔"

"یہ فخر بڑا گدھا ہے! جی جلانے والی باتیں کرتا ہے۔ لو بھلا! مجھے کیا تکلیف ہوتی آنے دو اسے آج۔"

"چلیے غصہ چھوڑیے، مل جل کر کام کر لیتے ہیں۔"

اور کام کرنے میں ایسا مزہ کبھی نہ آیا تھا، ہنستے کھیلتے انہوں نے جلد ہی کام نپٹا لیا۔ بینو کا خیال تھا کہ موری گھنٹو پکایا جائے پر وہ بولی...... "نہیں بھئی! مجھے ماں کے پاس ہسپتال جانا ہے، بس سادہ سا کھانا پکائے لیتے ہیں۔ تم لوگ کچھا مرکیٹ سے مچھلی لے آؤ اور ہاں سنو! ماگھر ماچھ لانا۔"

"بلبل، ماگھر کا نام سن کر خوب ہنسا...... "سومی آپا! آپ جو دو سال ادھر میں رہ گئیں تو بس پکی بنگالن بن جائیں گی۔"

اور جب وہ ڈھیر سارے برتنوں کو اپنے آگے پیچھے پھیلائے نل کے آگے چوکی پر بیٹھی ان کی دھلائی میں مگن تھی، وہ گھر میں داخل ہوا تھا اور کھڑکی کے راستے باورچی خانے میں جھانکا تھا۔ اسے یوں کام کرتے دیکھ کر وہ بہت حیران ہوا۔ تھوڑی دیر وہ وہاں کھڑا کچھ سوچتا رہا پر وہ کام میں مگن تھی اور سیاہ چمکدار بال اس کے شانوں پر بکھرے ہلکورے کھا رہے تھے۔

اس کے سر میں شدید درد تھا اور چائے کا ایک کپ پی کر آرام کرنا چاہتا تھا پر باورچی خانے میں وہ تھی اور گھر میں کوئی دوسرا فرد اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ ہسپتال سے پیدل ہی گھر آیا تھا۔ راستے میں ٹھہر کر کسی ہوٹل سے اس نے چائے پینی یوں پسند نہ کی کہ وہ ہمیشہ سے نفیس اور ستھری چائے پینے کا عادی تھا۔ اب اگر سٹرائیک کا یہ چکر نہ ہوتا تو وہ ایئر پورٹ چلا جاتا۔

کبھی کبھی یہ اضافی ضرورتیں جو انسان کے ساتھ یونہی چپک جاتی ہیں کتنا تنگ کرتی ہیں۔

اس نے یہ سوچا۔ سر درد کی ایک گولی کھائی اور چائے بنانے کے لیے باورچی خانے کی سمت آیا۔

وہ برتنوں کو بانس کی بڑی ٹوکری میں رکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ بلبل اور بینو تو باہر جا کر ہی بیٹھ گئے۔ کھٹاک کھٹاک کی آواز گھر کے سکوت کو توڑ رہی تھی۔

جب اس نے دیکھا کہ وہ باورچی خانے کی طرف آ رہا تھا، وہ جس نے اسے حکمران طبقے سے آنے کا طعنہ مارا تھا۔

اس دن کے بعد وہ آج اسے دیکھ رہی تھی۔

یہ کہاں سے ٹپک پڑا؟ اس نے ناگواری سے سوچا۔

اس کی یہ سوچ ایسی ہی تھی جیسے کہ اس نے اپنے گھر کے محفوظ اور آرام دہ ماحول میں کسی ناپسندیدہ انسان کو دیکھ لیا ہو۔ کچھ واقعہ بھی یوں تھا کہ جب سے اس گھر میں اس کی آمد و رفت ہوئی تھی، شروع شروع میں اسے اس خیال سے کوفت ہوتی تھی کہ اگر اس کا ٹکراؤ کہیں اس سے ہو گیا تو یہ اچھا نہ ہوگا پر جب اسے مسلسل گھر سے غیر حاضر ہی دیکھا تو یہ خوف بھی دور ہوتا گیا۔

یوں یہ اور بات تھی کہ اسے دیکھ کر اس کے ہاتھوں میں پکڑا برتن اک ذرا لرزا تھا اور دل بھی گھبرایا تھا۔

پر وہ قریب آ کر نرم لہجے میں بولا تھا...... ”اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو میں چائے بنانی چاہتا ہوں“ ...... اس کی اس بات پر اس نے بہت غصہ کھایا۔

”یہ خود بنانی چاہتا ہے۔ کیا اس کا خیال ہے کہ میں اس میں زہر ملا دوں گی۔“

اس نے غصہ پر قابو پایا اور رسان سے کہا...... ”اگر آپ محسوس نہ کریں تو میں بنائے دیتی ہوں۔“ ...... ”شکریہ، میں تکلیف نہیں دینا چاہتا۔“

اس کا چہرہ تانبے کی طرح سرخ ہوا اور اس کا جی چاہا کہ برتنوں کی ٹوکری اٹھا کر اس کے سر میں دے مارے اور یا پھر اپنا سر پھوڑ لے۔ یہ کمبخت ایک کپ کے لیے میرا احسان نہیں

لینا چاہتا۔ کیا اسے نظر نہیں آ رہا کہ انہی لوگوں کے اتنے سارے جھوٹے برتن کس نے دھوئے ہیں؟ اب اتنی بھی اکڑ اور نفرت کیا کہ انسان ساری شائستگی اور تہذیب ہی بھول جائے اور جنگلی بن جائے۔

تب ایک لمحے میں جانے کیا ہوا۔ اس نے پھرتی سے کیتلی اٹھائی اس میں پانی ڈالا اور چولھے پر رکھتے ہوئے بولی...... ''آپ آرام کیجیے میں چائے لے کر آتی ہوں، حکمران طبقہ ہمیشہ اپنی رعایا کا خیال رکھتا چلا آیا ہے۔''

اس نے دیکھا اس کی پیشانی کی رگیں ایک دم ابھر آئی تھیں۔ بغیر کچھ کہے وہ واپس چلا گیا۔

اس نے چائے بنائی، برتنوں کو ٹرے میں سجایا اور اس کے کمرے میں آ گئی۔ چھوٹی تپائی پر برتن رکھے۔ وہ آنکھیں بند کیے نیم دراز لیٹا تھا۔ اس نے برتنوں کو قصداً ایک دوسرے سے ٹکرایا اور آہستگی سے بنگلہ میں پوچھا کہ وہ کتنی چینی پیتا ہے؟ اس نے آنکھیں کھولیں، اسے دیکھا اور بولا ''ڈیڑھ اور دودھ کم۔''

''اے اللہ! تو نے اسے اتنی خوبصورت آنکھیں بھلا کاہے کو دیں؟''

اس نے تپائی آگے بڑھائی اور جب وہ باہر آنے کے لیے دروازے کے پاس آئی، اس نے اونچی آواز میں کہا تھا...... ''اطمینان سے پئیں میں نے اس میں زہر نہیں ملایا۔''

اور چائے پیتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا...... ''ہوں، تو رعایا کی خدمت ہو رہی ہے۔''

اس کی یہ سوچ بہت طنزیہ تھی پر یہ بنگلہ کتنی اچھی طرح بول رہی تھی، لب و لہجہ اجنبی نہیں معلوم ہو رہا تھا۔

اس نے جب چاول ابال لیے۔ تب کہیں وہ دونوں گھر آئے...... ''میں تو یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ تم لوگوں نے وہاں ماچھ کی دکان ہی لگا لی ہے۔''

''ارے سومی آپا! پیدل گئے تھے، دیر تو ہونی ہی تھی۔''

بنگالی کھانے پکانے کا اسے کوئی تجربہ نہ تھا۔ مچھلی اس نے اپنے گھر کے طریقے سے پکائی۔ دال پتلی پکا کر بھگار ڈالی۔ اسی دوران فخر آ گیا اور آتے ہی اس نے خبر دی کہ چھاترو لیگ اور سٹوڈنٹس یونین کے درمیان جھگڑا ہو گیا ہے، خوب سر پھٹول ہوئی ہے۔ چاقو چھریاں چلی ہیں اور اب ای۔ پی۔ آر کے دستے کیمپس میں گشت کر رہے ہیں۔

''اے اللہ! تیرا ہزار شکر ہے۔''......اس نے اپنے دل میں چپکے سے کہا......''یہ چھاترو لیگ اور سٹوڈنٹس یونین خوب خوب آپس میں لڑیں مریں، انہوں نے قیامت مچا رکھی ہے۔ وطن دشمن سرگرمیاں ان کی زندگی بن گئی ہیں۔''......اس کے احساسات میں تلخی ہی تلخی تھی۔

کھانے کی میز، جب انہوں نے مل کر ٹھیک کر لی تو بینو اسے بلانے چلا گیا۔ اسے قطعی امید نہ تھی پر وہ آ گیا اور میز کے ایک طرف بیٹھ کر خاموشی سے بھات کھانے لگا۔

وہ تینوں بھائی زور و شور سے باتیں کر رہے تھے۔

فخر بولا......''اس مطیع گروپ کا خون کچھ زیادہ ہی ابل رہا تھا۔ چلو اچھا ہوا! کچھ خارج ہو جانے سے ٹھیک ہو جائے گا۔''

پر اس کی سوچ میں بہت دکھ تھا......''یہ نادان ہیں اور آپس میں ہی لڑ لڑ کر مر رہے ہیں، قوم جب تک متحد اور مضبوط نہ ہو کبھی سوراج بھی ملا ہے۔''

اور پھر ان کی گفتگو کا رُخ مختلف ہالوں کی جانب سے پیش کیے جانے والے ناٹکوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ بلبل نے کہا......''کاش سومی آپا! آپ نے شلپی بھیا کی پارٹی کا ناٹک دیکھا ہوتا۔''

''کیا کرنا تھا دیکھ کر۔ سمجھی سمجھائی چیزوں میں کشش نہیں ہوا کرتی۔''

اس نے کسی قدر رکھائی سے کہا۔ دراصل وہ ان سے چھپا گئی تھی کہ اس نے وہ سارا پروگرام دیکھا تھا۔ اگلے دن جب بینو اسے خاص طور پر یہ بتانے کے لیے آیا تھا کہ انہوں نے اسے تلاش کرنے کے لیے کتنی تگ و دو کی اور یہ کہ وہ کہاں غائب ہو گئی تھی۔ اس نے شان سے

ڈینگ ماری...... ''میں تو اسی وقت واپس آ گئی تھی۔ اتنی بد نظمی تھی وہاں پر۔''

اور یہ بات اس نے اب بھی کہہ دی تھی۔

وہ کھانا کھانے اور ان تینوں بھائیوں سے باتیں کرنے میں محو تھی۔ یوں اگر ایک بار بھی اس کی نظر اس پر پڑ جاتی جو بہت خاموشی سے کھانا کھا رہا تھا تو یقیناً وہ اتنا سفید جھوٹ اتنا ڈٹ کر نہ بول پاتی۔

مچھلی کے کانٹے پلیٹ میں رکھتے وقت اس کے ہونٹوں پر پُر اسرار سی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور اس نے ایک ذرا سی دیر کو نظریں اٹھا کر اس لڑکی کو دیکھا جس کے جوگیا کرتے میں چاندی کے بٹن جھلمل جھلمل کرتے تھے اور جو اس کے بھائیوں کے درمیان بیٹھی بھات کو جلدی جلدی کھانے میں مگن تھی۔

''وہاں بہت بد نظمی تھی اور یہ اسی وقت واپس آ گئی تھی''...... وہ اپنی مسکراہٹ دبا گیا تھا۔

''سومی آپا، دراصل میڈیکل کالج کے واقعے سے دل برداشتہ ہیں۔'' بلبل فخر سے مخاطب تھا۔

''کچھ تفصیل بتاؤ اس واقعے کی''...... فخر بولا۔

''بھئی! وہی بنگلہ چلبے والا قصہ ہے اور تفصیل یوں ہے کہ ڈھاکا میڈیکل کالج کے استقبالیہ میں سال اوّل کی ایک طالبہ نے اپنی کلاس کی جانب سے شکریہ انگریزی میں ادا کرنا چاہا۔ جس پر بنگلہ بولو بنگلہ کا شور مچا۔ بے چاری لڑکی نم آنکھوں کے ساتھ سٹیج سے اتر آئی۔''

اس کے دل کو دھچکا لگا جب فخر نے کہا...... ''حالات ہمیں سخت اقدام پر مجبور کر رہے ہیں۔ کیونکہ بائیس سال گزر جانے پر بھی ہماری زبان کو وہ مقام اور اہمیت نہیں مل سکی جس کی یہ متقاضی ہے۔''

پر اس کے کچھ کہنے سے پیشتر ہی بلبل بول اٹھا...... ''بنگلہ سے اتنی محبت رکھنے کا یہ قطعی مطلب نہیں کہ آپ اخلاق اور انسانیت کا دیوالیہ نکال دیں جب آپ سارا سال انگریزی

پڑھتے ہیں تو شکریہ کے دو بول اس زبان میں سن لینے میں کیا حرج ہے؟''

فخر! زبانیں کبھی جبراً ٹھونسی نہیں گئیں اور جب بھی ایسا ہوا وہ اپنی موت آپ مر گئیں۔

''ہم تو یہ جانتے ہیں سومی آپا! یہ جبراً ٹھونسی جاتی ہیں اور مرنے کی بجائے خوب پھلتی پھولتی ہیں۔ آپ بتایئے کہ بنگلہ اور اُردو دونوں اس ملک کی قومی زبانیں ہیں تو کیا وجہ ہے کہ اردو جو اس حصے کے سکولوں کے لیے لازمی مضمون ہے، اُس حصے کے لیے بنگلہ نہیں؟ کہیے جو پچھمی پاکستان میں ایک فیصد لوگ بھی اسے سمجھنا اور بولنا جانتے ہوں اور تو اور یہاں جو بہاری ہیں انہیں اس زبان سے شدید نفرت ہے۔ سالہا سال اکٹھے رہنے کے باوجود بھی وہ اسے نہیں بولتے۔ کوئی بات ہو یہ سن لیجئے! یہ لوگ ہندو، ان کی بھاشا ہندو، ان کا کلچر ہندو۔ محبت واعتماد کے رشتے کیا ان بنیادوں پر استوار ہوتے ہیں؟''...... فخر نے تو بخیئے ادھیڑ ڈالے تھے اور فی الواقع وہ جو کچھ کہہ رہا تھا کسی حد تک درست تھا۔ اس نے اتفاق کیا اور بولی۔

''فخر! اُردو کی جڑیں بنگال میں بہت گہری ہیں۔ پوربو بنگال کے مسلمان بنگالی اُردو بولنا فخر سمجھتے تھے۔ اُردو کی ترویج میں اس خطے نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ پر میں افسوس سے کہوں گی کہ بنگلہ سے اندھی محبت ہر اس چیز کا نام مٹائے دے رہی ہے جس کا ذرا سا بھی تعلق اُردو سے ہے۔ تمہی بتاؤ اکیس فروری کو ہر سال جو توڑ پھوڑ ہوتی ہے کیا یہ کسی طرح بھی مستحسن ہے؟ کتنی جانوں کا ضیاع ہوتا ہے، کتنی توڑ پھوڑ ہوتی ہے، یہ تو اوچھے ہتھکنڈے ہیں۔''

بحث طوالت پکڑ گئی تھی، وہ تو جانے کب کا اٹھ کر چلا گیا تھا۔ بلبل نے یہ کہتے ہوئے ''سومی آپا! یہ ملک بہت بدقسمت ہے۔'' ریڈیو کا سوئچ آن کر دیا تھا۔

بیلا خان گا رہی تھی۔ بیلا خان کا گیت کسی کے قدموں کی کھوج میں تھا اور اس کا ذہن اپنے ملک کے مستقبل کی کھوج میں۔

دودنوں کے یہ اڑتالیس گھنٹے اس پر بہت بھاری گزرے تھے۔ چاہنے پر بھی وہ آنکھ نہ جھپک سکی تھی۔ ہسپتال کی مخصوص فضا جنرل وارڈ کے مریضوں کی کراہیں۔ اس چھوٹے سے کمرے میں بستر پر لیٹی بیمار ماں اور ان کے رہنما لیڈر بیٹے کے ڈھیروں مداح اور کارکن۔ کوئی ایک گھڑی آرام کرے بھی تو کیسے؟ یوں ماں کو ہوش بھی ابھی تھوڑی دیر قبل ہی آیا تھا۔

ماں کی بیماری نے اس پر بہت سی باتوں کا انکشاف کیا تھا۔ وہ تو کبھی یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ ماں کا یہ لیڈر بیٹا جس کی بے ڈھنگی سرگرمیوں سے ماں اور بابا دونوں ہی عاجز رہتے تھے۔ عوام میں اس قدر ہردلعزیز ہے۔ اسے تو بس اتنا ہی معلوم ہوا تھا کہ اس کی پارٹی ڈھاکا یونیورسٹی میں طلبا کی سب سے بڑی تنظیم خیال کی جاتی ہے جو منظم بنیادوں پر قائم ہے۔ اس پارٹی میں لڑکیوں کی کثیر تعداد ہے جو پارٹی کے نظریئے سے کہیں زیادہ اس کی شخصیت سے متاثر ہیں۔

اسے حیرت ہوئی تھی جب پاکستان آبزرور اور مارننگ نیوز میں اس نے ماں کی بیماری کے بارے میں تفصیلی پڑھا۔ بینو نے اسے بنگلہ اخباروں کے متعلق بھی بتایا تھا کہ ان کی ماں کی صحت اور درازی عمر کی دعائیں مانگنے کی اپیل کی گئی ہے۔ یوں سارا دن عورتوں، مردوں، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی طلبا کا تانتا بندھا رہا۔

بس اس لمحے کی خوشی بے پایاں تھی۔ وہ جو تھکن سے چور چور تھی، پل بھر میں تازہ دم ہوگئی اور ہوا یوں تھا کہ چند لڑکیاں جو شلپی کی پارٹی کی سرگرم رکن تھیں۔ ماں کی عیادت کے لیے آئیں، ان میں وہ ٹیڑھی ٹانگوں والی سلمیٰ بھی تھی۔ جو تھی تو اگرچہ اس کی کلاس فیلو پر معلوم نہیں اس سے ہر دم بیزار کیوں رہتی؟ شروع شروع کے دنوں میں اس نے اس سے اچھے تعلقات قائم کرنے کی مقدور بھر کوشش کی پر ٹانگوں کے ساتھ ساتھ اس کا دماغ بھی ٹیڑھا ہی تھا، کلاس اور کلاس سے باہر وہ نفرت کے اظہار کا کوئی موقع شاید ہی گنواتی۔

اس دن تو وہ سرتا پا سُلگ اٹھی، وہ چند لڑکیوں کے ساتھ ہیڈ سر کے کمرے میں جا رہی تھی۔ راستے میں اس ٹیڑھی ٹانگوں والی نے شیفو سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا......

''انہیں چلنے کے لیے کس نے کہا ہے؟''

''محترمہ سلمیٰ صاحبہ! ہیڈ سر کیا آپ کے پرسنل سیکرٹری ہیں جو ہم اجازت کے لیے آپ کے پاس آتے؟''......اس کا خون کھول اٹھا تھا۔

معاملہ زیادہ طول پکڑ جاتا پر ساتھ کی لڑکیوں نے بات رفع دفع کرا دی۔ اس کا دل بہت کڑھا، بار بار خود سے الجھتے ہوئے وہ اپنے آپ سے کہتی...... ''کیسی سٹوپڈ اور نان سینس لڑکی ہے! یوں دیکھتی ہے جیسے کچا ہی تو چبا جائے گی۔''

شام میں جب وہ پوکھر میں نوکا چلا رہی تھی اور جہاں آرا اس کے پاس بیٹھی تھی، اس نے اس کے رنج و غصے کو محسوس کیا تو بولی۔

''سمعیہ! انفرادی اختلافات کو اگر تم سمجھنے کی کوشش کرو تو شاید ان کے Behaviour کے یہ مختلف انداز تمہیں تکلیف نہ پہنچائیں۔ دیکھو! وہ شلپی پر مرتی ہے اور تمہیں اس کے چھوٹے بھائیوں کے ساتھ دیکھ چکی ہے، یقیناً اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کا بابا تمہارا لوکل گارجین ہے اور اس کا خاندان تمہیں بے حد چاہتا ہے۔''

''پر سنو، یہ اگر اس پر مرتی ہے تو وہ اس کا دم نہیں بھرتا کیا؟''

جل بیل کے کاسنی پھولوں کی پتیاں نوچ نوچ کر پانی میں پھینکتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

''میری جان! تمہاری ماں کا بیٹا ایک نمبر خرانٹ، کنفرمڈ بیچلر ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ جب یہ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا تو کئی ایک اس کی دیوانی تھیں اور کئیوں پر یہ مرتا تھا پر اب اس کے نزدیک یہ سب خرافات ہیں کیونکہ وہ اب معاشرے میں بنگلہ قومیت کا زہر گھولنے اور سن آف دی سوئیل (Son of the Soil) کا نعرہ لگانے میں بے حد مصروف ہے۔ ایسے میں لڑکیوں کو لفٹ کروانے کے لیے نہ تو اس کے پاس وقت ہے اور نہ ہی فرصت۔''

اور آج وہ آئی تھی، پیشانی پر چمکتی بندیا کے ساتھ۔ سمعیہ علی نے اپنی گردن اونچی کی۔ بے اعتنائی سے اسے دیکھا اور کام میں لگ گئی۔ وہ ماں کو پھلوں کا رس پلا رہی تھیں۔ بُلبل اس کے پاس کھڑا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ بینو ٹفن اٹھائے اندر آیا اور بولا...... ''سومی آپا! آپ کھانا کھالیں۔''

بابا اور فخر، ڈاکٹر کے ساتھ اندر آئے۔ ڈاکٹر نے ماں کو انجکشن دیا اور مسکرا کر انہیں آپریشن کے کامیاب ہونے کی مبارک دی۔

ڈاکٹر نے اس کٹے بالوں والی لڑکی کے متعلق پوچھا۔ بابا نے اسے بہت محبت سے دیکھا تھا۔

''ہماری بیٹی ہے یہ!''......انہوں نے ڈاکٹر کو بتایا۔

''یہ بہت اچھی نرس ہے۔''......ڈاکٹر مسکرایا۔

وہ بابا اور ان کے تینوں بیٹوں کے ساتھ کھڑی باتیں کر رہی تھی۔ وہ جو بنگالی نہ تھی۔ ملک کے دوسرے حصے سے آئی تھی، ان کے کتنے قریب ہو چکی تھی۔

اور جتنی دیر وہ وہاں بیٹھی اس نے اس وقت کے ایک ایک لمحے سے تسکین پائی۔

اس نے کھانا کھایا، چائے پی اور ماں کے اصرار پر تھوڑی دیر آرام بھی کیا۔ شام ہو گئی تھی۔ ماں پر غنودگی طاری تھی۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ جب وہ آیا پہلی نظر میں اس نے اسے پہچانا ہی نہ۔ وہ سرتاپا بدلا ہوا تھا، اس کا دراز قد بہترین ٹھنڈے سوٹ میں نمایاں تھا۔

وہ دھیمے دھیمے ماں سے کافی دیر باتیں کرتا رہا، ماں نے اس کی پیشانی پر طویل پیار کیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر اور بیٹھا پھر چلا گیا۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے، اس نے جھک کر انہیں صاف کیا۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی۔ پر پوچھ نہ سکی۔ نو بجے بینو آیا۔ تب اسے معلوم ہوا کہ وہ دو ماہ کے لیے امریکہ اور انگلینڈ گیا ہے۔

''سومی آپا!'' ...... بینو نے شرارت سے آنکھیں نچائیں...... ''آپ کا جھوٹ پکڑا گیا ہے۔'' ...... وہ حیران ہوئی اور بولی...... ''کیسا جھوٹ بھئی؟''

اور اس نے مسکراتے ہوئے تین تصویریں اس کے ہاتھ میں تھما دیں، وہ دنگ رہ گئی تھی، یہ ناٹک والے دن کی تصاویر تھیں جنہیں یونیورسٹی فوٹو گرافر نے کھینچا تھا۔ وہ گھاس پر آلتی پالتی مارے بیٹھی باقی لوگوں کی نسبت بہت نمایاں نظر آ رہی تھی۔

''یہ تو برا ہوا'' ...... اس نے دل میں کہا...... ''پر بینو! یہ تمہیں کیسے ملیں؟''

''پہلے یقین کر لیجیے یہ آپ ہی ہیں نا!''

''پر سومی آپا! آپ نے تو پروگرام دیکھا نہیں تھا'' ...... وہ اسے جلا رہا تھا۔

''باز نہیں آؤ گے بینو! میں تم سے کیا پوچھ رہی ہوں؟'' ...... وہ کاٹ کھانے کو دوڑی۔

''یہ شبلی بھیا نے آپ کے لیے بھیجی ہیں۔''

''خدایا!'' ...... اس نے سر پکڑا۔

''اور جھوٹ بولیے'' ...... وہ بھی آج اسے چڑانے پر تلا ہوا تھا۔

''بینو اللہ قسم! تم آج مجھ سے پٹ جاؤ گے۔''

ماں بستر پر لیٹے لیٹے بولیں...... ''بینو! کیوں بہن کو تنگ کرتے ہو؟''

''ان تین کے علاوہ آپ اور بھی تصویروں میں ہیں۔ بس یوں لگتا ہے کہ فوٹو گرافر کو بس آپ ہی نظر آ رہی تھیں'' ...... بینو اٹھلایا۔

کس قدر کوفت ہو رہی تھی اسے صرف یہ سوچ کر کہ وہ کیا سوچتا ہوگا۔

اس نے اپنے قدموں کو تیز کیا اور اس کے بالکل قریب آ کر آہستگی سے کہا۔

''اروما! تمہیں جگن ناتھ ہال جانا ہے تمہارے لیے ضروری پیغام ہے۔''

اپنے خوبصورت نتھنوں والی ناک پر ٹکی گوگو عینک کے ہلکے نسواری شیشوں سے اس نے اکتاہٹ سے اسے دیکھا اور کسی قدر پھیکے لہجے میں بولی۔

''کیا ابھی؟''

''ہاں۔''

''میں اس وقت بے حد تھکی ہوئی ہوں۔ صبح سے لگاتار کلاسیں تھیں، مجھے بھوک بھی لگ رہی ہے۔ میں بھات کھانے کے بعد ہی جا سکوں گی۔'' اس نے یہ کہا اور سستی سے آگے بڑھ گئی۔

''یہ کچھ عجیب سی ہوتی جا رہی ہے، بیزار بیزار اور اکتائی ہوئی۔ اس کا وہ جوش و جذبہ بھی اب مدھم پڑ گیا ہے جو یہ اپنے ساتھ شیلانگ سے لائی تھی۔ پر ممکن ہے یہ میرا وہم ہو، اس کا اب آنرز کا آخری سال ہے اور یہ پڑھائی میں مگن ہے۔ اب یہ بھی تو ممکن نہیں کہ رنیش دت کی بیٹی کی سپرٹ کم ہو جائے۔''...... پستہ قد دیو نے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی اور بڑھتے ہوئے سوچا۔

تھکے تھکے قدم اٹھاتی جب وہ مدھومیتا کنٹین کے پاس سے گزری تو اس نے اپنے آپ سے کہا..... ''میں چکی کے دو پاٹوں میں پس رہی ہوں اور ذہنی سکون سے خالی ہو بیٹھی ہوں۔ اپنے باپ کے مشن سے ساری دلچسپیاں ختم کر کے میں نرالے راستے پر چل پڑی ہوں۔''

اور وہ درختوں کے جھنڈ سے گزرتی رہی، پبلک لائبریری کے سامنے رک کر اس نے سوچا..... ''ہال چلی گئی تو واپس آنے کو دل نہیں چاہے گا یہیں کینٹین سے چائے کا ایک کپ پی کر جگن ناتھ ہال کا چکر لگا آتی ہوں۔ معلوم نہیں ضروری پیغام کیا ہوگا؟''

اس نے کونے کی میز پر نیلی پُران، ابوعبداللہ، اُجیت اور ریحانہ کو بیٹھے دیکھا تو سیدھی ان کی اور بڑھ گئی۔ کتابیں میز پر پھینکتے ہوئے اس نے عنابی ساڑھی کا آنچل ڈھیلا کیا۔ جب پُران نے پوچھا۔

''چائے منگواؤں؟''

''پوچھتے کیا ہو؟ منگواؤ اور ہاں مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ ایک مغلئی پراٹھا کا بھی کہنا۔''

وہ دھپ سے کرسی پر بیٹھ گئی اور گردن کو پشت پر پھینک دیا..... ''بہت تھکی ہوئی دکھائی دے رہی ہو'' اجیت بولا۔

''کریک ہیں ہمارے ہیڈ سر۔ موڈ نہیں ہوگا تو ہفتوں کلاس میں جھانکیں گے بھی نہیں اور جو لینے پر آئیں گے تو چھوڑیں گے نہیں۔ مار نوٹس لکھوا لکھوا کر بھرتا بنا دیا ہے۔''

ابوعبداللہ اور پران مغربی پاکستان جا رہے تھے۔ وہ وہی باتیں کر رہے تھے۔

''تم وہاں کیا کرنے جا رہے ہو؟'' اس نے چائے پیتے ہوئے پوچھا۔

''کنویسنگ کے لیے بھئی! وہاں مقیم بنگالیوں سے بھی امداد و تعاون حاصل کیا جائے نا۔''

''سوچ سمجھ کر جانا، کہیں پوربو پاکستانیوں سے ٹکرا گئے تو پٹ جاؤ گے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں۔''

ابوعبداللہ نے نیلما سے پوچھا..... ''شیلپی کی ماں بیمار ہے، انہیں دیکھنے نہیں جانا کیا؟''

''اے لعنت بھیجو! اس کے ماں باپ پر''...... نیلما تنک کر بولی!...... ''کٹر مسلمان اور پاکستانی ہیں، زہر لگتے ہیں مجھے اور وہ مغربی پاکستان سے آئی ہوئی لڑکی تو کچھ یوں معلوم ہوتی ہے جیسے شلپی کی ماں نے ہی اسے جنا ہو۔ میں تو حیران رہ گئی اس دن دیکھ کر، شان تھی کوئی اس کی، پورا گھر اس کے آگے پیچھے بچھا جاتا تھا۔''

''پر ہے وہ واقعی حسین اور طرحدار۔'' ابوعبداللہ بولا۔

''کیوں رال ٹپک پڑی؟'' ریحانہ طنز سے مسکرائی...... ''یہ مرد ہوتے ہی ایک نمبر کمینے ہیں بس ذرا سا حسن دیکھا اور لٹو ہو گئے۔''

''اے بی! ختم کرو اس قصے کو''...... اروما جھنجلائی اور ریحانہ کی اور دیکھتے ہوئے بولی...... ''تم خواہ مخواہ ہی گھلی جا رہی ہو۔ شلپی کے لیے تو کوئی سکوپ بھی ہو سکتا ہے، یہ بیچارے کس گنتی شمار میں۔''

پران دھاڑا...... ''تم اپنی یہ بکواس رہنے دو، عورت جتنی گریٹ ہے، ہم جانتے ہیں۔''

''اگر یہ بات ہے تو تمہیں پُرامید رہنا چاہیے''...... اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''بیٹھو نا اتنی جلدی چل دیں۔''...... اجیت نے کہا۔

''بھئی! جگن ناتھ ہال اتھارٹیز سے رپورٹ کے لیے فی الفور کہا گیا ہے۔''

''جگن ناتھ ہال کے اس خاص کمرے میں نیلمبر چوہدری نے اسے اس کے باپ کا خط دیا اور اس سے اس کی پروگریس کے بارے میں دریافت کیا۔ خط بیگ میں احتیاط سے ڈالتے ہوئے وہ بولی...... ''نیلمبر دادا! تم ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتے ہو جو ممکن نہیں۔ ابھی تو مجھے اس کا اعتماد حاصل کرنا ہے۔ یوں الٹی سیدھی ہانکنی شروع کر دی تو چوکنا ہو جائے گا۔ یوں بھی وہ جہلم اپنی باڑی گیا ہوا ہے۔ ماہ بعد واپس آئے گا۔''

اور ہال کی سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ بے حد مغموم آواز میں بڑبڑائی تھی...... ''میں نے شاید اپنی قوم اور مذہب سے غداری شروع کر دی ہے پر میں مجبور ہوں اور اس کا اعتراف کرتی

ہوں کہ مجھے اس سے پیار ہے، اس سے جو پنجابی ہے اور جس کا کلچر، تہذیب، زبان اور مذہب، ہر شے مجھ سے مختلف ہے۔''

اپنے کمرے کو لاک دیکھ کر اس نے بھگوان کا شکر ادا کیا تھا۔ روم میٹ موجود ہونے کی صورت میں اسے خط پڑھنے کی بے حد دشواری ہوتی۔ اس نے غسل خانے کا دروازہ بند کیا۔ بتی جلائی اور خط پڑھا۔ جب وہ دو تین بار پڑھ چکی، اس نے پانی سے بھری بالٹی میں اسے پھینکا۔ اس کے حروف پانی میں گھل گئے اور کاغذ گل گیا تب اس نے اسے ہاتھ میں مسل کر چھوٹی نالی میں پھینک دیا اور منہ ہاتھ دھو کر باہر آ گئی۔

بالوں میں کنگھا چلاتے ہوئے اس نے جیوتی کو سنا جو برآمدے میں کھڑی اس سے اچار مانگ رہی تھی۔

''اندر آ کر لو نا! باہر سے کیا چلا رہی ہو۔''

''سنو جیوتی!...... جب وہ اس کے پاس آئی تو اس نے کسی قدر خفگی سے کہا۔ ''یہ تم اول جلول جو بکتی رہتی ہو، اس کا خیال رکھا کرو۔''

''میں نے کیا کہا ہے؟''......وہ بگڑی۔

''تم کہہ کر بھول جاتی ہو اور لوگ یاد رکھتے ہیں۔ اس دن ساجدہ کے سامنے کیا بکواس کی تھی کہ مسلمان رائٹرز کی کتابیں لگواتے ہیں اور ہندوؤں کی بین کرتے ہیں۔ پہلے ان میں لکھنے کی اہلیت تو پیدا کریں۔''

''تو کوئی غلط کہا تھا میں نے؟''......اس نے ٹھنکتے ہوئے کہا۔

''کریک ہو تم جیوتی!''......لو یہ اچار! اس نے شیشی اسے پکڑائی اور غصے سے بولی......

''جاؤ دفع ہو جاؤ! بھیجے میں بھس بھرا ہوا ہے، کوئی بات سمجھتی ہی نہیں۔''

ڈھاکا چھاؤنی کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے انہیں آدھ گھنٹہ ہو چکا تھا۔ تنگ آ کر وہ بولی......''اے بی! اس بے بی ٹیکسی کے چکر کو چھوڑو اور سیدھی طرح بس میں بیٹھو ورنہ رات

یہیں ہو جائے گی۔''

پر وہ کسی طرح بس میں بیٹھنے کے لیے آمادہ نہ تھی۔ ہر پھر کر یہی دلیل دیتی کہ...... ''تم اسے لاہور نہ سمجھو یہ ڈھاکا ہے اور یہاں لڑکیوں کے بسوں میں سفر کرنے کو پسند نہیں کیا جاتا۔''

اسے سخت غصہ آیا، تلملا کر بولی...... ''تو یہاں اچھا کسے سمجھا جاتا ہے؟ نحیف و نزار لوگوں کی سائیکل رکشاؤں میں ڈٹ کر بیٹھنا بہت عزت کی بات ہے نا؟''

''بھئی سومی! یہ تمہاری ہر دم بدلتی طبیعت میرے لیے ایک مصیبت ہے۔ اب جو تم یہاں سڑک پر میری جان کو آئی ہوئی ہو تو وہاں ہی کچھ دیر اور ٹھہرتیں، تمہارے وہ انکل آغا گاڑی لے کر آجاتے۔ تو آرام سے ہمیں ڈراپ کر دیتے، یہ چخ چخ تو نہ ہوتی۔ تمہاری اس افراتفری اور جلدی جلدی کے چکر نے تو مجھے اطمینان سے چائے بھی نہ پینے دی۔

''اے لو! مجھے کہا ہوتا کہ ابھی ہم اور پیئیں گے۔ دو کپ پی کر بھی تمہاری تسلی نہیں ہوئی۔ اتنا پیٹ بڑھایا ہوا ہے۔''

اور جواباً اس نے اس چشمے والی سے سر پر تھپڑ کھایا تھا اور یہ چشمے والی جہاں آرا تھی۔

وہ دونوں صبح نو بجے ہال سے نکلی تھیں۔ جناح ایونیو کے گنی سٹور سے انہوں نے خریداری کی۔ مدھومیتا میں انجلیک کا سپیشل شو دیکھا۔ سیون ہیون میں کھانا کھایا، پھر وہ اگلو میں آگئیں۔ جہاں انہیں این۔ ایس۔ ایف کے جنرل سیکرٹری نے ملنے کا کہہ رکھا تھا۔

جہاں آرا ابھی اس پارٹی کی سرگرم کارکن تھی۔ پر جب پارٹی غنڈہ گردی اور فحاشی کی وجہ سے بدنام ہوگئی تو اس نے بھی رکنیت چھوڑ دی۔ منعم خان والے زمانے کا عروج اب ختم ہو چکا تھا اور پارٹی گرتی ساکھ کو سنبھالنے کی اپنی سی کوشش میں تھی۔ پرانی ممبر ہونے کی وجہ سے وہ میٹنگ میں اب بھی بلائی جاتی۔ لڑکیوں سے این۔ ایس۔ ایف کی رنگین کہانیاں سن کر اس نے ایک دن جہاں آرا سے کہا تھا۔

''میں حیران ہوں تم اس کے ساتھ کاہے کو چمٹی ہوئی ہو! اتنی بدنام پارٹی ہے، دو حرف

لعنت کے نہیں بھیجتی۔''

اور وہ جو اس وقت باہر جانے کی تیاری میں مگن تھی۔ خود پر پرفیوم کی بارش کرتے ہوئے اپنے خاص انداز میں بولی تھی...... ''میری جان! تو کیا ہم تمہاری ماں کے بیٹے کی پارٹی کو سپورٹ کریں؟ تاکہ وہ کل ہمیں پوربو پاکستان سے ہی نکال باہر کرے۔ ہم لوگوں کے لیے جن کی مادری زبان بدقسمتی سے اُردو ہے صرف دو ہی تو پارٹیاں ہیں۔ اسلامی چھاترو شنگھو اور این۔ ایس۔ ایف۔

''تو تم اسلامی چھاترو شنگھو کو سپورٹ کیوں نہیں کرتیں؟ اس غنڈہ پارٹی کے پیچھے لگی ہوئی ہو۔''

''یہ دماغ کم بخت نہیں مانتا۔ دیکھو بی! بلاؤز اور قمیص تو مجھے سلیولیس پہننے ہیں، ایسے میں اسلام کا پرچار کروں۔ لعنت ہی پڑے گی نا مجھ پر؟''

''ڈوب مرو چلو بھر پانی میں! یہ تم مسلمانوں کے گھر پیدا ہوئی ہو۔''

اور جواباً اس نے اس کے شانوں پر لہراتے بالوں کو مسلا تھا اور چشمے کے اندر سے دیدوں کو گھماتے ہوئے بولی تھی...... ''یہ کام جو مجھے کروا رہی ہو پہلے خود کرو نا۔ خیر سے ہندوؤں اور عیسائیوں کے گھر میں تو تم نے بھی جنم نہیں لیا۔''

قریب تھا کہ وہ دونوں الجھ پڑتیں۔ پر کمرے میں ارومادت آ گئی تھی جس کی وجہ سے یہ لڑائی انہوں نے پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھی۔

اب یہاں اگلو میں آئس کریم کھاتے ہوئے ان کے درمیان گرما گرم سیاسی بحثیں ہوئیں۔...... ''میں تمہیں بتاؤں''...... جہاں آرا نے نورالزماں کو مخاطب کیا...... ''تمہاری پارٹی کی حالت اس پیپ اور خون ملے پھوڑے کی طرح ہے جس کا نام سنتے ہی لڑکیاں کراہت کے مارے قے کرنے لگے پڑتی ہیں۔ اب ایسے میں کوئی کنوینسنگ کرے بھی تو کیسے؟ اس کا علاج کرواور اسے نیا خون دو۔''

اور دبلا پتلا گھنی مونچھوں والا نورالزماں طنز کے یہ سارے تیر سہتا رہا جب وہ اٹھنے لگیں تو اس کی طرف دیکھتے ہوئے جہاں آرا سے بولا...... ''انہیں بھی پارٹی کے آئندہ اجلاس میں لائیے نا۔''

اگلو سے باہر آ کر وہ رکشے میں سوار ہوئیں اور چھاؤنی کی جانب چل دیں۔ میجر آغا کئی بار ہال کا چکر لگا گئے تھے۔ اس نے سوچا آج ان کا گلہ بھی دور کر آئے۔

راستے میں وہ بولی...... ''ہماری خاطر مدارت پر اس کے کافی پیسے کھل گئے ہوں گے۔''

''لو تو کیا ہوا؟ کون سا اس کی خون پسینے کی کمائی تھی؟ ارے بھئی! یہ لیڈروں کے چمچے یونہی تو نہیں بنے ہوئے! شکر کرے میں نے زیادہ چیزوں کا آرڈر نہیں دیا وگرنہ ہوش ٹھکانے آ جاتے۔''......اس نے کمال سکون سے باہر سڑک پر دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''پر وہ یقیناً سوچتا ہوگا کہ ہم کیسی لڑکیاں ہیں؟''......اس نے بھی نامعلوم سے اندیشے کا اظہار کرنا ضروری سمجھا تھا۔

''خدا کی قسم! سخت امچیور ہو تم۔ یہ تو بتاؤ ذرا! کس ڈربے سے نکل کر آئی ہو؟ جو ایٹی کیٹس کا بھی علم نہیں۔ دیکھ رہی تھی میں تمہاری ساری حرکتیں اس وقت، کوک کو ایک ہی سانس میں چڑھا گئیں۔ بھلا محفل میں بیٹھ کر یوں ڈرنک کیا جاتا ہے؟''......وہ بگڑ کر بولی۔

''چلو چلو! بڑی انٹلیکچوئل بنتی پھرتی ہو، جانتے ہیں ہم سب۔''......سمعیہ علی اس سے بھی زیادہ بگڑ کر بولی۔

''ارے! بس غصہ آ گیا؟ بھئی مذاق کو تو سمجھا کرو۔''

میوزک کالج کے پیچھے سے گزریں، کوئی تان پورہ بجا رہا تھا......''ارے! میرا جی چاہتا ہے یہاں داخلہ لے لوں۔''......اس نے کہا۔

''ضرور لے لو پر اگلے ہی دن بھاگ آؤ گی''......وہ مزے سے سیٹی بجاتے ہوئے بولی۔

''شرم کرو کچھ! کیا لوفروں کی طرح سیٹیاں بجا رہی ہو، یہ تمہارے ہال کا باتھ روم ہے کیا؟ ہاں! یہ تو بتاؤ بھاگ کیوں آؤں گی؟''

''ارے بی بی! نہایت جغادری قسم کے ہندو میوزک سکھاتے ہیں یہاں...... اور تم ٹھہریں ویسٹ پاکستانی جنہیں ہندو کا نام سننا تک گوارہ نہیں۔ تم سیکھ سکو گی ان سے۔''

اور ڈھاکا چھاؤنی کے اس خوبصورت گھر میں جہاں زرد املتاس کے جھکے جھکے گچھوں اور گل مہر کے سرخ پھولوں نے آگ سی لگا رکھی تھی۔ انہوں نے میجر آغا کی بیوی بچوں کے ساتھ پُر لطف وقت گزارا۔ چائے پی اور پھلکیاں کھائیں۔ جہاں آرا کو مسز آغا کچھ زیادہ ہی پسند آ گئی تھی۔ تبھی وہ اٹھنے کا نام نہ لے رہی تھی۔ اس کی جان الجھن میں پھنسی تھی۔ اسے آج ماں سے بھی ملنے جانا تھا، کچھ بعید نہ تھا کہ ان تینوں میں سے کوئی ہال ہی آیا ہو۔

بس آئی اور اس نے اسے زبردستی اندر دھکا دیتے ہوئے کہا۔

''جہاں آرا بیگم! تم اپنے ماتھے پر لٹکتے ہوئے اس اونچی شان کے جھومر کو تھوڑی دیر کے لیے اتار دو میری جان ٹوٹ رہی ہے، ماں میرے انتظار میں ہوں گی۔''

''ماں کی جدائی میں گھلی جا رہی ہو، یا ان کے لیڈر بیٹے کو دیکھے زیادہ دن ہو گئے ہیں؟''

اور جب وہ گھر آئیں، کمرے میں بیٹھی ماں بے چینی سے اسے دیکھ کر اٹھی تھیں......

''میری آنکھیں تمہاری راہ دیکھتے دیکھتے پک گئیں۔ تمہارے بابا اور بینو تمہیں ہال لینے گئے تھے۔ آج میں نے موری گھنٹو پکایا تھا کہ تم آؤ گی۔''

اس نے معذرت کی اور اپنی مجبوری انہیں بتائی۔

جہاں آرا ان سے پہلی بار متعارف ہوئی تھی۔ ان کی محبت سے، بہت متاثر ہوئی۔

''مجھے اس کا ہال رہنا بالکل پسند نہیں۔ ہمیشہ سے ایک اچھی بیٹی کی تمنا تھی، اب یہ آئی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے اللہ نے میری دعا سن لی ہو''...... ماں کے لہجے میں محبت کی گرمی تھی۔

''اپنے بیٹے کی شادی کر دیجیے، بس بیٹی مل جائے گی۔''...... جہاں آرا نے کہا۔

''اس کا تو مجھے اختیار نہیں۔''......افسردگی سے وہ بولیں۔

انہیں کھانے کی ذرہ برابر خواہش نہ تھی۔ پر ماں خالی کیسے اٹھنے دیتیں۔ موری گھنٹو کھلایا، چائے پلائی اور واپسی پر وہ بولی تھی۔

''یہ شلپی کی ماں ہے۔ اتنی ملنسار اور سلجھی ہوئی عورت! میں حیران ہوں اور اس کا بیٹا تخریبی سرگرمیوں میں الجھا ہوا ہے۔ بنگالی اور غیر بنگالی کے مسئلہ کو ہوا دے رہا ہے اور علیحدگی کو اپنی نجات سمجھتا ہے۔''

وہ موقع کی مناسبت کا خیال رکھتے ہوئے اچھا دیدہ زیب لباس پہن کر آئی تھی، ماں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''تم ساڑھی نہیں پہنتی ہو بیٹے!''

وہ ذرا جھینپی اور بولی...... ''ماں! مجھے اچھی طرح باندھنی نہیں آتی۔ پہن کر یوں لگتا ہے کہ بس ابھی گر جاؤں گی۔''

''نہیں بیٹے! تم بنگال آئی ہو، پہنا کرو۔ عادت ہو جائے گی اور تم پر تو سجے گی بھی بہت۔''

رات کو اس کی روم میٹ نے کہا تھا...... ''سومی! تم بنگالی گھرانے کی ایک تقریب میں شرکت کر رہی ہو۔ ساڑھی پہن کر جاؤ، وہ لوگ بہت خوش ہوں گے۔'' روشن اور جہاں آرا نے بھی اسے یہی مشورہ دیا پر وہ ڈرتی تھی۔

''ارے بھئی! اگر کہیں کُھل کُھلا گئی تو الٹی مصیبت گلے پڑ جائے گی۔''

یوں وہ ساڑھیوں کو بہت پسند کرتی تھی۔ ابھی پچھلے دنوں نیو مارکیٹ سے چار پانچ سوتی

ساڑھیاں خرید کر لائی تھی پر جب بھی پہنتی اسے سنبھالنا عذاب بن جاتا۔ یوں چال بھی ذرا آہستہ کرنی پڑتی اور یہی بات اس جیسی طوفان میل لڑکی کے لیے ممکن نہ تھی...... ''بھئی! یہ نزاکت سے چلنا قطعی میرے بس کی بات نہیں۔''...... وہ جھنجھلا کر خود سے کہتی اور اپنے اصلی حلیے میں فوراً لوٹ آتی۔

ویسے اس کے کلاس فیلو لڑکے اور لڑکیوں نے بھی کئی بار اس سے کہا تھا کہ وہ ساڑھی پہنا کرے۔ اب وہ کیا بچی ہے جو پاجامے شلواریں پہنتی ہے۔

ماں اندر تیار ہو رہی تھی۔ وہ اور بینو برآمدے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ بینو چاہ رہا تھا کہ وہ وہاں سے فارغ ہو کر سیدھی گھر آئے تا کہ وہ اس کے ساتھ مووی دیکھنے جا سکے۔

''سچ سومی آپا! بہت غضب کی پکچر ہے۔ دیکھیے نا!'' بلاکہ'' بھی یہاں سے زیادہ دور نہیں اور پھر آپ نے ابھی تک کوئی بنگالی پکچر بھی نہیں دیکھی۔''

''دیکھیں گے بھئی!''...... وہ اسے ٹالتے ہوئے بولی۔

ماں نے اسے آواز دی۔ وہ اٹھنے لگی۔ جب بینو اس کا آنچل تھام کر کھڑا ہو گیا۔

''پلیز سومی آپا! وعدہ کرو نا میرے ساتھ!''...... وہ یوں منا رہا تھا کہ اسے بے اختیار ہی اس پر پیار آ گیا، اس کے گال پر بوسہ دیتے ہوئے بولی...... ''چلو ٹھیک ہے! چلیں گے۔''

ماں سرمئی ساڑھی میں بلاشبہ بہت خوبصورت نظر آ رہی تھیں۔ پلنگ پر کاسنی جامدانی کی ساڑھی پڑی تھی۔ ہم رنگ پیٹی کوٹ اور بلاؤز انہوں نے اسے پکڑاتے ہوئے کہا...... ''تم یہ پہنو! پھر میں تمہارے ساڑھی باندھتی ہوں۔''

''ماں!''...... وہ گھبرائی...... ''مجھ سے چلا نہیں جائے گا۔''

''کاہے کو گھبراتی ہو؟ میں جو تمہارے ساتھ ہوں۔''

بلاؤز کی فٹنگ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئیں...... ''بس اندازاً سی ڈالا تھا۔ شکر ہے تمہارے بالکل ٹھیک آیا ہے۔''

انہوں نے اس کی ساڑھی باندھی، کٹے بالوں کو نئے انداز میں ترتیب دیا اور پھر اس کی پیشانی چومتے ہوئے بولیں...... ''دیکھوتو! میری بیٹی کتنی سندر لگتی ہے۔''

بینو نے اسے دیکھا تو جے سومی آپا! کا نعرہ بلند کیا۔

شام ڈھل رہی تھی جب وہ اولڈ ڈھاکہ میں بلال حسن سٹریٹ میں داخل ہوئیں۔ کاروباری لوگوں کا گھرجان پڑتا تھا۔ اچھے متمول لوگ تھے، لڑکی ایڈن گرلز کالج کی گریجوایٹ تھی۔ لڑکے والے آج لڑکی کو دیکھنے آرہے تھے۔

چار بجے وہ لوگ آئے۔ ان کے ساتھ کوئی عورت نہیں تھی۔ وہ حیران ہوئی...... ''اب کیا یہ لڑکی کو دیکھیں گے؟''

اور پھر یوں ہوا کہ بیش قیمت روپہلی ساڑھی میں ملبوس میک اپ سے سجی سجائی لڑکی گھونگھٹ نکالے اس کمرے میں لائی گئی۔ جہاں وہ سب تھے۔ وہ نصف دائرے کی ترتیب میں بیٹھے تھے۔ اور لڑکا قدرے آگے کو نکلا ہوا تھا۔ وہ یہ سب بہت دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ ماں نے اسے دھیمی آواز میں لڑکے کے باپ، چچا اور بڑے بھائی کے متعلق بتایا تھا۔

تب لڑکی کا گھونگھٹ اُلٹایا گیا اور سب نے اسے بغور دیکھنا شروع کیا۔ اس کے بال دیکھے، ہاتھ پاؤں کا جائزہ لیا گیا۔

اُف خدایا! اس کا دل گھبرایا۔ یہ کیا زمانہ جاہلیت کی رسموں سے کچھ کم ہے؟ اچھی بھلی صورت کی یہ لڑکی، اس وقت بالکل اس گائے کی طرح ہے جسے بیوپاری ٹھونک بجا کر دیکھتا ہے۔

لڑکے کے بڑے بھائی نے گانے اور ناچ کے بارے میں پوچھا تھا، جس کا جواب اثبات میں دیا گیا۔

تب ان ڈھیر سارے لوگوں کے درمیان اس چمکتی ساڑھی والی سانولی رنگت کی لڑکی نے بڑے پیار سے ستار پکڑا تھا۔ اس کی آنکھیں ہنوز بند تھیں۔ اور لانبی لانبی انگلیاں ستار کے تاروں پر مہارت سے چلنی شروع ہوئی تھیں۔ اس کی آواز میں ہلکی ہلکی لرزش تھی۔ ٹیوب کی

دودھیا روشنی میں سازو آواز کا یہ طلسم بہت ہی دلفریب تھا۔

یہ گیت جو وہ گا رہی ہے یقیناً ٹیگور کا ہے۔ اس نے سوچا اور ماں سے یہ جاننے پر کہ واقعی یہ رابندر روشنگیت ہے، وہ خود سے بولی تھی...... میں تو ابھی اس قابل نہیں کہ گیتوں کی یہ زبان سمجھ کر خود پر واضح کر سکوں کہ نذرل اور ٹیگور کے گیتوں میں کیا واضح فرق ہے پر پھر بھی میں سمجھ جاتی ہوں۔ یہ کیا بات ہے؟ شاید ان گیتوں کا تعلق روح سے بہت زیادہ ہے۔

ان کے چہروں پر خوشی تھی اور انہوں نے اس کی آواز کو سراہا تھا۔ تب لڑکے کے بھائی نے لڑکے کو کیس دیا۔ اس نے طلائی انگوٹھی نکال کر لڑکی کی انگلی میں پہنائی اور مبارک سلامت کا غلغلہ بلند ہوا۔

واپسی پر وہ ماں سے بولی تھی...... ''ماں یہ رسم تو اچھی نہیں۔ بالکل بکاؤ مال والی بات ہے۔ پسند آیا تو ٹھیک وگرنہ نہیں۔ لڑکی کی عزت نفس پر یہ کتنی کاری ضرب ہے۔''

''ایسا تو ہر جگہ ہوتا ہے بیٹے! تمہارے علاقوں میں عورتیں دیکھنے آتی ہیں پر یہاں مردوں کا رواج ہے۔''...... وہ رسان سے بولی تھیں۔

''میں تو اس کے بھی خلاف ہوں۔''

اور اس کی بچگانہ بات پر ماں نے بس مسکرانا ضروری سمجھا تھا۔

اور گھر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے ساڑھی کا آنچل اپنے شانوں پر ٹھیک کیا اور گھوم کر ماں کو دیکھتے ہوئے بولی...... ''میں تو بہت خوفزدہ تھی پر خیریت ہی رہی۔''

''باندھتی رہو گی تو یہ جھجک بھی ختم ہو جائے گی۔''

بابا اسے دیکھ کر مسکرائے اور شفقت سے بولے...... ''سومی بیٹا تو آج بہت سندر نظر آ رہا ہے۔''

وہ سرخ ہوئی۔ بُلبل اور فخر نے بھی دل کھول کر تعریف کی اور تاکید کی کہ اب اسے ہمیشہ ساڑھی پہننی چاہیے۔

بینو نے انہیں بتا دیا تھا کہ وہ سومی آپا کے ساتھ ''نیلے آکاش تلے'' دیکھنے جائے گا اور اب وہ دونوں بھی تیار بیٹھے تھے۔

ماں نے کہا بھی کہ اب رات زیادہ ہوگئی ہے، اسے کہاں گھسیٹتے پھرو گے؟ پر بینو تنک کر بولا...... ''چار گھنٹوں سے میں آپ کے انتظار میں پڑا سوکھ رہا ہوں اور اب آپ کہہ رہی ہیں جانے دو! مَیں تو ضرور جاؤں گا۔ بلا کہ کون سا یہاں سے دور ہے۔''

''چلو بھئی چلو! یوں تم نے میری کوئی جان چھوڑنی ہے۔''

پروردگار اس زمین کا خمیر تُو نے کس سحر سے اٹھایا ہے۔ جو ٹکڑا قدموں تلے آتا ہے وہ آنکھوں کے سامنے حسن و رعنائی کی دنیا لا کھڑا کرتا ہے۔ ان پوکھروں میں کھلنے والے کنول اپنی خوبصورتی اور سرخی میں گلابوں کو مات کرتے ہیں۔ ناریل اور سپاری کے درختوں کے جُھنڈ تلے بانس کی جھونپڑیاں اور ان پہ لہراتی بل کھاتی مختلف رنگوں کی بیلیں ان گھروں کو کس قدر آرٹسٹک بناتی ہیں۔

کوئی ان گھنگھور گھٹاؤں کو دیکھے! جو بال کھولے آسمان کے سینے کو سیاہ کیے، کیسے کیسے ان فضاؤں اور ہواؤں میں جادو جگاتی ہیں۔ کرنل عثمانی! تم نے سچ کہا تھا یہاں بے کراں بہتے پانیوں پر مانجھیوں کے نغمے تیرتے ہیں اور بانسری کی مدھر تانیں کانوں میں رس گھولتی ہیں۔

اس کے ہاتھ وھیل پر بے جان سے پڑے تھے اور وہ جیپ کے فرنٹ شیشے سے باہر فضا کو محویت سے دیکھ رہا تھا جہاں سورج ڈوب رہا تھا۔

وہ Exercise پر لکشم پوسٹ پر پچھلے پندرہ دنوں سے گیا ہوا تھا اور اب ہفتہ بھر کے لیے کومیلا چھاؤنی واپس آیا تھا۔

اس نے جیپ کو سٹارٹ کیا، اس حسین منظر پر الوداعی نظر ڈالی اور بازار کی جانب مڑ گیا۔
اس کا ارادہ رس ملائی خریدنے کا تھا۔

اس کی تیز رفتار جیپ ایک دھچکے سے رکی۔ اس نے بے حد حیرت سے اس سرو قد حسین لڑکی کو دیکھا۔ جس کی چال میں غضب کا بانکپن تھا۔ وہ اودی رنگ کی ساڑھی کا آنچل اہتمام سے سر پر ڈالے، ہاتھ میں جلتے دِیوں کا تھال پکڑے سڑک پار کر رہی تھی۔

اس نے بھی ذرا رک کر ایک نگاہ غلط انداز اپنے سے کچھ فاصلے پر کھڑی جیپ میں بیٹھے وجیہہ نوجوان پر ڈالی اور آگے بڑھ گئی۔

''یہ کسی اونچے ہندو گھرانے کی لڑکی معلوم ہوتی ہے، پر کس کی؟''......اس نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔

اور سونے تک کے وقفے میں وہ اودی ساڑھی والی کئی بار اس کی آنکھوں کے سامنے آئی۔

وہ پہلی نظر میں محبت کا قائل نہ تھا۔ پر پھر بھی اس کے متعلق سوچے چلا جا رہا تھا۔

اور دو ایک دن بعد اس کے متعلق حاصل کردہ معلومات سے اس نے یہ جانا کہ وہ کومیلا کے چوٹی کے امیر دت خاندان کی اکلوتی بیٹی ہے۔ شیلانگ کے کانونٹ میں سینئر کیمبرج کی طالبہ ہے اور چھٹیاں گزارنے اپنی راجباڑی آئی ہوئی ہے۔

''ہوں!''......اس نے ہنکارہ بھرا تھا۔ تبھی اس کے چہرے پر بے حد اونچے اور امیر گھرانے کی شان کا پرتو بکھرا ہوا تھا۔

اس نے اس خاندان سے ملاقات کرنے کا ذریعہ بھی ڈھونڈ لیا پر جس شام وہ ملاقات کے لیے جانے والا تھا، اس صبح اسے بارڈر پر بھیج دیا گیا۔

پھر وہ اسے دوبارہ نہ دیکھ سکا۔ جلد ہی اس کی مغربی پاکستان ٹرانسفر ہو گئی۔

اپنی بڑی شادی شدہ بہنوں سے وہ ایک بار بات کر بیٹھا، انہوں نے اس کا خوب مذاق اڑایا۔ ایک نے کہا......''ظفر بھائی! بنگال کا جادو آپ پر بھی چل گیا ہے۔''

اس کی جلد شادی کا کوئی سوال نہ تھا، وہ گھر بھر کا مالی سربراہ تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد اپنے پانچ بہن بھائیوں کو پال رہا تھا۔ بہنیں بیاہ کر اپنے اپنے گھر بار کی ہوگئی تھیں اور بھائی ابھی زیرِ تعلیم تھے۔ ماں بوڑھی اور اعصابی مریض تھی۔

وہ دوبارہ بنگال جانا چاہتا تھا، اس سلسلے میں اس نے تگ ودو بھی کی اور کامیاب ہوا۔

اور پھر ایک سہ پہر وہ میجر کے رینک کے ساتھ تیج گاؤں کے ہوائی اڈے پر اترا۔ اس نے مسکرا کر اپنے دائیں بائیں دیکھا...... ''اس سرزمین سے مجھے پیار ہے اور میری روح یہاں کھنچ آتی ہے۔''...... وہ اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔

اپنی پہلی فرصت میں اس نے کومیلا کا چکر لگایا۔ کومیلا چھاؤنی کے بریگیڈ کمانڈر سے، اس دت فیملی کے بارے میں جو معلومات ملیں وہ بہت حوصلہ شکن تھیں۔ پر جانے پھر بھی کیا بات تھی کہ وہ اس کے اندر سے باہر نہ آسکی۔

وہ جب کبھی اپنی سفید مزدا میں جناح ایونیو، بیت المکرّم، نیو کیمپس یا نیو مارکیٹ کے سامنے سے گزرتا تو رنگ برنگی ساڑھیوں میں لپٹی عورتوں اور لڑکیوں کو ایک نظر ضرور دیکھتا اور سادہ نقوش اور سانولے رنگوں کو دیکھ کر جھنجلا جاتا۔ یقیناً وہ اس حسین لڑکی کو دیکھنے کا آرزومند تھا۔

ایک اتوار جب وہ مگ بازار میں اپنے ایک سویلین بنگالی دوست کے ہاں سے دوپہر کا کھانا کھا کر واپس آرہا تھا، اسے وہ دکھائی دی۔ وہ جو اس کے دماغ میں کہیں چپکی بیٹھی تھی۔ وہ جسے دیکھتے ہی اس کا دل بے طرح دھڑکا تھا۔ وہی تھی وہ، اودھی ساڑھی اور دِیوں کا تھال ہاتھ میں پکڑے، بانکی چال اور نشیلی آنکھوں والی۔ بھلا کیسے نہ پہچانتا! وہ سائیکل رکشے والے سے لڑ رہی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں خمار تھا اور چہرہ دمکتا تھا۔

اس نے کار روکی اور باہر نکلا، اب وہ شرمیلا سا لیفٹیننٹ نہیں تھا۔ وقت اور تجربے نے اسے خود اعتمادی دی تھی۔

وہ اس کے قریب گیا اور انگریزی میں بولا۔

''اگر میں آپ کو پہچاننے میں غلطی پر نہیں تو آپ یقیناً ڈاکٹر دت کی پوتی ہیں۔''

اس نے حیرت سے اس لمبے چوڑے خوبصورت شخص کو دیکھا اور سوچا۔

''یہ کون ہے؟ پنجابی یا پٹھان معلوم ہوتا ہے، یہ مجھے کیسے جانتا ہے؟''

اس کی آنکھوں میں حیرت اور تجسس کی علامات پا کر وہ رسان سے بولا۔

''آپ کے دادا سے کومیلا میں میری ملاقات تھی، وہیں میں نے آپ کو دیکھا تھا۔ میں میجر ہوں، میرا نام مرزا ظفر ولایت ہے۔''

میجر کا سن کر وہ چونکی، اسے کچھ خوف بھی محسوس ہوا...... ''کیا معلوم انٹیلی جنس کا ہو۔''

اس نے نہایت کڑی نظروں سے اُسے گھورا۔ اس کی نکھری آنکھوں میں شرافت تھی اور چہرے پر سادگی۔

وہ تیز طرار تھی، پارٹی پالیٹکس کا ایک اہم ستون سمجھی جاتی تھی۔ انسانوں کو پرکھنے اور چہرے مہروں سے جانچنے کا تھوڑا سا تجربہ بھی رکھتی تھی۔

''انٹیلی جنس کا ہوتا تو یوں اپنے میجر ہونے کا اعلان کرتا؟ میں بھی احمق ہوں۔''

اور جب اس نے کہا...... ''آپ کو شاید سواری کی ضرورت ہے، آیئے میں آپ کو ڈراپ کیے دیتا ہوں۔''

اس نے اس کی پیشکش کے جواب میں چند ثانیے خاموشی سے کچھ سوچا اور پھر چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی اس کے ساتھ چل دی۔

وہ گاڑی چلاتا رہا۔ اس دوران اس نے اس کے مضامین کے بارے میں پوچھا، پڑھائی کے متعلق مختصر سی باتیں کیں اور جب وہ ریس کورس روڈ پر سے گزر رہے تھے۔ اس نے کہا کہ مجھے شاہ باغ میں ایک ضروری کام ہے، کیا پانچ منٹ کی تاخیر گوارہ کریں گی؟

''ضرور! مجھے ایسی کوئی جلدی نہیں۔'' اس نے خاصی شگفتگی سے کہا۔

اس نے گاڑی شاہ باغ ہوٹل کے یارڈ میں روکی اور دوسری منزل میں گیا جہاں اس نے اپنے ویسٹ پاکستانی کاروباری دوست کو میس ڈنر کے لیے مدعو کیا۔

تب مرمریں فرش پر چلتے ہوئے اس نے چائے کا ایک کپ پینے کی اسے آفر کی۔

اور جب وہ چائے کے چھوٹے چھوٹے سِپ لے رہی تھی، اس نے سنا وہ کہہ رہا تھا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔

تیز دھوپ والی سہ پہر کو وہ اس کی گاڑی سے اتر کر رقیہ ہال کے گیٹ میں داخل ہوئی۔

'میں خوب سمجھتی ہوں ان مسلمان فوجی افسروں کو...... یہ یہاں دل بہلاوے کے بہانے تلاش کرتے پھرتے ہیں اور یہ تو نرا اُلو لگتا ہے مجھے'......اس نے مہندی کی باڑ سے پتے توڑ توڑ کر زمین پر پھینکتے ہوئے خود سے کہا تھا۔

تب وہ خود سے بولی تھی۔

'تو کیا میں اب وہ کردار ادا کرنے والی ہوں جو یہودی عورتوں نے 67ء کی جنگ میں مصری فوجی افسروں کے ساتھ کیا۔'

وہ برآمدے میں کھڑی آنکھوں میں عمیق سوچیں لیے ہوا میں اڑتے پرندوں کو دیکھتی رہی۔

'مجھے اپنے دھرم اور دیش کے لیے ایسا ضرور کرنا ہوگا۔'

وہ چہرے پر پختہ عزم لیے کمرے میں آ گئی...... اس نے چہک چہک کر خوشی کی یہ خبر اپنے معتمد ساتھیوں کو بھی بتائی کہ عقل کا کورا ایک فوجی افسر اس کے چنگل میں پھنس گیا ہے۔

پر چند ہی ملاقاتوں نے اس عقل کے کورے فوجی افسر کی شخصیت کے دلفریب پہلو اس کے سامنے لا کھڑے کیے یوں کہ وہ ہکا بکا رہ گئی۔ اور وہ جو اس سے فوجی راز حاصل کرنے چلی تھی، دل کی بیماری میں مبتلا ہو بیٹھی۔

واقعہ یہ تھا کہ وہ اس میدان کی ناتجربہ کار کھلاڑی تھی۔ شیلانگ اور دارجلنگ کے کونوں

میں تعلیم پانے کے باوجود اس میں مشرقی خو بو تھی۔ منفی سیاست میں ملوث ہونے کے باوجود اس میں انسانیت کی اعلیٰ اقدار سے متاثر ہونے کا جذبہ بھی موجود تھا۔

اس فوجی افسر نے اپنے بارے میں کسی بھی حسنِ ظن سے کام نہیں لیا نہایت بے تکلفی سے اسے اپنے سارے خاندان کے حالات بتا دیئے۔ اس نے ثمینہ نہ کی۔ اس کے کندھوں پر گھر بھر کی ذمہ داریاں ہیں اور وہ انہیں پورا کرنے میں سرگرم ہے۔ اور وہ اس کی سادگی اور سچائی سے متاثر ہوتی گئی۔

وہ ایک ٹھوس کردار کا نوجوان تھا۔ اسے اپنے جذبات پر مکمل اعتماد تھا۔ اس لڑکی سے وہ کسی بھی تفریحی نقطہ نظر سے نہیں ملا تھا۔ وہ اسے پسند تھی اور اپنی اس پسند کی تقدیس کا اسے بے حد احترام تھا۔ رقیہ ہال سے اسے پک کرنے اور شام ڈھلے ڈراپ کرنے تک کے وقفے میں وہ حد درجہ شائستگی سے اس سے برتاؤ کرتا۔ سکون سے کار ڈرائیو کرتا، خوش دلی سے ہنستا اور اسے ہنساتا۔ میٹھی نظروں سے اسے دیکھتا۔ یہ تیس بتیس سالہ نوجوان اسے بہت بھایا تھا۔

اور ایک بار جب اس نے یہ کہا...... ''ظفر! میں نے فوجی میس کبھی نہیں دیکھا، میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔''

اس کی اس خواہش پر وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر اس کی طرف دیکھتا ہوا گھمبیر آواز میں بولا...... ''تمہیں معلوم نہیں! نوجوان فوجی افسروں کی زندگی مشقتوں اور قہقہوں کا نام ہے۔ یہ ہشاش بشاش سے نوعمر چھوکرے جذبوں کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہوتے، میں تمہیں میس لے کر جاؤں گا تو بے شمار آنکھیں تمہیں جس انداز میں دیکھیں گی میں انہیں بخوبی سمجھتا ہوں۔ تمہارے لیے میرے جذبات اروما! جس قدر سچائی اور خلوص پر مبنی ہیں وہ ان نظروں کو ہرگز پسند نہیں کرتے۔ تمہارے لیے گرل فرینڈ کا لفظ میرے لیے ایک تازیانہ ہے۔ امید ہے! تم مجھے اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے معاف کر دوگی۔''

ریڈیو کا سوئچ دائیں بائیں یوں ہی گھماتے ہوئے اس نے اس کی یہ باتیں سنیں اور

دنگ رہ گئی۔ جذبات کا لاوا اپھٹا اور دماغ کو ہلا کر رکھ گیا۔ پیار کا یہ انداز انوکھا تھا۔ ایسی چاہت بھی ہوتی ہے؟ اس نے سوچا۔

وہ کسی قدر لاابالی لڑکی تھی۔ کار میں بیٹھتی تو اپنا بیگ، گاگلز اور کتابوں کو لاپروائی سے اِدھر اُدھر پھینک دیتی۔ پر وہ اس کی ایک ایک چیز کا دھیان رکھتا...... ''اروما! تمہاری گاگلز...... یہ اپنا بیگ لو...... یہ تمہاری نوٹ بکس ہیں۔ انہیں بھولے جارہی ہو'' ...... جب وہ اتر کر جانے لگتی تو وہ اسے ایک ایک چیز پکڑاتا۔

اور اس دن جب وہ اس کے ساتھ ساور پکنک کے لیے گئی، وہاں پہلی بار اس پر انکشاف ہوا کہ جلتے دِیوں کا تھال ہاتھ میں پکڑے پوجا کے لیے مندر کی طرف جاتی وہ لڑکی اس کی آنکھوں میں مدتوں سے چھپی بیٹھی تھی۔

''ہوں!'' ......اس نے بے حد حیرت سے اس کی اس بات کو سنا۔

''اروما! مجھے بنگال کی سرزمین سے بہت پیار ہے۔''

درد کی ایک ٹیس اٹھی۔ اسے سرزمین سے پیار ہے اور میری قوم اسے یہاں سے نکالنے کے درپے ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور آواز بوجھل سی ہوگئی۔

اس نے محسوس کیا اور بولا...... ''کیا بات ہے اروما؟''

''کچھ بھی نہیں!'' ......اس نے بات بدلی...... ''یہاں کے حالات کا خیال آ گیا تھا۔''

دوپہر کے کھانے کے بعد اسے اپنا جسم ٹوٹتا محسوس ہوا، آنکھیں بھی تپنے لگیں۔ اس نے دیکھا تو فکرمندی سے بولا۔

''اروما! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔''

''نہیں! مجھے بخار محسوس ہو رہا ہے۔''

اور اتنے طویل دنوں کی ملاقات میں پہلی بار اس نے اس کی کلائی اور پیشانی کو چھوا اور گھبرا کر بولا...... ''بخار تو تیز ہے۔ چلو ریسٹ ہاؤس میں تھوڑی دیر لیٹو، میں تمہیں چائے اور

گولی دیتا، ہوں انشاء اللہ! ٹھیک ہو جاؤ گی۔‘‘

پر بخار تیز ہوتا گیا اور جب وہ اسے واپس ڈھاکا لا رہا تھا، اس نے فیصلہ کن آواز میں کہا...... ’’میں تمھیں اس حالت میں کبھی رقیہ ہال نہیں چھوڑوں گا۔‘‘

’’ظفر! تم ہماری پرووسٹ کو نہیں جانتے، مجھے ہال سے نکال دیں گی۔ رات باہر رہنے کے لیے لوکل گارجین کا لیٹر دینا پڑتا ہے۔‘‘

’’جہنم میں جائیں تمہاری پرووسٹ! میں خود سارا انتظام کرلوں گا۔ تمہارا لوکل گارجین مَیں ہوں۔‘‘

وہ اسے اپنے ایک گہرے شادی شدہ دوست ڈاکٹر میجر محمود کے گھر لے گیا۔ شام کو اس نے اس کی پرووسٹ کو لیٹر دیا۔ دو دن اور ایک رات اس کے پاس گزار کر جب وہ واپس ہال پہنچی تو ذہنی اور جسمانی دونوں طرح سے نڈھال تھی۔

وہ بازی بری طرح ہار گئی تھی۔

سفید اجلے بستر پر لیٹی وہ سوچوں کے بھنور میں پھنسی رہی اور جب اگلے دن اس کے آنے کی اسے اطلاع ملی تو اس نے ہندو دھرم، منفی سیاست، زبان، کلچر اور تہذیب سبھی کو ایک پوٹلی میں باندھا اور پاؤں کی زبردست ٹھوکر سے اسے فضا میں اچھال دیا۔ وہ اوندھے منہ کہاں کہاں گرے؟ اس نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔

خوبصورت ساڑھی میں جب وہ اس کے سامنے آئی تو اس کی آنکھوں میں محبت کی چمک دیکھ کر اس نے اپنے آپ سے کہا تھا...... ’’یہ چمک میری زندگی ہے۔ اس پر میں نے اپنا سب کچھ قربان کیا۔ بھگوان! تُو اسے ہمیشہ میرے لیے قائم رکھنا۔‘‘

ساڑھی کا آنچل سنبھالتی وہ اس کے ساتھ بیٹھی۔ چندرا کے ریسٹ ہاؤس میں پہنچ کر جب اس نے اسے اناس کھلانے کے لیے سامان نکالا تو وہ رو دی۔ اس کے شانوں پر سر رکھ کر اس نے ہچکیوں کے ساتھ اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ اس نے اوپر اٹھایا اور اس کے آنسو صاف کرتا ہوا بولا......

''تم کچھ بھی کرتی رہو مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں، میں نے تمہیں اپنا جیون سمجھا ہے۔''

گھٹی گھٹی سسکیاں جب ختم ہوگئیں تو بھیگی پلکیں اٹھا کر اس نے چندرا کے حسین مناظر کو دیکھا......''ان سے اب میرا تعلق ختم ہوا۔''

''ظفر! میں نے ہر چیز تمہارے خلوص اور بے پایاں پیار پر قربان کر دی ہے۔ جیون کے کسی بھی مرحلے پر مجھے یہ احساس نہ ہو کہ میں نے زندگی کی بساط پر کوئی غلطی کی ہے۔''......اور اس نے جواب دینے کی بجائے اپنے شانے پر پڑے اس کے خوبصورت سر پر عقیدت اور محبت سے بوسہ دینا بے حد ضروری سمجھا۔

رات ہال میں پھر زبردست ہنگامہ رہا۔

بائیں بازو کی روس وچین نواز دونوں پارٹیوں نے شہید مینار کے سامنے مشعلوں کی روشنی میں فلک شگاف نعرے لگائے۔ یہ نعرے دل شکن ہی نہیں، توہین آمیز بھی تھے۔ آڈیٹوریم میں مغربی پاکستان کے خلاف زہر اگلنے والی تقاریر کا سلسلہ جاری تھا۔

''اے اللہ! کس منحوس گھڑی میں یہاں چلی آئی...... یہ اپنا ملک ہے؟''

اس وقت اسے شدید خواہش ہوئی کہ اگر کوئی اسے اختیار دے دے تو وہ ان چیختی چلاتی لڑکیوں کے گلے میں کوئی ایسی چیز ٹھونس دے کہ ان کی کان پھاڑتی یہ آوازیں اندر ہی گھٹ کر رہ جائیں۔

''میں بھی پاگل ہوگئی ہوں!''...... وہ اپنی اس جذباتی خواہش پر خود ہی بولی...... ''طوفانوں کے دھاروں کو بھی کبھی یوں روکا گیا ہے؟''

اور آج اس سے کھانا بھی نہ کھایا گیا تھا۔ روشن اور جہاں آراء ابھی ابھی اوپر گئی تھیں۔ وہ بوجھل سی اپنے کمرے میں آ گئی...... لیلیٰ اور مینی دونوں بہنیں پچھلے برآمدے کی دیوار پر لٹکی

نیچے جھانک رہی تھیں۔ وہ بھی ان کے پاس آ گئی۔ آنرز بلڈنگ کے سامنے بیس پچیس لڑکیوں کا گروپ ''آ گیا رو دفعہ بھنتی ہوبے...... بھنتی ہوبے'' کی صدائیں لگا رہا تھا۔ اس نے بغور دیکھا۔ چند ہندو لڑکیاں نظر آئیں۔ لیلیٰ سے معلوم ہوا کہ یہ سارا گروپ ہی ان کا ہے۔

''میرے اللہ! اس قوم کو ہدایت دے!''...... اس نے ٹھنڈی سانس بھری، مڑی اور اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ لیلیٰ نے اپنا ٹیبل لیمپ جلایا اور پڑھنے کے لیے بیٹھی پر اتنے شور و غل میں پڑھنا ممکن ہی نہ تھا۔ تلملاتے ہوئے وہ کھڑی ہوگئی۔ فسٹ کلاس سٹوڈنٹ تھی، اپنی اس پوزیشن کو برقرار رکھنے کے لیے اسے سخت محنت کرنا پڑتی تھی۔ پر آج کی رات معلوم ہوتا تھا اس ہنگامے کی نذر ہو جائے گی۔

خود سے کڑھتے ہوئے وہ برآمدے اور کمرے میں چکر کاٹتی رہی اور جب اس کا ضبط جواب دے گیا تو وہ اپنی بہن کی طرف دیکھ کر، غصے سے چیخی۔ چلاتے ہوئے۔ یہ کہ انہیں یہ نہیں ملا، وہ نہیں ملا۔ میں کہتی ہوں انہیں یہ سب کیسے ملے؟ ہنگامے ان کی زندگی ہیں، یونیورسٹی بند کرانا ان کے لیے مذاق ہے، کلاسوں کا بائیکاٹ ان کے لیے کھیل ہے۔ سال کے گیارہ مہینے اس ہلے گلے میں گزرتے ہیں۔ یہ یونیورسٹی نہیں یہ تو سیاست کا اکھاڑا ہے جہاں یہ لوگ طالب علموں کے روپ میں ان مکار اور خود غرض لیڈروں کی سیاست کو کندھا دیتے ہیں''...... وہ کتابوں کو اٹھا اٹھا کر پٹختی رہی اور پھر باہر نکل گئی۔

جب وہ دوبارہ اندر آئی، سمعیہ علی چائے پی رہی تھی...... ''آؤ لیلیٰ! چائے پیو''...... اس نے کپ اس کی طرف بڑھایا۔

اور چائے پیتے ہوئے ان کے درمیان بہت سی تلخ و شیریں باتیں ہوئیں۔ لیلیٰ ایک محب وطن لڑکی تھی جسے ہندوؤں سے سخت نفرت تھی...... ''یہ قوم اتنی عیار اور چالاک ہے کہ تمہیں اس کا اندازہ ہی نہیں''...... وہ بولی تھی۔

کمرہ نمبر آٹھ کی رانی، لیلیٰ سے اپنا پیٹی کوٹ مانگنے آئی تھی۔ دروازے میں ٹھہر کر اس

نیچے جھانک رہی تھیں۔ وہ بھی ان کے پاس آ گئی۔ آرٹز بلڈنگ کے سامنے بیس پچیس لڑکیوں کا گروپ ''آ گیا رو دفعہ بھنتی ہوبے...... بھنتی ہوبے'' کی صدائیں لگا رہا تھا۔ اس نے بغور دیکھا۔ چند ہندو لڑکیاں نظر آئیں۔ لیلیٰ سے معلوم ہوا کہ یہ سارا گروپ ہی ان کا ہے۔

''میرے اللہ! اس قوم کو ہدایت دے!''...... اس نے ٹھنڈی سانس بھری، مڑی اور اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ لیلیٰ نے اپنا ٹیبل لیمپ جلایا اور پڑھنے کے لیے بیٹھی پر اتنے شور و غل میں پڑھنا ممکن ہی نہ تھا۔ تلملاتے ہوئے وہ کھڑی ہو گئی۔ فسٹ کلاس سٹوڈنٹ تھی، اپنی اس پوزیشن کو برقرار رکھنے کے لیے اسے سخت محنت کرنا پڑتی تھی۔ پر آج کی رات معلوم ہوتا تھا اس ہنگامے کی نذر ہو جائے گی۔

خود سے کڑھتے ہوئے وہ برآمدے اور کمرے میں چکر کاٹتی رہی اور جب اس کا ضبط جواب دے گیا تو وہ اپنی بہن کی طرف دیکھ کر، غصے سے چیخی۔ چلاتے ہوئے۔ یہ کہ انہیں یہ نہیں ملا، وہ نہیں ملا۔ میں کہتی ہوں انہیں یہ سب کیسے ملے؟ ہنگامے ان کی زندگی ہیں، یونیورسٹی بند کرانا ان کے لیے مذاق ہے، کلاسوں کا بائیکاٹ ان کے لیے کھیل ہے۔ سال کے گیارہ مہینے اس ہلے گلے میں گزرتے ہیں۔ یہ یونیورسٹی نہیں یہ تو سیاست کا اکھاڑا ہے جہاں یہ لوگ طالب علموں کے روپ میں ان مکار اور خود غرض لیڈروں کی سیاست کو کندھا دیتے ہیں''...... وہ کتابوں کو اٹھا کر پٹختی رہی اور پھر باہر نکل گئی۔

جب وہ دوبارہ اندر آئی، سمعیہ علی چائے پی رہی تھی...... ''آؤ لیلیٰ! چائے پیو''...... اس نے کپ اس کی طرف بڑھایا۔

اور چائے پیتے ہوئے ان کے درمیان بہت سی تلخ و شیریں باتیں ہوئیں۔ لیلیٰ ایک محب وطن لڑکی تھی جسے ہندوؤں سے سخت نفرت تھی...... ''یہ قوم اتنی عیار اور چالاک ہے کہ تمہیں اس کا اندازہ ہی نہیں''...... وہ بولی تھی۔

کمرہ نمبر آٹھ کی رانی، لیلیٰ سے اپنا پیٹی کوٹ مانگنے آئی تھی۔ دروازے میں ٹھہر کر اس

وہ لیٹ گئی۔ صبح اس نے دیکھا شہید مینار پر سیاہ پرچم لہرا رہا تھا اور جب وہ یونیورسٹی گئی، بارش ہو رہی تھی اور لڑکیاں بڑے بڑے بینر اٹھائے جلوس میں مارچ کر رہی تھیں۔ وہ بھیگنے اور پھسلنے کے ہر غم سے بے نیاز تھیں۔...... ''اللہ توبہ! کتنی جنونی ہیں یہ، ہے ان میں لڑکیوں والی کوئی بات......''

بہت سے نئے پوسٹروں کو اس نے دیکھا اور افسوس کیا، کاش! اسے بنگالی پڑھنی آتی پر اگلے لمحے اس نے سوچا...... ''یہ اچھا ہی ہے جو میں اسے پڑھ نہیں سکتی و گرنہ تکلیف بڑھنی ہی تھی۔''

ذکیہ اور ریبا اسے وہیں ملیں۔ وہ مدھو بیتا کینٹین میں چائے پینے جا رہی تھیں۔ آج کلاسیں ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ یومِ مطالبات جو تھا۔

کینٹین میں بہت رش تھا۔ لمبی لمبی قلموں والے لڑکے، لڑکیوں کے ساتھ میزوں پر بیٹھے جوشیلی باتیں کر رہے تھے۔ دبلی پتلی لڑکیاں اوولٹین ملی چائے پیتے ہوئے ان کی باتیں سن رہی تھیں۔

کہیں لڑکے ٹولیوں میں بٹے کھڑے تھے، کہیں کہیں لڑکیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔

باہر ترئی کے زرد پھول گر رہے تھے۔ پبلک لائبریری کی عظیم الشان عمارت درختوں کے جھنڈ میں گھری کھڑی تھی اور ٹپ ٹپ برستی بارش کے شور میں بھی نعروں کی آواز بہت نمایاں تھی۔

اس کے سامنے والی میز پر بیٹھا ایک ٹولہ ایپسو کے مینن گروپ کو لعن طعن کر رہا تھا۔ وہ بس خالی خالی نظروں سے ان سب کو دیکھتے ہوئے خون کے گھونٹ پیتی رہی۔

ذکیہ اور ریبا اسے کہہ رہی تھیں کہ انہیں آج ٹی۔ ایس۔ سی کھانا کھانے کے لیے نہیں جانا چاہیے۔ کیا پتہ کوئی ہنگامہ ہو جائے۔ اس کا جی چاہا وہ ان سے پوچھے کہ وہ اتنی اچھی اور محبت کرنے والی لڑکیاں ہیں، کس دیوانے نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ سیاست میں ٹانگ اڑائیں اور وہ یہ بات ان سے پوچھ ہی بیٹھی۔ ذکیہ ہنسی اور بولی...... ''تم نہیں جانتی ہو، پوربو بنگال کے باسی بہت مضطرب ہیں۔ انقلاب آنے والا ہے اور ہم اس میں نمایاں کردار ادا کرنا چاہتے ہیں۔''

''بیڑا غرق ہو تمہارا!''...... اس نے دل میں کہا اور کپ پر جھک گئی۔ یوں یہ لڑکیاں بہت ہی اچھی تھیں پر ستیاناس ہو اِس بھونڈی سیاست کا جس نے اچھی بھلی لڑکیوں کا پکڑ کر پڑا کر دیا تھا۔

تین بجے اسے سائیکالوجی ڈیپارٹمنٹ جانا تھا۔ جہاں آرا نے اسے سبجیکٹ بنانا تھا پر ابھی تو بہت وقت تھا...... اس نے گھڑی دیکھ کر سوچا اور بیرے کو تین مغلئی پراٹھوں کا آرڈر دے دیا۔

''چند غیر ملکی لڑکے لڑکیاں تمہاری تلاش میں ہیں''...... سرجیت نے اسے وہاں یوں اطمینان سے بیٹھے دیکھ کر اطلاع دی۔

اردن کا وہ جواں سال عبداللہ اور اس کے ساتھی تھائی لینڈ اور نیپال کی لڑکیاں جن سے وہ گزشتہ دنوں ''پوربانی'' میں ملی تھی، اس سے یہ دریافت کرنے آئے تھے کہ وہ مغربی پاکستان کے کسی بھی علاقائی رقص کا مظاہرہ کرسکتی ہے۔

''کیا بات ہے ہماری!''...... وہ طنز سے خود سے مخاطب ہوئی...... ''اب تو رقص و سرود کی محفلوں میں بھی ہماری مانگ ہے۔''

''نہیں بھئی! میں اس فن میں قطعی کوری ہوں''...... اس نے بہت شائستگی سے معذرت کر دی۔

ایک بجے وہ ٹی۔ ایس۔ سی چلی گئی، اس کے اصرار پر بھی ذکیہ اور ریبا نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ وہ بہت ہنسی تھی...... ''واہ بھئی! یہ انقلاب کیا تم اسی حوصلے کے بل بوتے پر لا رہی ہو؟''

آج بریانی کا دن تھا تو وہ کیسے ہال جا کر ٹھنڈا بھات اور نرا میش کھاتی...... ''کچھ نہیں ہو گا''...... اس نے چلتے چلتے سوچا۔ پرچی کٹا، پلاسٹک کے برتن اٹھا وہ اپنی باری کے لیے قطار میں جا کھڑی ہوئی۔

ٹرے میں بریانی لے کر اس نے ابھی ایک قدم ہی اٹھایا ہو گا۔ جب باہر سے دھم دھم

چیخنے چنگھاڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔ لڑکیاں باہر نکل بھاگیں، ٹرے میز پر پٹختے ہوئے اس نے دروازے کا رُخ کیا۔ پر لڑکوں کے غول کے غول دروازے میں سے اندر آنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں لمبے لمبے چاقو چھریاں دیکھ کر اسے یوں لگا جیسے بس اب وہ یہاں سے زندہ بچ کر نہ جاسکے گی۔ قیامت شاید یہی ہے۔ میزیں کرسیاں ایک دوسرے پر پھینکی جانے لگیں، وہ کسے مدد کو پکارے؟ کسے کہے کہ اسے یہاں سے نکالے۔ انسان حیوان بن گئے ہیں، ایک لڑکے کے چاقو لگا اور وہ تیورا کے گرا۔ سرخ خون سے اس کی قمیص لال ہوگئی۔ اس کی چیخیں نکل گئیں۔ پر وہاں کون سنتا۔ مار دھاڑ، پکڑ دھکڑ کا ایک ہولناک سماں تھا۔

''خدایا! میں یہاں سے کیسے نکلوں؟ کوئی چاقو لہراتا ہوا میری طرف آ گیا تو بس میرا خاتمہ۔ یا اللہ! یہ کیسی بے کسی کی موت ہوگی۔''

وہ کونے میں رکھے کولر کی آڑ میں ہوگئی۔ اس کی آنکھیں پھٹیں جب اس نے اس معصوم اور کم عمر لڑکے کو چار لڑکوں کے نرغے میں دیکھا۔ اس لڑکے کو جسے اس نے ایک شام برٹش کونسل کی لائبریری میں پڑھتے دیکھا اور اس کی معصوم صورت سے متاثر ہو کر پوچھا تھا کہ وہ کس کلاس میں ہے؟ اس نے شائستگی سے اسے بتایا کہ وہ آئی۔ ایس۔ سی کے سال دوم میں ہے...... ''تو گویا تم انجینئر بنو گے''...... وہ مسکرائی۔

ہرگز نہیں! میں پاکستان آرمی جوائن کروں گا۔ میں عزیز بھٹی بننا چاہتا ہوں...... یہ باعزم آواز تھی۔

اس شہر میں جہاں ہر وقت رم جھم بارش برستی تھی اور ٹھنڈی ہوائیں چلتی تھیں پر وہ ان سے لطف نہیں اٹھاتی تھی۔ اس کے لیے تو ہر سو جون کی تپتی لوئیں تھیں۔ بس کبھی کبھی ایک ٹھنڈا خوشگوار جھونکا اس لُو کی تمازت کم کر جاتا اور ٹنگائیل کا یہ یتیم لڑکا اسے اس سمے اپنے دل کے بہت قریب محسوس ہوا تھا۔ اتنا کہ جی بے اختیار اسے چھوٹے بھائی کی طرح پیار کرنے کو چاہا تھا۔

تب اس نے بہت سی باتیں اس سے کی تھیں۔ ملکی سیاست سیاسی پارٹیوں کی ریشہ

دوانیاں، اپنے بارے میں بھی اس نے بتایا۔ اس کی ماں زولوجی میں ایم۔ ایس۔ سی ہیں اور مرزا پور کالج میں پڑھاتی ہیں۔ وہ چار بہن بھائی ہیں۔ وہ سب سے بڑا ہے۔ اس کا باپ پی۔ آئی۔ اے ہیلی کوپٹر کریش میں چند سال پہلے مارا گیا تھا۔ اسے اس ملک سے بے پناہ محبت ہے، اس کی بقا اس کی زندگی ہے۔

یہ کون سا جذبہ تھا، اس نے اس پس منظر میں جھانکنا ضروری سمجھا تھا۔

اور تب اسے معلوم ہوا کہ اس کے ماں باپ نے تشکیل پاکستان کے لیے بہت کام کیا تھا۔

''آپا! وہ دکھی لہجے میں بولا تھا'' ...... ماں بتاتی ہیں پوربو بنگال کیا تھا۔ غربت اور افلاس کی ایک تصویر، جہاں ہندو راج تھا اور مسلمان اس کے ظلم کی چکی میں پستا تھا۔ اب تو ملک اتنا ترقی کر رہا ہے، یہ اندھے لوگ ہیں جو ہندوؤں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔

کتنی دیر وہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے تھے۔ خیالات کی ہم آہنگی کتنی بڑی چیز ہے۔ فاصلے آنِ واحد میں مٹ جاتے ہیں۔

اور آج وہ ان کے نرغے میں تھا۔ سمعیہ علی کی آنکھوں کے سامنے تو موت ناچی تھی، قیامت کے ان لمحات میں اس نے خود سے کہا تھا...... ''یہ مستقبل کا عزیز بھٹی ہے، اسے اس ملک کی سالمیت و بقا کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھانی ہے۔ اس کے خون کا ایک ایک قطرہ قیمتی ہے اگر اسے کچھ ہو گیا تو'' ......

تب اس کے دل سے طوفان اٹھا جو سارے خوف و خطر کو جانے کہاں اُڑا لے گیا۔ اس نے کرسی اٹھائی اور بجلی کی سی پھرتی سے ان کے سروں پر پہنچ گئی...... ''اسے چھوڑو!'' ...... اس نے کرسی اس لڑکے کی پشت پر ماری جو اسے گردن سے پکڑے ہوئے تھا۔

اور اسے نہایت حیرت سے دیکھا گیا۔ ایک لڑکی مقابلے پر تھی، یہ نرالی بات تھی، بہت انہونی چیز تھی۔

''پنجابی! پنجابی!'' ...... ایک لڑکے نے کہا۔ یہ اس کے متعلق کہا جا رہا تھا۔ اقبال کے

ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ نیم بے ہوش سا تھا۔ بھاگتے ہوئے ایک لڑکے کے عقب میں ایک چاقو آیا اور وہ سمعیہ علی کے بائیں بازو میں جسے وہ اقبال کے گرد حصار بنائے ہوئے تھی، پیوست ہوگیا۔ تازہ گرم خون نکلنے لگا۔

دو لڑکے سہم کر پیچھے ہٹ گئے، وہ اسے گھسیٹ کر ایک طرف لانے لگی جب تین اور آگے بڑھے...... ''ہم اسے ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔''

''اور میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی!''...... وہ دھاڑی۔ اس وقت نہ تو اسے اپنی تکلیف کا احساس تھا اور نہ ہی مزید چوٹ کھانے کا کوئی خوف...... وہ زندگی اور موت کے ہر احساس سے بے نیاز ہو چکی تھی تبھی لڑکوں کا ایک اور گروہ چیختا چلاتا اندر آیا، ان میں سے چند ایک نے انہیں دیکھا۔ چند لڑکے ان کی طرف لپکے اور ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ یہ اقبال کی پارٹی معلوم ہوتی تھی۔ ایک لڑکے نے اس کے بازو کو اپنے ہاتھ میں پکڑ کر چاقو کھینچا۔ دوسرے نے اقبال کو اپنی پیٹھ پر اٹھایا اور اس سے بولا...... ''آپ باہر بھاگیے۔''

وہ سرپٹ بھاگی۔ اس کے بازو سے خون بہہ بہہ کر کپڑوں کو رنگتا جا رہا تھا۔ پولیس کے ایک دستے کو اس نے داہنے گیٹ سے اندر داخل ہوتے دیکھا۔ وہ فوراً بائیں ہاتھ کے گیٹ سے دوسری سڑک پر نکل گئی۔ راہگیروں نے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔ چلتی گاڑیوں میں بیٹھے لوگوں کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی گئیں...... وہ سڑک کراس کر رہی تھی جب ایک گاڑی عین اس کے سامنے رکی۔ رک کر اس نے دیکھا، یہ ماں کا لیڈر بیٹا تھا۔ وہ بہت سُرعت سے باہر نکلا تھا۔ وہ دوپٹے کے بغیر تھی۔ اس کے بازو سے خون نکل رہا تھا۔ اس کے کپڑے خون آلود تھے۔

اور ایک لمحہ توقف کیے بغیر اس نے اسے بازو سے پکڑا۔ دروازہ کھولا، اگلی سیٹ پر بٹھایا اور کار چلا دی۔

ٹی۔ ایس۔ سی میں ہونے والے جھگڑے کی خبر اسے فوراً پہنچ گئی تھی۔ کیونکہ اس کی پارٹی کے چند جوشیلے لڑکے اسلامی چھاترو شنگھو سے الجھ پڑے تھے اور وہ ان ہی لوگوں کے لیے فی

الفور اس طرف آیا تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ لڑکی اجنبی ہونے کے ناطے پٹ گئی ہے۔

یوں اسے اس حال میں دیکھ کر قلبی دکھ ہوا تھا۔ پر ایک بات پر وہ حیران تھا...... ''اس درجہ ضبط و حوصلہ کی مالک ہے یہ'' ......اس کی آنکھ سے ایک قطرہ بھی آنسو نہ نکلا تھا۔ البتہ اس کی رنگت بہت پیلی پڑ رہی تھی۔

اس نے گاڑی ایک دکان کے آگے روکی اور اسے اتار کر اندر لے گیا۔ نوجوان ڈاکٹر نے بغور اس کا معائنہ کیا اور بولا...... ''شبلی! یہ بہتر ہوگا اگر تم انہیں ڈاکٹر پنی کے پاس لے جاؤ، بہت سی نسیں کٹ گئی ہیں۔

درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور وہ کمال ضبط سے انہیں برداشت کر رہی تھی۔

معمر ڈاکٹر نے اس کے زخموں کو دھویا، انہیں احتیاط سے سِیا اور مرہم پٹی کے بعد اس سے پوچھا۔

''اب تم مجھے بتاؤ، یہ سب کچھ کیسے ہوا؟''

''ڈاکٹر، مجھے کسی نے زخمی نہیں کیا۔ میں نے تو قوم کے اس بیٹے کو بچانے کی کوشش کی تھی جسے اس ملک کی سالمیت سے پیار ہے۔''

اس کی سسکیاں نکل گئیں...... ''کون جانتا ہے، بیوہ ماں کا وہ بیٹا کل پاکستان کے لیے کتنا قابل فخر ہو۔''

تب ڈاکٹر کا مشفقانہ ہاتھ اس کی پشت پر آیا اور وہ بہت گھمبیر آواز میں بولا...... ''حوصلہ شکن حالات سے گھبرایا نہیں کرتے بیٹے! ایسے طوفان ہر قوم کی زندگی میں آتے ہیں۔ پاکستان ایک ایسی اکائی ہے جو انشاء اللہ! کبھی تقسیم نہیں ہوگی۔''

اس کی آنکھیں ابھی تک گیلی تھیں۔ اگلی سیٹ پر وہ دروازے کے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی ایک اچٹتی سی نظر اس پر بھی ڈال لیتی جس کے چہرے پر اتھاہ سنجیدگی تھی اور جو بہت احتیاط سے کار چلا رہا تھا۔

گیروے رنگ کی اولڈ ڈھاکا یونیورسٹی میں اِکا دُکا لڑکے گھومتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ اس نے ایک ٹک اونچے محرابوں اور شہ نشینوں والی اس عظیم عمارت کو دیکھا اور سوچا کہ یہ طرزِ تعمیر اب فرسودہ خیال کیا جاتا ہے۔ پر جانے کیوں اس میں اپنائیت کا گہرا احساس ملتا ہے۔ شاید ہمارے ذہن ترقی کے راستے پر ابھی تک پیچھے ہیں۔

ہائیکورٹ کی دودھیا بلڈنگ اور اس کے کشادہ سبز لان، سڑک کے کنارے اُگے درختوں پر اسوک کے نارنجی سرخ پھول، ڈوبتے سورج کی روشنی میں خوبصورت نظر آرہے تھے۔ ٹی۔ ایس۔ سی کے پاس سے کار گزری تو اس نے جھرجھری لی۔

سامنے رقیہ ہال تھا۔ کار کی رفتار دھیمی ہو رہی تھی...... ''یہ کیا مجھے یہاں اتار دے گا۔ پر اس حال میں میرا وہاں جانا کسی بھی طرح مناسب نہیں۔ لڑکیاں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھیں گی

اور جو کہیں پروؤسٹ آپا نے دیکھ لیا تو بس ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔ کیا یہ نہیں جانتا کہ ڈاکٹر نے آرام کے لیے کہا تھا اور ہال میں آرام مشکل ہے۔

پر میں یہ سب کچھ کیوں سوچ رہی ہوں؟ اجنبی جگہوں پر اجنبی لوگوں سے اگر اتنی اپنائیت اور خلوص مل جائے تو کوئی گھر کیسے یاد کرے۔

پر انسانیت کا بھی تو کچھ تقاضا ہے...... اس کے اندر سے جانے کس نے کہا تھا...... ''انسانیت؟ ارے اس مادی دور میں اسے کون پوچھتا ہے؟ اور پھر اس نوجوان سے مزید انسانیت کی توقع، جسے ہم سے بلاوجہ ہی نفرت ہے۔ قطعی فضول ہے۔ یہ جو اس نے تین چار گھنٹے مجھ پر ضائع کیے ہیں، بہت کافی ہیں۔ اس عرصے میں جانے اسے کتنی تقریریں کرنا تھیں اور مزید کتنے لوگوں کے ذہنوں میں زہر بھرنا تھا۔''

کار عین گیٹ کے سامنے رکی، اس نے باہر نکلنے کے لیے دروازہ کھولنا چاہا جب ہی وہ بولا، ''میں آپ کو یہاں اتارنے کے لیے نہیں رکا''...... اس کا لہجہ نرم اور ملائم تھا...... ''میں ماں کو تکلیف نہیں دینا چاہتی''...... اس نے تکلف کرنا شاید ضروری سمجھا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اس کا دل اس وقت اس کے قرب کا شدید متمنی تھا۔

مزید کوئی جواب دینے کی بجائے اس نے گیٹ پر کھڑے چوکیدار کو اشارے سے بلایا۔ وہ اچھی طرح پہچانتا تھا، بھاگا بھاگا آیا۔ رقعہ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا...... ''اسے مسز اختر امام کو دینا اور رجسٹر تھوڑی دیر کے لیے میرے پاس لے آؤ۔ رجسٹر آیا، اس نے دستخط کیے اور کار چلا دی۔

اور اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ پبلک لائبریری کے گیٹ سے نکلتی ہوئی لڑکیوں نے اسے بہت گھور گھور کر دیکھا تھا۔ سائیکل رکشاؤں والوں کی آنکھیں پھٹی پڑ رہی تھیں۔

اور زینے کے چھٹے ڈنڈے پر جب اسے اپنی ٹانگیں پھولتی محسوس ہوئیں تو اس نے سوچا کہ ابھی تو ایک تلہ کی پہلی سیڑھی ہے، میں چوتھی منزل پر کیسے پہنچوں گی؟

پھر بھی وہ ہمت سے چڑھتی گئی۔ پردوتلے میں جا کر ہانپ گئی، پیچھے قدموں کی چاپ بھی رک گئی تھی۔اس نے لمبا سانس بھرا۔

تب وہ آگے بڑھا اور اپنا بازو اس کی طرف بڑھایا......اس نے اک ذرا آنکھیں اوپر اٹھائیں، اس سے دوقدم اوپر پونے چھ فٹ کی دراز قامت پر خاموش آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں۔وہ کانپی اور بغیر کچھ کہے اس کے بڑھے بازو کو تھامتے ہوئے اس پر جھک گئی۔

گھنے سیاہ بالوں سے بھرا مضبوط بازو، اس کا سارا جسم پگھلتا جا رہا تھا اور وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں اس پل صراط پر سے پھسل ہی نہ جائے۔

اور گھنٹی کی آواز پر جب خادمہ نے دروازہ کھولا تو اس پر نظر پڑتے ہی چیخی۔ ماں نے تو اسے اس حال میں دیکھ کر سر پیٹ لیا۔ بُلبل اور فخر دیکھ کر سمجھ گئے کہ باہر جس لڑکی کی دلیری کے چرچے ہیں وہ ان کی سومی آپا ہے۔

اسے کمرے تک پہنچانے اور لٹانے تک کے وقفے میں ماں نے ان طالب علموں اور سیاستدانوں کو ہزاروں کوسنے دے ڈالے تھے۔ کہتے ہیں کہ پڑھ لکھ کر آدمی انسان بنتا ہے، اس کا ذہن روشن ہوتا ہے۔ یہ انسان بن رہے ہیں؟ یہ روشنی ہو رہی ہے؟ میں کہتی ہوں کہ ایسی روشنی سے اندھیرا اچھا نہیں ہے؟

ماں زار زار رو رہی تھی...... ''ماں!'' ......اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر ہونٹوں اور آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا...... ''میں ٹھیک ہوں آپ فکر نہ کریں۔''

اسے گرم دودھ پلایا گیا اور کچھ دیر بعد جب اس نے اپنے اردگرد دیکھا، وہ نہیں تھا۔

اس کے اس کارنامے پر وہ سب بہت خوش تھے۔ مستقبل کا عزیز بھٹی بُلبل کا کلاس فیلو تھا...... ''سومی آپا! وہ جینئس لڑکا ہے، اسے اگر کچھ ہو جاتا تو فی الواقع یہ ایک عظیم نقصان ہوتا۔''

اگلا سارا دن اس نے اس رہنما لیڈر کی ایک جھلک نہ دیکھی...... ''وہ اپنا فرض پورا کر گیا ہے'' ......اس نے کسی قدر طنز سے سوچا۔ پر شام کو بلبل کو بینو کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ کسی اہم

مقدمے کے سلسلے میں کھلنا چلا گیا ہے۔

اور جب چار دن بعد وہ ہال واپس آئی تب اسے معلوم ہوا کہ وہ واقعی ہیروئن بن گئی ہے۔ بینو، بلبل اور فخر اُسے کہتے...... ''سومی آپا! آپ بہت مشہور ہوگئیں ہیں۔'' تو وہ یونہی اسے مذاق سمجھتی۔ پر یہ حقیقت تھی جس کا احساس اسے اب ہوا تھا۔ لڑکیوں نے رک کر اسے دیکھا تھا۔ بہت سے اجنبی چہروں نے اس کی خیریت دریافت کی تھی۔ پرووسٹ نے ذاتی طور پر اسے بلا کر پوچھا اور آئندہ کے لیے محتاط رہنے کی بھی تاکید کی۔ ایسٹ ہاؤس کی سُپر اور ہاؤس ٹیوٹر دونوں نے اسے باری باری بلا کر خیریت دریافت کی تھی۔

اور یونیورسٹی میں وہ جدھر سے گزری، لڑکوں کی ٹولیوں میں سرگوشیاں ہوئیں۔ ہر آنکھ نے اس کا بغور مشاہدہ کیا۔ تب اس نے بے اختیار سوچا تھا۔ یہ اچھا ہی ہوا تھوڑا خون بہا پر نام بہت پایا۔ یوں تو شاید ہمیں کم ہی لوگ جانتے پر ہماری اس شہ زوری نے ہمیں بہت شہرت دی۔ واقعی! مولا جو کرتا ہے، بہتر کرتا ہے۔

ہیڈ سر بہت نیک دل انسان تھا، کافی دیر اسے پوچھتے رہے۔ ذکیہ اور ربا تو رو دیں......

''ہم نے جو کہا تھا ئی۔ ایس۔ سی مت جاؤ۔''

''پر تم! پنجابی ضدی لڑکی، بھلا ہماری مانتیں!''

''ارے! تو کوئی نقصان ہوا؟ دیکھو تو ہر جگہ ہمارے ہی چرچے ہیں۔'' وہ خوشدلی سے مسکرا دی۔

بے ہنگم شور تھا وہاں، کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ بنگلہ اونچے اونچے بولی جا رہی تھی۔ ڈھاکا ہولی کراس کونونٹ کی پڑھی ہوئی وہ لڑکی اس ماحول کی بالکل عادی نہ تھی۔ اس نے دونوں بازوؤں کو ہوا میں اکتاہٹ کے انداز میں اوپر کیا ڈھاکا یونیورسٹی کے سٹوڈنٹس ہیں یا کسی چنڈو خانے میں تاڑی چرس پیتے ہوئے اُچکے بدمعاش؟ اے! مجھے کیا کسی باؤلے کتے نے کاٹا ہے جو میں اس واہیات پالیٹیکس کے پھڈے میں ٹانگ اڑاتی پھروں۔''

وہ آنرز کے لیے ابھی ایک ماہ پیشتر یونیورسٹی آئی تھی۔ سیاست سے اسے دلچسپی ضرور تھی۔ پر ایسی بھونڈی سیاست سے نہیں۔ اس کا باپ کرنافلی پیپر مل میں بہت اونچے عہدے پر تھا۔ کھری بنگالن ہونے کے باوجود وہ اپنے باپ کے اس نظریئے سے پوری طرح متفق تھی کہ بنگالی قوم فتنہ پسند ہے، تعمیر کی نسبت تخریب کی طرف زیادہ مائل ہے اور کام کرنے کی بجائے کاہل بیٹھ کر کھانا اور شور شرابا کرنا پسند کرتی ہے۔

یہاں وہ اپنی ایک دوست کے ساتھ محض تفریح کے طور پر آئی تھی۔ یوں ہی رنگ ڈھنگ دیکھنے کا ارادہ تھا۔ کچھ شبلی کے بارے میں بہت سی افسانوی باتیں سن رکھی تھیں۔ اسے بھی دیکھنے

کا شوق تھا پر اس قدر شور و غوغا تھا یہاں کہ اس نے گھبرا کر اپنی ساتھی سے کہا تھا...... ''بی مجھے بخشو! میں تو چلی، تم ہی ان بکھیڑوں میں پڑو۔''

اس کی ساتھی نے اس کا ہاتھ پکڑا، اسے زبردستی بٹھالیا۔

''بیٹھو رینو! ابھی تھوڑی دیر اور، اکٹھے چلیں گے۔'' اور مجبوراً اسے بیٹھنا پڑا۔

تذکرہ اس لڑکی کا ہو رہا تھا جس نے کل کے جھگڑے میں بہت ہی انوکھی حرکت کی تھی۔ چند لڑکوں نے کہا...... ''سوچنے کی بات یہ ہے کہ اقبال کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے جس نے اسے اتنا بڑا خطرہ مول لینے پر مجبور کر دیا۔ کیا وہ اس کی پارٹی کو سپورٹ کرتی ہے؟''

چند دل جلی لڑکیاں جن میں سلمیٰ بھی شامل تھی کہہ رہی تھیں...... ''شبلی آستین میں سانپ پال رہا ہے۔'' زخمی ہو گئی تھی تو مرنے دیا ہوتا۔ کار میں بٹھا کر چہیتی کی مرہم پٹی کروانے کی کیا ضرورت تھی؟''...... ایک نے بیچ میں سے لقمہ دیا ''بقول تمہارے چہیتی جو ہے تو اس کا خون بہتا گوارہ ہوتا۔''

دبلے پتلے سریش نے کہا...... ''پر پنجاب کی اس چھوکری کا حوصلہ غضب کا تھا۔ کس دلیری سے مقابلے پر ڈٹی رہی؟''

ابو منصور باہر سے آیا، وہ پریشان سا تھا کہ شبلی خود تو کھلنا چلا گیا ہے اور مصیبت اس کے لیے چھوڑ گیا ہے۔ کل جن تین لڑکوں کی گرفتاری ہوئی تھی ان کی ضمانت ابھی تک نہ ہو سکی تھی۔ پولیس کی رپٹ بھی کسی حد تک ان کے خلاف ہی تھی۔ کہہ کر تو گیا تھا کہ اس نے آئی جی کو ٹیلی فون کر دیا ہے پر ہوا تو ابھی تک کچھ بھی نہیں۔''

ابو عبداللہ نے اسے تسلی دی کہ...... ''فکر کی کوئی بات نہیں حالات ہماری موافقت میں ہیں، گورنر سے ابھی میری بات ہوئی ہے۔''

''حیرت ہے بھئی مجھے اس بات پر''...... ریحانہ بولی...... ''کہ ان مغربی پاکستان والوں کو کیسی سریش لگی ہے کہ لوگ ان کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔ نیپ کی جنرل سیکرٹری اردو مادت

کو دیکھو کیسی دیوانی ہو رہی ہے۔ اس گورے چٹے فوجی کے پیچھے۔''

حبیب اللہ وہیں لڑکیوں کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ تلخی سے بولا...... ''خدا بچائے تم لڑکیوں کے سکینڈلز سے، بلاوجہ ہی طوفان کھڑے کر دیتی ہو۔ ہمیں مغربی پاکستان سے نفرت ہے، درست ہے۔ ہم اس سے اپنا دامن چھڑانا چاہتے ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے پر اب اس کا یہ ہرگز مقصد نہیں کہ اس لڑکی سے جو وہاں سے آئی ہوئی ہے، انسانیت سوز برتاؤ کیا جائے۔ وہ شلپی کے خاندان کی ذمہ داری ہے۔ اس نے اگر اسے لفٹ دی یا وہ اس کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا تو یہ اس کا فرض تھا۔''

اور ہولی کراس کونونٹ کی فارغ التحصیل اس لڑکی نے یہ ساری باتیں سنیں اور خود سے بولی...... ''یہ کیا بکواس کرتا ہے۔ علیحدگی چاہیے انہیں مغربی پاکستان سے۔ کیوں! کھانے کو ملنا شروع ہو گیا ہے اس لیے؟''

وہ کھڑی ہو گئی، اس نے اپنا رخ، اس لڑکے کی طرف کیا اور اونچی آواز میں پوچھا کہ کیا تم یہ واضح کرو گے کہ تم مغربی پاکستان سے کیوں علیحدہ ہونا چاہتے ہو؟

حبیب اللہ اور اس کے بیشتر ساتھیوں نے حیرت سے اس نئی شکل کو دیکھا جو اکڑی کھڑی تھی۔ اس نے طنز سے کہا...... ''مغربی پاکستانی ایجنٹ کتنے پیسے ملتے ہیں؟''

وہ کون سا کم تھی، اسی تیکھے لہجے میں بولی...... ''پہلے اپنے بارے میں تو بتاؤ۔ ہندوستان سے تمہارا معاملہ کتنے میں طے ہوا ہے!''

ساتھی لڑکی نے پکڑ کر بٹھانا چاہا پر وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر بولی...... ''بات کرنے دو کیا کھا جائے گا مجھے؟''

لہجہ دونوں کا تلخ تھا، آوازیں بھی اونچی تھیں۔ چند ایک نے دونوں کے درمیان گفتگو سنی تھی اور تین چار دوسرے جو کچھ فاصلے پر تھے ان کے اطوار سمجھ گئے تھے کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ اتنا جو شور مچا ہوا تھا، ختم ہو گیا تھا۔

ایک معتدل مزاج لڑکے نے سکون سے اٹھ کر کہا...... ''اس میں لڑنے جھگڑنے کی کوئی بات نہیں، میں تمہیں چند باتیں بتاتا ہوں جو علیحدگی کی متقاضی ہیں۔ سیاسی محرومی، معاشی تفاوت، لسانی وتہذیبی اختلافات، جغرافیائی فاصلے۔''

''یہ سب تمہارے اپنے ذہنوں کی اختراعات ہیں'' ...... وہ غصے سے بولی ''اصل میں تم لوگ فرسٹریشن کا شکار ہو۔ کرنے کو کام نہیں ہے۔ کاہلی سر پر سوار ہے۔ خون میں فتنہ پروری ہے۔ ایسے میں ہڑتالیں، جلاؤ گھیراؤ، مار دھاڑ، چھ نکات اور گیارہ نکات واقعی بہت اچھے لگتے ہیں۔''

ابوعبداللہ جو کچھ دیر سے ان کی باتیں غور سے سن رہا تھا، چیخ اٹھا...... ''تم یہاں کیا لینے آئی ہو؟ نکل جاؤ یہاں سے! کون لایا تھا اِسے؟''

اس پر ملکہ نے کہا...... ''ریش کیوں ہو رہے ہو ابوعبداللہ؟ مخالفت برداشت کرنا سیکھو۔ میری دوست ہے اور میں ہی اسے لائی تھی۔''

وہ تو دھب دھب کرتی کبھی کی باہر نکل گئی تھی۔ بس ملکہ ہی ابوعبداللہ اور دوسرے لوگوں سے الجھتی رہی، یوں اسے اس پر بھی غصہ تھا کہ کیا ضرورت تھی ایسی باتیں کرنے کی؟ یہ لوگ چاہے اس کے پیچھے ہی پڑ جائیں۔

یہاں وہ ایک اہم مقدمے کے سلسلے میں آیا تھا۔ اس وقت جب کا تک کا چاند رات کو جوان بنا رہا تھا اور ٹھنڈی خوشگوار ہوا درختوں سے ٹکراتی پھر رہی تھی، وہ کھلنا کے اس ریسٹ ہاؤس میں کیس کی مختلف گتھیاں سلجھانے میں مگن تھا۔

یہ ''ڈومریا'' کی ایک غریب دکھیاری کا مقدمہ تھا جس کی جوان بیٹی مہینوں پہلے اغوا کرلی گئی تھی۔ اس نے عدالت کے دروازے پر دستک دی۔ متعلقہ افسروں سے ملنے کی کوشش کی پر اس کو کون سنتا! جس کے پلے پیسا نہ تھا اور جس کی رسائی کسی بڑے افسر تک نہ تھی اور پھر اس کا مقابلہ گاؤں کے مکھیا سے تھا۔ کس کا دماغ خراب تھا جو اس کی چیخ پکار پر کان دھرتا؟

تب کسی نے اسے اس رہنما کے پاس جانے کو کہا تھا اور یوں وہ ڈھاکا پہنچ گئی۔ اپنی ساری بپتا سنا چکنے کے بعد وہ بولی...... ''میرے پاس تجھے دینے کو کچھ نہیں ہے، میں یہ بتا دینا چاہتی ہوں۔'' اور اس نے خود سے کہا تھا کہ تمہیں یہ بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ میری آنکھیں تمہارے ننگے پاؤں، پھٹی ساڑھی اور چہرے پر برستی غربت کے علاوہ تمہارے دل میں چھپے سارے زخموں کو دیکھ رہی ہیں۔ گھبراؤ نہیں! میں اسے اس کے انجام تک ضرور پہنچاؤں گا۔''

اس نے اس کے ناتواں شانے پر ہاتھ رکھا۔

اور اسے کیس کے لیے بہت محنت کرنا پڑی تھی۔ وہ قانون کے ان تمام محافظوں کو بھی لپیٹ میں لے آیا تھا۔ جو قانون شکن ثابت ہوئے تھے۔

اس نے فائل بند کر دی۔ تیز چائے اور سگریٹوں سے وہ اپنے حلق میں بہت کڑواہٹ محسوس کر رہا تھا اور یوں بھی مسلسل کام سے ذہن بھاری ہو رہا تھا۔ آنکھیں موند کر وہ ستانے لگا۔ ایسے تھکن کے سمے اسے گٹار کی شدید ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ افسوس کر رہا تھا کہ اسے ساتھ کیوں نہ اٹھا لایا...... "یہ موسیقی بھی کیا چیز ہے! تھکی ماندی روح کو کیسے سکون دیتی ہے۔"

اور تبھی اسے اس آرڈیننس کا خیال آیا جو مغربی پاکستان میں رقص و موسیقی پر پابندی کے سلسلے میں نافذ کیا گیا تھا۔ اس کے لبوں پر بڑی زہریلی ہنسی آئی...... "یہ کراموپل حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں اور اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ یہ روح کی غذا ہے جس کے بغیر ذہنی بالیدگی رک جاتی ہے اور وہ فن مر جاتا ہے جس کا ثقافت سے گہرا تعلق ہے۔"

اور سوچوں کا یہ سلسلہ اس لڑکی پر آ کر رکا جو اس کے گھر کے کسی کمرے میں شاید اس وقت گہری نیند سو رہی تھی۔ تمہارا دل لرزتا ہے جب ہمارے باغیانہ خیالات تم پر ظاہر ہوتے ہیں۔ تم کانپ جاتی ہو جب ہم علیحدگی کا نعرہ لگاتے ہیں۔ یہ سب تمہیں سمجھانا بہت مشکل ہے کہ ایسا کیونکر ہوا۔ ہمیں بھی اس ملک سے محبت تھی۔ اس کے حصول کے لیے ہم نے بھی سر دھڑ کی بازی لگائی تھی۔ اس سے ہمیں بھی بہت توقعات تھیں پر حالات نے ہمیں صرف یہ سمجھایا کہ ہم سازشی ہیں۔ اول درجے کے کاہل، نااہل اور نکمے ہیں، ہم میں تعصب اور بُغض کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ہم شورش پسند اور فتنہ پرور ہیں۔ ہماری وفاداریاں کبھی اس ملک کے ساتھ نہیں ہو سکتیں۔

وہ بہت دور نکل گیا تھا۔ جہاں ہر طرف نفرت کی آگ دہک رہی تھی۔ کھُلنا میں وہ چھ دن رہا، اس دوران اس نے پارٹی کے ارکان سے بھی ملاقات کی۔ چند دن وہ سلہٹ رہا، واپسی

پر کو میلا ٹھہرا۔

اور جب اس شام دھوپ عظیم پور اسٹیٹ کی عمارتوں سے نیچے اتر رہی تھی وہ گھر میں داخل ہوا۔ ماں کو باورچی خانے میں دیکھ کر وہ وہیں چلا آیا۔ جھک کر اس نے ان کے قدموں کو چھوا۔ ماں اس کے شانے پر بوسہ دیتے ہوئے بولیں...... ''تم نے اس بار بہت دن لگائے، کیا کہیں اور چلے گئے تھے؟''

''ماں! سلہٹ کی طرف نکل گیا تھا۔''

گھر میں بہت شور تھا۔ بلند ترین آواز اس لڑکی کی تھی جو کسی بات پر الجھ رہی تھی...... ''تو یہ ابھی تک یہیں ہے۔'' اس نے سوچا۔ ماں پیاجو بنا رہی تھی۔ وہ ان کے پاس بیٹھ گیا...... ''تم اپنے بابا کے پاس چلو میں چائے لے کر آتی ہوں۔'' انہوں نے کہا۔

''اکٹھے چلیں گے''...... وہ بولا اور ان سے باتیں کرنے لگا۔

تبھی وہ بہت زور سے چیخی تھی۔ بابا کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔ ماں مسکرا کر بولیں تھیں۔

''آج تمہارے بابا کے ساتھ دو پیسہ پوائنٹ پر رمی کھیل رہی ہے، چار روپے جیت گئی ہے۔''

''اس کے بازو کا کیا حال ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''اب تو خاصہ آرام ہے۔''

''ڈاکٹر کے پاس جاتی ہے کیا؟''

''جاتی ہی ہوگی۔ یہاں سے تو چار دن بعد ہی چلی گئی تھی، آج ہی آئی ہے۔''

''ماں! میں نے بابا کو ہرا دیا''...... دھم دھم وہ بھاگتی باورچی خانے میں آئی اور ماں کی پشت سے چپک گئی...... ''تم نے یہ نہیں بتایا کہ آج کیا پکا ئیں؟'' ماں نے اسے بہت محبت سے دیکھا تھا۔

''آج چکن کڑی''...... اس نے پاپڑ اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

جب دفعتاً اس نے اسے دیکھا۔ اپنے مخصوص لباس میں وہ گھٹنوں کو دونوں ہاتھوں میں

لیے بیٹھا تھا۔ ایک پل کے لیے اس کے چہرے کا رنگ بدلا اور اس کا دل بے طرح دھڑکا۔

پر جلد ہی وہ خود پر قابو پاتے ہوئے ماں کو بتانے لگی کہ وہ بابا سے پانچ روپے جیت گئی ہے۔ اب اس کی مٹھائی منگوائیں گے۔ بینو اور فخر بھی وہاں آ گئے۔ بینو کا کہنا تھا کہ اس نے بہت فاؤل کھیلا اور بابا کی آنکھوں میں دھول ڈال کر جیتی ہے۔

''چلو چلو بڑے آئے ایماندار کہیں کے! تم بھی تو وہیں تھے۔'' وہ تنک کر بولی۔

''میرے ساتھ کھیلا ہوتا...... پچاس روپے ہارتیں۔''

''واہ واہ! کیا کہنے تمہارے اسپورٹ مین کے۔''

''تو ہو جائے پھر مقابلہ رات کو!''

''نہ بابا! باز آئی میں تم تو فاؤل میں مجھ سے چار ہاتھ آگے ہو۔''

''جواب نہیں سومی آپا آپ کا!'' فخر نے اس کے کندھے تھپتھپائے۔

خادمہ نے ٹرالی میں چیزیں رکھیں اور وہ سب کمرے میں آ گئے۔ بابا نے ملازم لڑکے کو مٹھائی لانے کے لیے کہا۔ جب وہ بولا...... ''میں کومیلا سے رس ملائی لایا ہوں، جاؤ بینو! کار میں سے نکال لاؤ۔''

''آہا شلپی بھیا کی جے!''...... بینو خوشی سے چلایا۔ ''کومیلا کی رس ملائی، مزہ آ گیا۔'' اور کھا کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ واقعی بہت لذیذ تھی۔

انہیں یہاں آئے چند دن ہی گزرے تھے۔ یہ نئی جگہ جسے انہوں نے قطعاً پسند نہ کیا تھا۔ جہاں سردی اور گرمی دونوں بہت شدید تھیں پر پروموشن کا چکر جو تھا۔

اور آج صبح سے وہ اپنے بستر میں تھے۔ ان پر کاہلی سوار تھی۔ باہر نکلنے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر بک شیلف سے انہوں نے گیتا نجلی نکالی اور پڑھنے لگے۔

تب وہ تیز چال چلتی کمرے میں آئی اور انہیں یوں کتاب میں ڈوبے دیکھ کر بولی......

''اٹھنا نہیں کیا آج اور ہاں میس کب جائیں گے؟''

انہوں نے بہت مدھم آواز میں کہا تھا...... ''زہرت! جی چاہتا ہے بس لیٹا رہوں۔''

''بھئی بس! اب اٹھیے غسل کے لیے پانی تیار ہے۔ سارا دن کیا لیٹے رہنا ہے۔''

گزرتے دنوں کے ساتھ ساتھ یہ سخت ہوتی جا رہی ہے۔ اب اسے میرا یوں لیٹے رہنا بہت ناگوار گزر رہا ہے اور میں جانتا ہوں کہ کیوں؟ اس کی صفائی جو ادھوری رہ جائے گی۔ انہوں نے اس کے چلے جانے کے بعد سوچا اور کتاب شیلف میں واپس رکھتے ہوئے خود سے بولے

''ٹیگور تم بھی دنیا کو کیا دے گئے ہو۔''

اور خشک گھاس والے اس لان میں آرام کرسی پر نیم دراز جب انہوں نے دوپہر کی ڈاک دیکھی تو اس نیلے ایروگرام کو دیکھ کر وہ بہت محبت سے مسکرا دیے تھے۔جس کے پچھلی طرف رقیہ ہال ڈھاکا یونیورسٹی لکھا تھا۔انہوں تمام بقیہ خطوط چھوڑ کر سب سے پہلے اسے کھولا تھا۔

آداب وتسلیمات کے بعد اس نے لکھا تھا...... ہاں تو یہ میں یعنی سمعیہ علی، خط جلدی نہ لکھنے کے لیے معذرت خواہ ہوں اور امید کرتی ہوں کہ آپ نے کچھ زیادہ محسوس نہ کیا ہوگا۔آپ میری طبیعت سے تو واقف ہیں نا۔

اللہ! نذرُل چچا! یہ پوربو پاکستان اتنی حسین جگہ ہوگی، مَیں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔سچ! اس کی فضاؤں میں اتنا سحر ہے جو انسان کو مسحور کر دیتا ہے۔پر ایک بات ہے، چند دن قیام کے بعد یوں لگتا ہے جیسے ہم لوٹس ایٹرز کی سرزمین میں آ گئے ہوں۔کاہلی اور سستی اعصاب پر چھا جاتی ہے۔رہے یہاں کے باسی تو وہ مخلص، سادے اور مہمان نواز ہیں۔پر زہریلا پروپیگنڈا ان کے معصوم ذہنوں کو مسموم بنا رہا ہے۔انہیں ہم سے ڈھیروں شکایات ہیں، چند ایک جائز اور بہت سی ناجائز۔

شروع شروع میں تو نذرُل چچا، اتنے چر کے کھائے کہ کیا بتاؤں۔پر وہ کہتے ہیں نا! انسان رفتہ رفتہ ماحول کا عادی ہو جاتا ہے، سو وہی بات میرے ساتھ بھی ہے۔پر یہ سوال ہمہ وقت میرے ذہن میں کلبلاتا ہے کہ ہم کیسے پاکستانی ہیں؟ اور اس کا جواب بھی مجھے نہیں ملتا۔ہاں کبھی کبھی اندھیرے میں روشنی کی ننھی منی کرن ضرور پھوٹتی ہے۔ہم خیال جہاں بھی کہیں ملتا ہے، یقین کیجیے نذرُل چچا! وہ لمحہ میرے لیے اتنا سرور آگیں ہوتا ہے کہ بتانا مشکل ہے۔ایک بات اور بھی بہت تکلیف دیتی ہے کہ افواج کے بارے میں یہاں اچھے تاثرات نہیں پائے جاتے۔

نذرُل چچا! یہ لاابالی اور لاپرواہ لڑکی یہاں آ کر بہت جذباتی اور حساس ہوگئی ہے۔

آپ کی بھابھی اور بھیا دونوں ہی بہت اچھے ہیں میرے لیے۔بلاشبہ ان کی محبت

پدرانہ و مادرانہ شفقت لیے ہوئے ہے۔ وہ دونوں سلجھے ہوئے اور وطن دوست لوگ ہیں۔ جو طلباء کی تخریبی سرگرمیوں کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ رہے بینو اور فخر، تو ان کے ذہن بیرونی زہر سے قدرے متاثر ہیں۔ پر اتنے نہیں کہ انہیں پاکستان سے ہی نفرت ہو۔ وہ ایک متحد پاکستان پر ایمان رکھتے ہیں۔ بلبل صحیح معنوں میں باشعور لڑکا ہے، وہ اگر مغربی پاکستان پر کڑی تنقید کرتا ہے تو مشرقی پاکستان کو بھی نہیں چھوڑتا۔ وہ کہتا ہے کہ میں مشرقی مغربی کا قائل نہیں۔ یہ مشرق مغرب مل کر میرے ملک کی تکمیل کا باعث بنتے ہیں۔ مسائل یہاں کے ہوں یا وہاں کے، ہمیں ان پر ہمدردی سے سوچنا چاہیے اور ان پر بے لاگ تنقید کرنی چاہیے۔

پرنذرل چچا! وہ آپ کا بھتیجا! اجتبیٰ الرحمٰن، اس کا بس چلے تو غالباً پل میں پوربو پاکستان کو الگ کردے۔ اس کی سرگرمیاں اتنی حوصلہ شکن ہیں کہ کبھی بے اختیار میں سوچتی ہوں کیا کہ وہ اسی گھرانے کا فرد ہے؟

آج کل رمضان ہے، یونیورسٹی بند ہے۔ لڑکیوں کی ایک اکثریت گھروں کو جا چکی ہے، ہال میں کوئی اِکا دُکا ہی نظر آتی ہے۔ ماں کا اصرار تھا کہ میں گھر آجاؤں۔ میری ایک دوست ہال میں ہے جو چھٹیوں میں گھر نہیں گئی، اس کا امتحان تعطیلات کے بعد شروع ہونے والا ہے، بس اس کا خیال ہے۔ میں آج کل افطاری و سحری خود پکاتی ہوں، میرے ہاتھوں پر جا بجا جلنے کے نشان پڑ گئے ہیں۔ پرنذرل چچا! مزا بڑا آتا ہے۔

ڈھاکا کی نزدیکی جگہوں ٹنگائل، مرزاپور، چندرا، نرائن گنج، گھوڑا سال اور سونار گاؤں کا چکر لگا آئی ہوں اور ہر جگہ کی خوبصورتی سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔ دریائے سیتا لکھیا پر واقع پوربو پاکستان کی مصروف ترین دریائی بندرگاہ نرائن گنج جو ایک صنعتی شہر بھی ہے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی ہوں۔ آدم جی جیوٹ ملز میں جوٹ بننے کا سارا مرحلہ دیکھا پر جب میں دنیا کی اس سب سے بڑی عظیم الشان مل کو دیکھ رہی تھی تو یہ تلخ احساس کہ اس سنہری ریشے سے ویسٹ پاکستان خوشحال ہو رہا ہے، مجھے چھلنی کیے جا رہا تھا۔ اور سونار گاؤں کی تو کیا بات ہے۔

عظیم الشان تاریخی عمارات کو کھنڈر بنے دیکھ کر میرا دل بہت غمگین ہوا ہے۔ یہ جگہ جو کبھی بنگال کا دارالخلافہ تھی، اب ان دنوں اتنی ویران ہے کہ قلبی تکلیف ہوتی ہے۔

نذرُل چچا! یہاں کی غربت دیکھ کر دل کٹتا ہے، چندرا کا وہ منظر شاید میں کبھی نہ بھول سکوں، ننگ دھڑنگ بچے اور ان کی فاقہ زدہ مائیں جس طرح جھوٹے چاولوں پر ٹوٹی تھیں، میں کانپ اٹھی تھی۔ اس ملک کو آزاد ہوئے کتنے سال ہو گئے ہیں۔ پر آج تک بھوک کا مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ غریب آدمی آج بھی وہیں ہے جہاں وہ آزادی سے قبل تھا۔ اس کے مستقبل سے پھر ہماری توقعات وابستہ ہیں۔ دیکھیے وہ کہاں تک پورا ہوتی ہیں۔

میں نے یہاں بنگلہ اکیڈمی میں داخلہ لے لیا ہے۔ پر بنگلہ سیکھنے میں جتنی حیرت انگیز تیزی مَیں نے دکھائی، لکھنے اور پڑھنے میں میری رفتار اتنی ہی سست ہے۔ دراصل بنگالی رسم الخط بہت کٹھن ہے۔ یہ میرا خیال ہے۔ ویسے زبان کے سلسلے میں یہاں لوگوں میں اندھا تعصب پایا جاتا ہے۔

میوزک کالج آف آرٹس میں بھی داخلے کا خیال ہے۔ ہم لوگ تو سچ! گنوار ہی ہیں جو موسیقی سے ہزاروں میل دور ہیں۔ نذرُل چچا! بعض وقت یہ چیز بہت مضحکہ خیز لگتی ہے کہ موسیقی کی یہ قدر ملک کے ایک حصے کی اگر زندگی ہے تو دوسرا حصہ اسے موت سمجھتا ہے۔ چند دن ہوئے مشہور گلوکارہ فردوسی بیگم سے ملاقات ہوئی۔ بتاتی ہیں کہ جب میں نے سرحد میں پہلی بار اپنے فن کا مظاہرہ کیا تو لوگوں نے سوچا کہ یقیناً میرا تعلق میراثیوں کے کسی خاندان سے ہے۔ پر میں جو فلاسفر نہیں، عالم دین بھی نہیں، محض ایک ناقص العقل لڑکی ہوں، سوچتی ہوں کہ ساز و سر کے بغیر جیون کیا روکھا سوکھا نہیں؟

جس چیز نے مجھے بہت متاثر کیا ہے، وہ یہاں کی سادگی ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹی کی لڑکیاں اپنا وقت بناؤ سنگھار پر ہرگز ضائع نہیں کرتیں۔ نہ ہی انہیں ان سے کوئی دلچسپی ہے پر سیاست ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ کوئی لڑکی ایسی نظر نہیں آئے گی جس کا تعلق کسی پارٹی سے نہ

ہو۔ بچے بچے میں سیاسی شعور پایا جاتا ہے۔ گو کہ یہ شعور سارا کا سارا مغربی پاکستان کے خلاف ہی ہے۔

کتنا لمبا خط لکھ ڈالا میں نے، پڑھتے پڑھتے اُکتا گئے ہیں نا آپ!...... بینو مجھے اپنے دادو کے متعلق بتایا کرتا ہے۔ کاش نذرُل چچا! وہ زندہ ہوتے۔

زہرت چچی کو آداب کہیۓ گا، خوقان کو خوب پیار کیجئے گا۔

اورانہوں نے خط پڑھ کر اسے پکارا تھا۔ جوان کی نصف بہتر تھی۔ وہ اپنے لانبے گیلے بالوں کو کمر پر جھلاتی ان کے پاس آ گئی۔ تب وہ بولے، لو اسے پڑھو! سومی نے لکھا ہے۔

''لڑکی جا کر پریشان ہوگئی ہے''...... وہ خط پڑھ چکنے کے بعد بولی...... ''اور اس شلپی کو تو جانے کیا ہو گیا ہے۔''

''ایک شلپی کو کہتی ہو، آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔''

اور اس نے چاروں طرف گھوم کر خود کو دیکھا اور اپنے آپ کا تنقیدی جائزہ لیا۔

سرخ اور سیاہ رنگ کی یہ چیک ساڑھی اس کی چمپئی رنگت پر بہت اچھی لگ رہی تھی۔ پر وہ اسے دی گئی اتنی زیادہ کلف سے بہت عاجز نظر آ رہی تھی۔ جو چلی تو کھڑ کھڑ کی آواز سے کمرہ گونج اٹھا، ابرق بھی کہیں ڈھیر ساری جمی تھی اور کہیں نام و نشان تک نظر نہ آتا تھا۔

باہر سے بینو چلایا تھا...... ''ارے سومی آپا! آپ اتنا سنگار نہ کریں، وہاں راکٹ میں کوئی نہیں دیکھے گا اور ساری محنت پر پانی پھر جائے گا۔''

اس نے آنچل کو دائیں شانے پر لا کر ٹھیک کیا اور باہر نکل کر اس سے جھگڑنے لگی۔ نیچے گاڑی آ گئی تھی۔ وہ ان سب کے ساتھ باریسال عید کرنے جا رہی تھی۔ تینوں لڑکے بہت خوش تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایم۔اے فائنل ایئر کا لڑکا بیٹھا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ شلپی کا جنرل سیکرٹری تھا۔

شام گہری ہو رہی تھی۔ دودھیا روشنی میں سڑک کی سیاہی زیادہ نمایاں ہو رہی تھی۔ بیت المکرّم اور جناح ایونیو کی شاندار دکانیں اور ان میں خریداری کرتے صاحبِ ثروت حضرات کافی پیچھے رہ گئے تھے۔ کار کی رفتار اب بہت سست تھی۔ یہ پرانے ڈھاکا کا گنجان ترین علاقہ تھا۔

مٹھائیوں کی مخصوص مہک، مانوس فضا، ریڑھیوں پر سجائے پھول بیچتے نوعمر لڑکے اردگرد کھڑے سیدھے سادے دھوتیوں میں لپٹے لوگ۔ دکاندار گاہکوں کو چیخ چیخ کر بلا رہے تھے۔ کندھے سے کندھا ٹکرا رہا تھا۔ اس سمے اسے یوں محسوس ہوا جیسے ایک ہزار میل کا فاصلہ آناً فاناً اُڑ گیا ہے۔ اور وہ لاہور کے کشمیری بازار یا دلی دروازے سے گزر رہی ہے۔

بس یہ زندگی اچھی ہے۔ اس نے سوچا، یہاں کسی کے دماغ میں ایٹی کیٹس کا بھوت نہیں۔ انہیں مہذب نہ ہونے کا کوئی غم نہیں۔ زندگی جس سادگی کی متقاضی ہے، یہ اس کی مکمل تصویر ہیں۔

وہ صدر گھاٹ پہنچے۔ آٹھ بج چکے تھے...... ''یہ خرید و فروخت کا بہت بھاری مرکز ہے۔ سومی آپا! یہاں بازار اندر ہی پھیلتے چلے گئے ہیں'' ......بلبل اسے بتا رہا تھا اور وہ بھی دیکھ رہی تھی کہ غریب طبقہ سارا یہاں اُمنڈ پڑا ہے۔

گاڑی انہیں عین ویٹنگ روم کے سامنے اتار کر چلی گئی تھی۔ بابا پھل خریدنے چلے گئے اور وہ رنگ برنگے لوگوں کو دیکھتی رہی۔ جب وہ واپس آئے تب وہ سب اندر داخل ہوئے۔ یہاں ایک اور ہی دنیا آباد تھی۔ موزائق کے گندے فرش پر ہزاروں لوگ بیٹھے تھے اور باہر بوڑھی گنگا کے سینے پر سینکڑوں کشتیاں، اسٹیمرز، لانچیں اور راکٹ قطار در قطار کھڑے تھے، شہر کے من چلے کشتیوں پر بیٹھے سیر کر رہے تھے۔ ان کے خوشی سے بھرے قہقہے اس مصروف دنیا میں ہلکا ہلکا شور کر رہے تھے۔

وہ دائیں بائیں دیکھ رہی تھی اور بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہی تھی، بابا اس سے بولے تھے۔ ''بیٹے! ذرا تیز چلو'' ......اس نے قدموں کو تیز کیا اور راکٹ کی سیڑھیاں چڑھ کر کیبن میں داخل ہوئی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے سامان سلیقے سے رکھا اور پھر کیبن کے سامنے سے عرشے پر آ گئے۔ ریلنگ سے نیچے جھانک کر اس نے دیکھا ایک چھوٹا سا لڑکا کشتی کھے رہا تھا۔ چھوٹی سی لالٹین پاس رکھی تھی، چٹائی پر ایک جوڑا بیٹھا تھا۔ غیر ملکی جان پڑتا تھا۔ سامنے ایک لانچ

آ کر رکی تھی۔ گٹھڑیاں اٹھائے سوکھے سوکھے مرد اور نیلی پیلی ساڑھیوں میں سانولی عورتیں بچوں کو گودیوں میں اٹھائے نکل رہی تھیں۔

رات تاریک تھی۔ اسے افسوس ہوا کہ کاش چاند ہوتا۔

بینو نے کہا...... ''رات کو روحیں بلائیں گے'' اور وہ لرز کر بولی۔

''اے اللہ کا نام لو بینو! اتنے گہرے پانیوں پر سفر کرتے ہوئے جہاں زندگی ایک پل میں بڑی خاموشی سے ختم ہوسکتی ہے۔ روحیں بلاتے ہوئے ڈر نہ لگے گا۔''

''بس۔ تو آپ اتنی بہادر ہیں'' ...... وہ اسے چڑاتے ہوئے بولا...... ''ارے سومی آپا! اس پانی پر تو بنگال زندہ ہے۔ اب اس نوکے کو دیکھیں'' ...... اس نے نیچے ایک کشتی کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے دیکھا یہ بند کشتی تھی...... ''اس میں ایک پورا خاندان آباد ہے۔ یہ اسی میں کھاتے پیتے ہیں، یہاں پر سوتے ہیں، اسی پانی پر ان کے بچے جنم لیتے ہیں اور اسی پر مر جاتے ہیں۔ ہوش سنبھالتے ہی بچے کے ہاتھ میں نوکا کے چپو آتے ہیں۔ تند و تیز ہوائیں، موسلا دھار بارشیں، بپھرتے طوفان اور چڑھتے دریا، قدرت کے یہ عناصر ہم سے بہت قریب ہیں۔ یہ باریسال جہاں ہم جا رہے ہیں نہیں جانتیں یہاں کوئی ریلوے لائن نہیں، سڑک بھی ابھی کچھ عرصے پہلے بنی ہے اور اس میں بھی کئی فیریاں آتی ہیں۔ غریب آدمی کے لیے یہاں پہنچنے کا واحد ذریعہ بس یہی لانچیں ہیں۔''

اور یہاں ریلنگ کے سہارے کھڑی، اس لڑکی کو رات کے تاریک لمحوں میں پانی پر رواں دواں یہ زندگی بہت خوابناک محسوس ہوئی تھی۔ ساحل کی جگمگاتی روشنیاں بہت پیچھے رہ گئی تھیں، اکا دکا کشتیاں اب نظر آ رہی تھیں۔ راکٹ کی ہیڈ لائٹس میں پانی بہت دور تک نظر آ رہا تھا۔

آرام کرسیوں پر یہاں کچھ اور لوگ بھی بیٹھے تھے۔ اوائل دسمبر کی ہوا کچھ زیادہ خنک نہ تھی، وہ سیاہ کارڈیگن کی چھوٹی چھوٹی جیبوں میں ہاتھ ٹھونستے ہوئے پیچھے پلٹی۔ بہت سی نگاہوں

نے اسے دلچسپی سے دیکھا تھا۔ اس کے کانوں کی لویں سرخ ہوئیں اور دوبارہ رخ پلٹ کر باہر دیکھنے لگی۔

ایک چھوٹی سی بچی اس کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے اس نے اس کا نام پوچھا...... ''دونیر اعلیٰ'' بچی کسی جھجک کے بغیر بولی تھی۔ یہ اسے بہت دلچسپ لگی، اس نے اسے ابا کی ملازمت، بہن بھائیوں کی تعداد، ماں کی بیماری اور کہاں سے آئی ہے، کہاں جارہی ہے، سب کچھ بتا دیا۔ یہ رنگ پور کے ڈی سی کی بچی تھی۔

عرشے پر لوگوں کی تعداد اب کم ہوگئی تھی۔ بچی بھی چلی گئی۔ فخر گنگنا رہا تھا...... ''بھئی فخر! کوئی ڈھنگ کا گانا گاؤ'' ...... وہ بولی...... ''یہ کیا چوں چوں کر رہے ہو۔''

''واہ، یہ کیا ڈھنگ کا نہیں؟''

''تبھی بیرے نے انہیں کھانا کھانے کے لیے اطلاع دی۔''

اور وہ ایک دوسرے کے پیچھے چلتے وہاں آ گئے جہاں مختلف میزوں کے گرد لوگ بیٹھے کھانے میں مصروف تھے۔

ماں اور بابا ان کے انتظار میں تھے۔ بابا نے مسکرا کر اس سے پوچھا تھا کہ کیا وہ سفر سے لطف اٹھا رہی ہے اور اس کے کچھ کہنے سے پیشتر ہی بینو بولا تھا...... ''یہ تو بہت ڈر رہی ہیں بابا۔''

''یہ جھوٹ بولتا ہے بابا! میں اس تجربے سے بہت محظوظ ہو رہی ہوں'' ...... اس نے پورے زور سے تردید کی۔

کھانا بہت سادہ تھا۔ چکن کڑی اور سادہ چاول۔ اس کے سامنے والی میز پر چند غیر ملکی بیٹھے تھے۔ لب ولہجہ سے امریکی جان پڑتے تھے۔ دائیں ہاتھ چار آدمی تاش کھیل رہے تھے۔

کھانا کھا کر وہ بلبل کے ساتھ نچلے حصے میں آ گئی۔ یہاں بے شمار لوگ فرش پر کپڑا بچھائے لیٹے تھے اور کچھ ایک کونے میں سکڑے سکڑائے اونگھ رہے تھے۔ ہوا کو روکنے کے انتظامات تھے پھر بھی اس کا کافی زور تھا۔ ایک بوڑھا ہندو چارخانہ تہمد باندھے گرتا پڑتا باتھ روم

کی طرف جارہا تھا۔ ایک عورت روتے بچے کو چپ کرانے کی کوشش میں مصروف تھی۔

اور دروازے کے قریب کھڑی اس لڑکی نے ماحول پر ایک بھرپور نظر ڈالی اوپر نیچے کا یہ تفاوت اسے بے حد کھلا۔ کیبنوں کے اندر گرم کمبلوں میں لپٹے لوگ جو حد درجہ انٹلیکچوئل خیال کیے جاتے ہیں اور تختوں کے اس فرش پر لیٹے یہ لوگ غریب اور غیر مہذب سمجھے جاتے ہیں۔ جانے انہوں نے اپنے درمیان اتنی خلیجیں کیوں حائل کرلی ہیں کہ ان خودساختہ کھائیوں کو پاٹنا دونوں کے لیے ہی بہت دشوار ہے پر پانی کے سینے پر بہتا یہ جہاز اگر ابھی ڈوب جائے تو ان کے درمیان سارے فاصلے آناً فاناً ختم ہوجائیں۔

وہ دل برداشتہ سی اوپر چلی آئی۔ ٹھنڈ کافی ہوگئی تھی۔ عرشے پر انہوں نے پنگ پونگ کھیلا لیکن بینو کے حد درجہ اصرار پر بھی وہ روحوں کو بلانے پر آمادہ نہ ہوئی۔

بُلبل نے نذرُالاسلام کومشہور گیت

شاؤنہ شیلوپھرے شے پھریلونہ۔

گاتے گاتے رک کر بتایا کہ اس نے شِلپی بھیا کو تاکید کی ہے کہ وہ آتے ہوئے ٹیپ ریکارڈ ضرور لے کر آئیں۔ بشیر احمد، مجیب عالم، سینہ یاسمین، فردوسی بیگم اور شہناز بیگم کے غضب کے ریکارڈ ہیں۔ آپ سنیں گی سومی آپا تو سچ جھوم اٹھیں گی۔

چلغوزے بہت جلدی ختم ہوگئے تھے۔ اس نے بینو سے اور کے لیے پوچھا تو وہ بولا......

''سومی آپا اتنے مہنگے ہیں۔ جتنے پیسے میری جیب میں تھے ان کے خرید لایا تھا۔''

صبح اپنے تمام تر حُسن کے ساتھ پدما کی لہروں پر اتر آئی تھی۔ اونچے اونچے مٹیالے بادبانوں کی کشتیاں سُبک روی سے تیر رہی تھیں۔ نواحی علاقوں کے ماہی گیر چلتی کشتیوں میں کھڑے وزنی جالوں کو پورے زور سے پانی میں پھینک رہے تھے۔ اس جگہ کا نام کیا ہے؟ یہ اسے پوچھنے پر بھی معلوم نہ ہو سکا تھا۔ ویسے دریا کا دہانہ یہاں کم چوڑا تھا۔ کنارے پر کیلے اور ناریل کے درختوں کی بہتات تھی، کہیں کہیں پپیتے بھی لگے نظر آ رہے تھے۔ اور یہاں چند عورتیں راکھ سے برتن مانجھ رہی تھیں، ہری سرخ ساڑھیوں والی۔ کچھ ایک طرف غسل کر رہی تھیں، کہیں کہیں اکا دُکا مرد لوگ بھی نہاتے نظر آ رہے تھے۔

اور راکٹ اپنی منزل کی طرف گامزن تھا۔ تاڑ اور سپاری کے قد آور درخت جھومتے تھے۔ ہر سو آنکھوں کو تازگی دینے والا سبزہ تھا۔ دور سورج طلوع ہو رہا تھا۔ لالی پانی میں گھلتی جا رہی تھی۔ چمکتی کرنیں مختلف راستوں سے دریا میں اترتی آ رہی تھیں۔

''اللہ، یہ بنگال کی صبح ہے! اتنی حسین''!!...... وہ بے اختیار خود سے بولی تھی...... ''جو میں اسے نہ دیکھتی تو جیون تشنہ ہی رہتا۔''

''ہاں دیکھو تو بھئی کتنا خوبصورت نظارہ ہے۔ نظر ہٹانے کو جی نہیں چاہتا۔ فضول میں لوگوں نے صبحِ بنارس کا محاورہ بنا دیا ہے۔ میں تو کہوں گی کہ صبح بنگال سے زیادہ حسین صبح برصغیر کے کسی شہر کی نہیں ہو سکتی...... ''ہاں بُلبل! یہ تو بتاؤ ہم باریسال کب پہنچ رہے ہیں؟ اب تو آٹھ بج گئے ہیں۔''

''بس یہی آدھ گھنٹہ میں۔ چلیئے ناشتے کے لیے، میں آپ کو بلانے آیا ہوں۔''

اور پون گھنٹہ بعد وہ باریسال کے ساحل پر لنگرانداز ہو رہے تھے۔ کشتیوں، سٹیمرز، لانچوں، بجیروں اور دخانی جہازوں کی یہاں اتنی ہی کثرت تھی جتنی ڈھاکا صدر گھاٹ پر۔ لانچیں اور راکٹ مختلف جگہوں سے آجا رہے تھے۔ لکڑی کے تختے بچھائے گئے اور ان پر ٹھپ ٹھپ کرتی وہ سب کے ساتھ باہر آ گئی۔

تب دورویہ درختوں سے گھرے اس چھوٹے کچے راستے پر چلتی وہ ٹین کی چھتوں والے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ یہ ماں کے چچازاد بھائیوں کا گھر تھا۔ کچے صحن میں سفیدے کا درخت پَر پھیلائے کھڑا تھا۔ دو منزلہ مکان سارا لکڑی اور ٹین سے بنا تھا۔ انگنائی میں مرغیاں کٹ کٹ کرتی پھر رہی تھیں۔ اس گھر کی لڑکیاں بھی کچھ مرغیوں کی طرح بے شمار تھیں جو گننے میں نہیں آ رہی تھیں۔ ماں کی بھاوجیں، ماں اور بابا کے قدم چھونے کے بعد اس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں اور اسے دیکھ کر سادگی سے مسکرائی تھیں۔ اس نے کچھ دیر ان سے باتیں کیں۔ چھوٹے بچوں کو پیار کیا اور پھر بلبل، بینو اور فخر کے ساتھ شہر دیکھنے نکل گئی۔

اور اس صاف ستھرے خوب صورت شہر میں گھومتے ہوئے اس نے نذرل چچا اور اپنے بچپن کو یاد کیا۔ سندربن کا خیال آیا جو باریسال سے کچھ زیادہ دور بھی نہیں تھا۔

ایک فلم کا سپیشل شو دیکھا اور باریسال میڈیکل کالج جو ابھی زیرِ تعمیر تھا، کے اوپر سے ہوتے ہوئے واپس آ گئے۔ گھر میں خاصے لوگ روزے سے تھے تو بہت سارے بغیر روزے کے بھی تھے۔

دوپہر کا کھانا پُرتکلف تھا۔ کوئی سنگی اور ٹھینگرا مچھلیوں کو نہایت عمدگی سے پکایا گیا تھا۔ مرغ روسٹ تھا۔ مگر بریانی میں پیاز اور کشمش کا استعمال کچھ زیادہ ہی کیا گیا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے دفعتہً اس نے نظر اٹھا کر دیکھا، دسترخوان پر عین اس کے سامنے بیٹھے ماں کے بوڑھ وبھائی اپنے منہ سے کانچ کے بنٹے جتنی گولی نکال کر پلیٹ میں رکھ رہے تھے۔ پلیٹ کے کنارے پر تین ایسی ہی گولیاں پہلے بھی پڑی تھیں۔ یہ کیسی جادوگری ہے۔ کھایا ماچھ بھات جارہا ہے اور اندر سے بنٹے نکل رہے ہیں۔ اس نے سوچا۔ ماں نے یقیناً اس کی آنکھوں سے ٹپکتی حیرت اور نگاہوں کا ان گولیوں پر جماؤ محسوس کرلیا تھا۔ ہنسیں اور بولیں...... ''ارے بیٹے! یہ مچھلی کے کانٹے ہیں جنہیں اکثر لوگ منہ ہی منہ میں اکٹھا کرلیتے ہیں۔''...... اس کے لیے یہ کس قدر دلچسپ اور انوکھا انکشاف تھا۔

پھر یوں ہوا کہ اس وقت جب وہ گھونٹ گھونٹ ڈاب پی رہی تھی، اس لڑکے نے جو ماں کا رشتے میں بھتیجا تھا اور جس کا نام منصور الحق تھا، نے اُن سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا...... ''کہ وہ اس ویسٹ پاکستانی مہمان لڑکی کو کھُلنا نیوز پیپر مِل دکھانا اور سندربن کے جنگلات کی سیر کروانا چاہتے ہیں۔ بینو اور بُلبل نے ہرّے کہا، پر وہ تو جیسے گُنگ سی ہوگئی۔ کوئی تین سال پہلے کھاریاں میں اس نے نذرل چچا کے ڈرائنگ روم کی دیوار پر ایک پینٹنگ دیکھی تھی، سندری درختوں سے گھری بانس کھپریل کی ایک چھونپڑی، جس کے پس منظر میں ایک نحیف ونزار بوڑھا کشتی کی مرمت میں جتا ہوا تھا۔ سبک خرامی سے بہتا ہوا دریا، ایک گھاٹ اور بانس کی جیٹی، بھاگتے ہرن اور ان کے بچوں کی ڈاریں۔ منظر جیسے اس کی آنکھوں میں منجمد ہوگیا تھا۔

زہرت چچی نے اس کے جذب کو دیکھ کر کہا تھا کہ سندربن کا سین ہے اور اب کوئی اسے وہی منظر دکھانے کی پیشکش کررہا تھا۔ اس نے منصور الحق کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

آپ چہرہ شناسی کے ماہر لگتے ہیں۔ یقیناً آپ نے میرے چہرے پر سندربن دیکھنے کی

خواہش کے کسی عکس کو دوڑتے پھرتے دیکھ لیا ہوگا۔ میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں۔

اور صرف آدھ گھنٹہ بعد وہ سٹیمر میں بیٹھی منصور الحق کی بیوی سے پروگرام کی تفصیل سن رہی تھی۔

بگھیر گھاٹ سے کھلنا تک کا سفر سڑک سے۔ پیپر مِل میں منصور کے منیجر دوست کی میزبانی۔ صبح چالنا تک لانچ اور پھر وہاں سے کشتی میں سندر بن کے جنگلات کی سیر۔

سٹیمر کی تیز رفتاری لہروں سے گتھم گتھا ہوکر انہیں پٹخ پٹخ کر پھینک رہی تھی۔ بگھیر گھاٹ سٹیمر کا پہلا پڑاؤ تھا۔ گھاٹ پر انہیں ڈاب پینے کا کہہ کر منصور الحق گاڑی کا بندوبست کرنے چلا گیا۔ بُلبل اسے بتا رہا تھا کہ سندر بن جانے کا راستہ اسی گھاٹ سے ہی جاتا ہے۔ اور خوبصورت پانیوں کے سفر کے بعد بگھیر گھاٹ سے کھلنا تک زمینی سفر کا ایک اپنا حُسن تھا۔ پختہ سڑک جس کے دونوں جانب ناریل اور سپاری کے درختوں کی بہتات تھی، پان کی بیلوں کی کثرت بھی دیکھنے کو ملی۔ بیس پچیس میل کا یہ سفر پل جھپکتے میں ہی طے ہوگیا۔

اور جب شام کے سائے ڈھل رہے تھے، گاڑی دریائے بھیرب کے کنارے واقع پیپر مِل کے احاطے میں داخل ہو رہی تھی۔ عزیز الرحمٰن کی بیوی کی پور پور میں جیسے بنگال کا جادو بول رہا تھا۔ ایک ٹک اس صبیح صورت کو دیکھتے ہوئے اس نے بنانے والے کی صناعی پر عش عش کیا۔ گھر کے بڑے چھوٹے بچے بھی روزے سے تھے، ایسے میں چائے حلق سے نیچے اترنی مشکل ہوگئی تھی۔ پھر اسے پیپر مِل کی سیر کرائی گئی۔ کاغذ کی تیاری کے سب مراحل دکھائے گئے اور اس نے جانا کہ سندر بن کے ڈیلٹاؤں کی دلدلی زمین میں اگنے والے گیوا درخت اس صنعت کے لیے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ گیوا لکڑی کو دریا میں بھگونے کاٹنے، پیسنے اور مشینوں پر رولروں کی صورت میں لپیٹنے، کٹنے تک کے مرحلے کتنے مشکل تھے کہ جس کا اندازہ دیکھے بغیر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ شاید اسی لیے اس نے بُلبل سے کہا تھا...... ''سفید کاغذوں پر لکھتے ہوئے ہم کبھی بھی یہ نہیں سوچتے کہ یہ کندن کتنے قیمتی ہیں۔''

گاڑی میں ہی کھلنا شہر کا مختصر چکر لگا۔ خاصا بڑا ضلع ہے۔ بھیرب، جمنا اور مدھومتی جیسے دریاؤں سے گھرا ہوا۔

کھانا لذیذ تھا، لطف آیا۔ سحری کے لیے اس نے کہنا چاہا کہ وہ روزہ رکھے گی پر منصور الحق کی بیوی نے ہنستے ہوئے کہا...... ''جب سفر میں روزہ کی چھوٹ ہے تو اس سہولت سے فائدہ نہ اٹھانا کفرانِ نعمت ہے۔''

اس دلیل پر سبھی ہنسے۔ اور جب وہ سونے کے لیے لیٹی اس نے کئی بار خدا کا شکر ادا کیا کہ صاحبِ خانہ نے باتیں کرتے ہوئے ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ ان کے سندر بن کی لکڑی اور اتنی محنت و مشقت سے تیار کردہ پیپر سے ویسٹ پاکستان زرِمبادلہ کما رہا ہے۔ بُلبل کے کہنے پر اس نے ناشتے میں صرف ڈاب پی اور چائے کا کپ لیا۔

فارسٹ گھاٹ سے لانچ میں بیٹھے اور دریائے بھیرب میں سفر کا آغاز ہوا، تھوڑے سے سفر کے بعد لانچ دریائے پسر میں داخل ہوگئی۔ بگھیر گھاٹ پر پڑاؤ ہوا پھر لانچ چالنا جا رکی۔ چالنا بہت بڑی بندرگاہ تھی جس کی توسیع کا بیشتر کام ہو چکا تھا اور کچھ ابھی بھی جاری تھا۔ منگلا سے وہ لوگ سمپان میں بیٹھے۔

سندر بن کا سلسلہ پیرو جپور، باقر گنج، چالنا، منگلا، مورلگینی اور جنوب کے چھوٹے چھوٹے ضلعوں سے خلیج بنگال تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ حیرتوں کا سفر تھا، فطرت کا حسن اپنی رعنائیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ اتنا ننگا تھا کہ وہ سناٹے میں آ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دہشت اور خوف کے سایے لرزنے لگے تھے شاید گدلی آنکھوں میں حُسنِ فطرت سمونے کی تاب نہ تھی۔ سمپان جیسے جیسے آگے بڑھ رہی تھی۔ دیو قامت سبز درختوں کے جھنڈوں کے پیچھے لشکارے مارتی ہرنوں کی ڈاریں، بے کراں پانیوں اور سبزے کے سلسلے، پروردگار! شدتِ جذبات سے جیسے اس کا مُو مُو فریادی بن گیا۔ میرا یہ وطن! اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ رہے تھے۔ چوڑے پتوں والے گیوا اور سندری کے درختوں، چیتوں، شیروں، رائل بنگال

ٹائیگرز، زہریلے سانپوں، اژدھوں اور خوفناک بھیڑیوں کے متعلق منصور الحق اسے بتا رہا تھا پر اس کے کان جیسے بند تھے اور آنکھیں بدلتے منظروں سے پھٹی پڑ رہی تھیں۔ مورلگینی سے کشتی ایک چھوٹی ندی میں داخل ہوئی۔ یہ جنت کا کوئی ٹکڑا ہے جو آسمان کے سینے کو چیرتا ہوا یہاں آ گرا ہے۔اس نے بے اختیار سوچا تھا۔

کافی آگے جا کر دائیں ہاتھ ایک گاؤں کے آثار تھے۔ پھر کشتی نے گھاٹ کو چھوا اور وہ سب بانس کی جیٹی پر چلتے ہوئے زمین پر آ گئے۔ دہشت ناک خاموشی درختوں میں گھرے بانسوں کے گھر جن کی دیواروں پر پھیلی رنگ برنگے پھولوں والی بیلیں۔ پھٹی پرانی ساڑھیوں میں دو عورتیں، تین بچے اور دو مرد بیٹھے چٹائیوں کے بنڈل بنا رہے تھے۔ درختوں کی گھنی چھاؤں میں سے سورج کے سنہری روپ کہیں کہیں مینا کاری کر رہے تھے۔ سب لوگ ان کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ منصور الحق کے جاننے والے لوگ تھے۔ چائے اور کھجور کے گُڑ سے بنے مُرنڈے سے تواضع ہوئی۔ وہ گھر کے اندر گئی، کمرے کی ایک ایک چیز جیسے زبان سے کہتی تھی کہ ہم گردن گردن تک غربت میں دھنسے ہوئے ہیں۔ وہ انہیں کچھ دینا چاہتی تھی پر رک گئی کہ خوف نے گھیر لیا تھا کہ کوئی کچھ کہہ نہ بیٹھے۔

مختلف نالوں اور بڑی ندیوں کے شارٹ کٹ راستوں سے ہوتے ہوئے ان کی باریسال واپسی ہوئی۔

اگلے دن کوئی بارہ بجے وہ بالائی منزل کے تنگ سے برآمدے میں بیٹھی گھر کی درجن بھر لڑکیوں سے باتیں کر رہی تھیں۔ یہ ہائی سکول کے مختلف مدارج میں پڑھ رہی تھیں۔ اس کی پشت پر جو کمرہ تھا، اس کا دروازہ کھلا تھا اور لکڑی کے فرش پر بچھے اُجلے بستروں پر دو بچے سو رہے تھے۔ آنگن کا درخت ان کے سروں پر جھکا تھا۔

”یہ سفید ے کب پکیں گے؟“......اس نے پوچھا۔

”یہی مارچ اپریل تک“......ایک لڑکی نے جواب دیا۔

ان میں سے دو تین بہت تیز تھیں اور مغربی پاکستان کے بارے میں بہت سی باتیں پوچھ رہی تھیں۔

تب بینو نے آواز دی...... ''سومی آپا! نیچے آیئے، صاحب رائے چلنا ہے۔''

''ہوں، تو گویا وہ آ گیا ہے جس کا انتظار ہو رہا تھا۔ یہ بھی ایک مصیبت ہے۔ اب اتنا محتاط ہونا پڑے گا۔ اپنی اس قینچی کی طرح چلتی زبان کو بھی قابو میں رکھنا ہوگا''...... اس نے اٹھتے اٹھتے سوچا۔

پر سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ خود سے بولی تھی...... ''یہ زبان کو تالا لگانا تو قطعی میرے بس میں نہیں۔ جہنم میں جائے وہ، یوں چپ رہ کر مجھے کیا اپنا سارا مزہ کرکرا کرنا ہے۔ پر کتنا اچھا ہوتا جو یہ وہیں ڈھاکا میں ہی رہ جاتا، یہاں تو اس کی خاص ضرورت نہیں تھی۔''

اور اس نے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ضرور ڈالی...... وہ بوڑو (بڑے) چاچا کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔

گھر کے مردوں اور عورتوں نے بہت خلوص سے اسے دوبارہ آنے کی دعوت دی تھی۔ جواب میں وہ مسکرا دی۔ اس پر تو دادی ماں سے ملنے اور صاحب رائے دیکھنے کا جنون سوار تھا پر جب وہ لانچ میں سوار ہوئی، اس کا سارا جنون بھک سے اڑتا نظر آیا۔ یہاں اسے ماں کے ساتھ لیڈیز روم میں بیٹھنا پڑا۔ لانچ کے نچلے حصے میں کام کرتا انجن کثیف دھواں اگل رہا تھا۔ جو سر اڑانے کے لیے کافی تھا۔ اس نے کھڑکی سے گردن باہر نکال لی اور لمبے لمبے سانس لیے، دریا کے پانی سے کھیلنے کی کوشش میں دل بہلانا چاہا پر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ طبیعت بدستور مالش کر رہی تھی۔

اس نے سر بلند کر لیا اور گیلے ہاتھوں کو رومال سے پونچھا۔ چھوٹے سے کمرے میں عورتیں ٹھنسی پڑی تھیں۔ مانگ میں چمکتے سندور، ماتھے پر سرخ بندیاں، تیل میں ڈوبے سر، سرخ نیلے باڈروں کی سفید ساڑھیاں، کوئی چیز بھی اس وقت اسے دلچسپ نظر نہ آئی۔

ماں نے شاید محسوس کیا، تبھی بولیں...... ''تم اوپر چلی جاؤ، یہاں گھٹن ہے۔

اور اوپر جاتے ہوئے اسے کچھ جھجک بھی محسوس ہوئی۔ جانے وہ کیا سمجھے پر یہ مجھے ہر وقت اس کمبخت کا خیال کیوں رہتا ہے؟...... یہ نہ سمجھے، وہ نہ سمجھے، کیا بکواس ہے؟ ٹھیک ہے! وہ جو چاہے سمجھے، مجھے کیا۔''

یہاں اس کھلی جگہ پر بہت سارے لوگ بیٹھے تھے۔ کچھ بیٹھے، کچھ کھڑے تھے۔ وہ تینوں اسے دیکھتے ہی بولے...... ''نیچے جی نہیں لگا کیا؟''

بینو دھان کی ایک بوری پر قبضہ جمائے بیٹھا تھا۔ وہیں اس کے ساتھ تھوڑی سی جگہ پر وہ بھی ٹِک گئی۔

یوں وہ اور بابا اسے وہاں نظر نہ آتے تھے۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ اس نے سکون کا سانس لیا اور کھُل کر باتیں کرنے لگی۔

دھوپ خوشگوار تھی۔ پانی کے سینے پر چلتی لانچ اپنے پیٹ میں سینکڑوں انسانوں کو سمائے تیزی سے آگے بڑھتی جارہی تھی۔

ان چاروں کو اس آدمی پر بہت ہنسی آئی تھی جو نماز پڑھ رہا تھا۔ پر آنکھیں اِدھر اُدھر گھما رہا تھا...... ''لو بھلا! یہ کیسی نماز ہے؟'' اس نے بمشکل ہنسی کو روکا تھا۔

لانچ کا یہ سفر ایک گھنٹہ میں طے ہوا۔ زمین پر قدم رکھ کر ٹھنڈی ہوا کے خوشگوار جھونکے اس نے کھائے اور ایک ٹک ماحول کے سحر کو دیکھا۔ کھیت خالی پڑے تھے۔ دھان کی کٹائی ہو چکی تھی۔ کیکر، جنگلی درختوں اور بانسوں کے جُھنڈ اپنی اپنی جگہ پر تمکنت سے کھڑے آنے جانے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ سہ پہر کی کرنوں نے دریا کے سینے پر جانے کس کے لیے کہکشاں کا راستہ بنا ڈالا تھا۔ اس جگمگاتے چمکتے راستے پر بے اختیار اس کا جی چلنے کو چاہا۔ کیسی احمقانہ خواہش تھی۔

ماں بابا سے اس کی طبیعت کا کہہ رہی تھیں۔ انہوں نے بہت فکرمندی سے اسے دیکھا

تھا۔ پر وہ ان کے بازو جھلاتے ہوئے بولی...... ''نہیں بابا! میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔''

ان سے تھوڑی دور چند دکانیں تھیں۔فخر وہاں سے چائے لے آیا۔چاہتے ہوئے بھی اس نے چائے نہیں پی کہ رمضان کے تقدس کا احترام تھا۔اسے معلوم ہوا کہ باڑی ابھی چار کوس دور ہے اور انہیں کشتی کا ایک اور سفر کرنا ہے۔

اور بند کشتی میں اندر بچھی نرم چٹائی پر ماں اور بابا نیم دراز ہو گئے۔جب یہ کھلے پانیوں سے چھوٹے بجیرے میں داخل ہوئے تو وہ باہر نکل کر بیٹھ گئی۔بُلبل اور فخر نے اسے منع کیا، ہوا میں خاصی ٹھنڈک تھی۔پر اس نے سوچا یہ خوبصورت نظارے پھر کبھی دیکھنے کو ملیں یا نہ۔یہ تو اندر اطمینان سے بیٹھ گئے ہیں۔اس لیے کہ یہ ان کی چیزیں ہیں اور ان میں انہیں خاص کشش محسوس نہیں ہوتی پر میرے لیے تو یہ سب نئی اور خوبصورت ہیں۔''

کشتی کے سرے پر وہ بیٹھا بوڑھے مانجھی سے باتیں کر رہا تھا۔ندی کے کنارے پر لمبی لمبی گھاس اُگی ہوئی تھی۔بانسوں کے جھنڈ پھیلے تھے اور کیلے کے سرسبز درخت جھکے پڑے تھے۔

تب ٹیپ پر نذرل الاسلام کا مشہور گیت ''دھانی رنگو گھا گھر امیگھو رنگی اوڑھنا'' شروع ہوا۔

''فائن''......وہ مسرور آواز میں بینو کے ساتھ ساتھ گاتے ہوئے ابتدائی شام کو حسین رنگوں اور دلفریب جلوؤں کے پابہ رکاب دھیرے دھیرے دھرتی پر اترتے دیکھتی رہی۔

''نودی کنارے چو کرے پانی''......شاید بشیر احمد تھا۔آواز دل کی گہرائیوں میں اترتی جارہی تھی۔بینو نے سینہ یاسمین کا ایک ریکارڈ لگایا اور وہ جو کونے پر بیٹھا ہوا تھا بولا۔

''بینو! مہدی حسن لگاؤ''......اس نے یہ سنا اور اپنی سماعت پر دھوکا کا احساس کیا اور تھوڑی دیر بعد وہاں مہدی حسن کی آواز بکھری ہوئی تھی۔

''اپنوں نے غم دیے۔''

اور اس سمے جب ٹھنڈی ہوا اس کے چہرے سے ٹکرا ٹکرا کر خنکی کا شدید احساس دلا رہی

تھی، اسے ماحول میں آسودگی، طمانیت اور بھرپور خوشی کا احساس ہوا تھا۔

یہ اُردو کا گیت اور گلوکار کا تعلق مغربی پاکستان سے تھا۔ فرمائش اس نے کی تھی جسے اس زبان اور زبان کے بولنے والوں سے سخت نفرت تھی۔ کیا اس نے مہمان نوازی کا ثبوت دیا ہے یا وہ اردو گانوں کو پسند کرتا ہے۔ اس نے یہ دونوں باتیں سوچیں اور کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکی۔

بینو، مجیب عالم کو ملک کا بہترین گلوکار کہہ رہا تھا۔ بلبل بشیر احمد کو، فخر اس سے پوچھ رہا تھا...... ''سومی آپا آپ کا کیا خیال ہے؟'' وہ کیا کہتی بس یہی بولی۔

''میں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا۔ گانے سننے سے مطلب ہے۔''

تب اس نے سنا وہ بولا...... ''مہدی حسن۔''

وہ خوش ہوئی اور اس کی یہ خوشی کچھ ایسی ہی تھی جیسے کوئی ڈوبتا ہوا چند تنکے دیکھ لیتا ہے اور ان سے بچ جانے کی آس قائم کر لیتا ہے۔

ندی میں اب پانی کم تھا اور کشتی کو چپوؤں سے کھینا بہت کٹھن، بوڑھے مانجھی نے کشتی تھوڑی سی ہی دھکیلی تھی کہ ہانپنے لگا۔ تب وہ پانی میں اترا اور اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔

''اس میں واقعی ایک اچھے لیڈر کی صفات ہیں۔ یہ سجے سجائے ایوانوں میں بیٹھ کر غریبوں سے ہمدردی کے دعوے نہیں کرتا اور ٹیل کوٹ اور مونوکل لگا کر شام کو کسی کلب میں پینے پلانے اور بال روم کی چکنی سطح پر پھسلنے پھسلانے میں نہیں گنواتا۔ اسے اس قوم کا درد ہے اور یہ انہیں جگانا چاہتا ہے پر یہ متعصب ہے۔ اے کاش یہ ایسا نہ ہوتا!''

پھر جیسے اسے ایک خوشگوار حیرت نے آن گھیرا۔ دائیں بائیں مختلف سمتوں میں اس نے بے شمار لوگوں کو دیکھا جو اپنے کاندھوں پر بید اور کھچیوں سے بنے ہوئے مٹی کے پانی پینے والے گھڑے نما چیز اٹھائے ناچتے گاتے جوق در جوق آ رہے ہیں۔

اس منظر میں کیسی مقناطیسی کشش تھی کہ جس نے بُلبل اور فخر کو نوکے میں سے ہی کنارے پر چھلانگیں مار کر اترنے پر مجبور کر دیا۔ بابا بھی اٹھ کر بیٹھ گئے تھے اور اب مسکراتے

ہوئے دونوں بیٹوں کے ساتھ ساتھ لوگوں کو بھی دیکھ رہے تھے۔ بینو البتہ نوکے میں ہی بیٹھا رہا۔ ’’چلو سومی آپا! پالو سے مچھلیوں کا شکار دیکھ سکیں گی۔‘‘

ملاح عبدالرب ہنستے ہوئے بتانے لگا تھا کہ کل سے پینٹھ میں ڈھول پر اعلان ہو رہا ہے۔ اور بینو ایک بار پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا تھا...... ’’آپ یقیناً انجوائے کریں گی۔ دلچسپ ترین مشغلہ ہے یہ۔ پر مجھے اس کا شوق نہیں۔‘‘ بہت سے لوگ ماں بابا اور اسے دور سے ہی پرنام کر رہے تھے اور جواباً وہ تینوں بھی مسکراتے ہوئے انہیں ایسے ہی خیر سگالی جذبات سے نواز رہے تھے۔

نوکا سے اتر کر شام کے سلونے حسن میں پور پور ڈوبے کھیتوں میں چلتے اور درختوں کے حسن سے آنکھیں سینکتے جانا شاید اس کی زندگی کے یادگار لمحات میں سے تھا۔

کہ وہ اس نظر بازی میں کوئی چار مرتبہ تنگ تنگ پگڈنڈیوں پر سے پھسلی۔

اور یہ تین کمروں پر مشتمل خوبصورت پختہ گھر تھا۔ جس کے فرش اور دیواریں سیمنٹ کی تھیں۔ پھر اس نے ایک معمر وجود کو آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھتے دیکھا تھا۔ اُن سے کچھ فاصلے پر فخر اور بُلبل ہاتھوں میں وہ پنجرہ نماز چیز پکڑے اس کی جھاڑ پونچھ میں لگے ہوئے تھے۔

انہوں نے باری باری جھک کر دادی ماں کو پرنام کیا۔ وہ ان سب کے پیچھے کھڑی تھی۔

اس نے سوچا اور خود سے کہا...... ’’اس ماحول میں مجھے قطعی اجنبی نہیں بننا۔‘‘

تب وہ جھکی اور ان کے قدموں کو اس نے بہت احترام سے چھوا اور بہت عقیدت سے اپنے ہاتھوں کو آنکھوں تک لے گئی۔ انہوں نے اس کے شانوں پر ہاتھ پھیر کر اسے آشیرباد دی۔ بابا نے بتایا...... ’’یہ نذرل کی بھتیجی ہے اور ہماری بیٹی!‘‘

اور اپنی دادی ماں کے بالکل پاس کھڑے اس لڑکے نے دیکھا تھا کہ اس روشن چہرے والی لڑکی کی چمکدار آنکھوں میں دادی ماں کے لیے عقیدت کا گہرا جذبہ امنڈا تھا۔ اس نے ہاتھوں کو جب اپنی آنکھوں سے چھوا تھا تو ایسا کرنے میں وہ بہت سنجیدہ اور مخلص نظر آئی تھی۔

اور اس نے اپنے دل میں بے چینی سی محسوس کی تھی۔ ایک بار اس سے پہلے بھی اپنی ماں کی بیماری کے دوران جب اس نے اس کی تھکن اور بے خوابی سے لبریز آنکھیں دیکھی تھیں تو وہ اسے اپنے سے قریب محسوس ہوئی تھی۔

فخر نے اس سے سرگوشی کی...... ''سومی آپا۔ یہ جو کچھ آپ نے کیا ہے اگر آپ کے بھائی بندوں کو اس کا علم ہو جائے تو سچ! ہماری طرح آپ پر بھی فتویٰ لگ جائے۔''

''فخر۔'' وہ تلخی سے بولی تھی...... ''میری قوم کو تم لوگوں سے محبت ہے۔ چند لوگ اگر شرپسندی کی باتیں پھیلاتے ہیں تو اس کے لیے پوری قوم کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ میں نہ تنگ نظر ہوں اور نہ متعصب جو ان کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو سوچتی پھروں۔ میں جانتی ہوں، پوربو بنگال ہندوؤں کے تسلط میں رہا ہے۔ اسی لیے ان کی کچھ رسمیں مسلم کلچر میں آ گئی ہیں...... اور یوں بھی مغربی پاکستان ہو یا مشرقی پاکستان۔ کسی بھی حصے کا کلچر خالص اسلامی نہیں۔ مقامی رنگ تو ہر جگہ ہی ہوتا ہے۔''

دادی ماں روزے سے تھیں۔ افطاری کا اہتمام تھا۔ پر وہ تینوں باہر جانے اور اسے بھی اپنے ساتھ گھسیٹنے پر بے چین تھے۔ دادی ماں کی اس خواہش کہ وہ افطاری کریں۔ انہوں نے کہا ''ارے ہمارا کوئی روزہ ہے...... ماہی گیری کا یہ میلہ، مشرقی سمت بڑے نالے پر ہو رہا تھا۔ عورتوں، مردوں، بچوں اور بوڑھوں کا ایک جمِ غفیر تھا وہاں۔ مردوں اور لڑکوں نے پہلوانوں کی طرح یوں لنگوٹ کسے ہوئے تھے کہ جیسے ابھی اکھاڑے میں اترنے والے ہوں۔ تینوں بھائیوں نے چھوٹے چھوٹے جانگیے پہن لیے تھے۔ جن لوگوں کے روزے تھے ان کا ارادہ کھجور کے ساتھ افطاری کرنے اور نماز کی ادائیگی کے بعد کپڑے اتارنے کا تھا۔ بے شمار نگاہیں آسمان کے سینے پر بھی جمی تھیں کہ یہاں چاند نے جلوہ افروز ہونا تھا۔

وہ پہلے چوڑے نالے کے کنارے کھڑی ایک ٹک اس سارے عمل کو غایت دلچسپی سے دیکھتی رہی جو اس پر حیرتوں کے بے شمار دروازے وا کر رہا تھا۔ نالے کے کنارے کے رخ تین

قطاریں بنی اور باقی میں پالو کے ساتھ کودنے کا مرحلہ شروع ہو گیا۔ پالو کو پانی میں اتار کر ایک جھکاؤ کے ساتھ اسے یوں دبایا جارہا تھا کہ اس کا نچلا حصہ گہرائی میں چلا جائے۔ پانی کی سطح پر تیرتے بے شمار گھڑے جو رسیوں کے ساتھ مردوں کی کمروں کے ساتھ بندھے فضا میں ایک اور ہی نظارہ پیش کر رہے تھے۔

اور جیسے کشتیاں دھیرے دھیرے ساحلوں سے دور ہوتی جاتی ہیں وہ بھی آگے بڑھتے جارہے تھے۔

کچھ لوگ بہت تیز تھے۔ مچھلیاں پکڑ پکڑ کر گھڑے میں بھی ڈالنا شروع ہو گئے تھے۔

نالے کے کنارے اُگی گھاس کے ایک صاف سے ٹکڑے پر وہ بیٹھ گئی۔ بینو اس کے پاس ہی تھا، پھر وہ بھی اُٹھ گیا۔ چاند غائب ہو گیا اور سورج کی آخری کرنوں اور شفق نے پانی کے سینے پر جو زرفشاں بکھیری تھی، وہ بھی ختم ہو چکی تھی۔ مچھلی پکڑنے والوں کے گیتوں کی آوازوں کی تیزی بھی اب قدرے معدوم ہو رہی تھی۔ آسمان کس قدر شفاف تھا، درختوں اور دھرتی پر کتنا فسوں بکھرا پڑا تھا۔ بنگال کو جادو کی سرزمین یونہی نہیں کہا گیا۔ اس نے دھیرے سے سوچا۔ تبھی جیسے ''شبلی بھیا سلام'' کی آوازیں گونجیں۔ عورتوں، بوڑھوں، بچوں اور مردوں کے درمیان کھڑے اس نے قدرے فاصلے پر اسے کھڑے دیکھا۔ شبلی نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔ پانی کی مچلتی لہروں پر اس کا دیکھنے کا انہماک، قرمزی ساڑھی کے پلو سے ڈھنپا اس کا سر، گود میں دھری اس کی گوری کلائیاں، اس سمے وہ کسی دل آویز نظارے میں مقید، رابندر ناتھ ٹیگور کی کسی نظم کا مصرع نظر آ رہی تھی۔

تب وہ ان سب کی خیریت پوچھتا، ان کی احوال پرسی کرتا، اس کے پاس آ گیا۔ اس کے پاس بیٹھا اور دھیرے سے پوچھا...... ''آپ کو یہ سب کیسا لگ رہا ہے؟'' ......خوبصورت چیزیں خوبصورت ہی لگتی ہیں پر اس خوبصورتی کے جسم پر کوڑھ کے داغ ہیں۔ آپ نے ان سب کو دیکھا ہے نا؟''

اس نے اپنی آنکھوں سے اپنے دائیں ہاتھ لوگوں کے مجمع کی طرف اشارہ کیا۔

اس کے دل سے ہوک سی اُٹھی۔اس کا جی چاہا کہ وہ کوئی سخت بات کرے، تبھی بینو اس کے پاس آ گیا۔

''سومی آپا! مجھے بتایئے، آپ نے چاند کو دیکھ کر کیا مانگا تھا؟''

''میں نے اپنے اللہ سے پور بو پاکستان مانگا ہے۔'' وہ کھڑی ہو گئی اور اس نے بینو سے کہا کہ اب گھر چلتے ہیں اور جب بینو اس کا ہاتھ تھامے اسے محفوظ راستے سے گھر لا رہا تھا، اس کا دل بہت بوجھل تھا۔ پر بینو اگلی صبح پولو سے پکڑی گئی مچھلی سے پکنے والی ڈشوں اور پتنگ بازی کے متعلق اسے لمبی چوڑی تفصیل بتانے میں جتا ہوا تھا۔

اور آنکھ کھلتے ہی وہ گول مٹول پھولی پھولی گالوں والے بوبی اور راجہ اسے بہت یاد آئے۔ چوک پر تنی مسہری کے اندر لیٹے لیٹے اسے اپنے سینے میں شدید کسک محسوس ہوئی تھی۔ ممکن ہے وہ توتلی بولی بولنے والے زرق برق کپڑے پہن کر اپنی ماں سے آج پوچھیں کہ انہیں ڈھیروں ٹافیاں لا کر دینے والی کہاں چلی گئی ہے؟ تب شاید ان کی ماں کی آنکھوں میں آنسو جھلملائیں اور باپ چائے پیتے پیتے کہے...... ہمیشہ کی ضدی ہے۔ ہماری آنکھوں سے دور جانے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟ یہاں کیا یونیورسٹی نہیں تھی۔

ادھ کھلے روشندان میں سے صبح کاذب کا آتا ملگجا اجالا یہ ظاہر کر رہا تھا کہ عید کی سحر طلوع ہونے میں کچھ زیادہ دیر نہیں۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے تھے۔ وہ قصداً گھر نہ گئی تھی گو کہ اس کا بھائی اسے گھر آنے کے لیے تین چار خط لکھ چکا تھا۔ پر اس نے جواب میں لکھ ڈالا تھا کہ یہ عید تو میں بنگال میں کرنا چاہتی ہوں۔

اس نے مسہری کا کونہ اٹھا کر باہر دیکھا۔ ساتھ کے بستر پر ماں ابھی شاید سو رہی تھیں۔ رات اس کمرے میں خوب ہنگامہ رہا۔ ان چاروں کی دھما چوکڑی نے ماں کو بھی جگائے رکھا۔

آدھی رات تک وہ روحیں بلاتے رہے۔ موم بتی کی مدھم روشنی میں جب وہ محمد بن قاسم کو بلاتی تو بُلبل چیختا۔

''آپ محمد بن قاسم پر اتنی عاشق ہوگئی ہیں کہ کوئی اور آپ کو نظر ہی نہیں آتا۔ اب اگر آئندہ آپ نے اسے بلایا تو کھیل ختم ہوجائے گا۔''

''کیوں بھئی! ہم جسے مرضی بلائیں۔ ہم پر تم اپنی پسند نہیں ٹھونس سکتے۔''

''اللہ پلیز سومی آپا! دیکھئے نا آپ کے یہ محمد بن قاسم اتنی دیر سے آتے ہیں''......بلبل کہتا۔

''بیٹو نواب سراج الدولہ کو بلاتا تو وہ بھی آنے میں خاصی دیر لگاتا۔ اس پر وہ چیختی۔ وہ تو دمشق سے آتا ہے اس لیے تاخیر قابل معافی ہے۔ پر یہ ہندوستان سے آنے والے اتنے سست کیوں ہیں؟'' اس پر خوب خوب جھگڑا ہوتا۔

ماں کو پنجاب کے لوک گیت بہت پسند تھے۔ ان کی خواہش پر اس نے سنائے اور بعد میں ان کا ترجمہ بتایا۔

دوسرے کمرے میں کھٹکا ہوا تھا۔ شاید دادی ماں یا بابا نماز کے لیے اٹھے ہوں، اس نے سوچا۔ ان کی دادی بھی بہت اچھی ہیں۔ اپنے بڑے پوتے سے کتنا پیار کرتی ہیں۔

نکھرا نکھرا اُجالا روشندانوں سے اندر آنے لگا تھا۔ وہ اُٹھ بیٹھی، مچھر دانی اتار کر اس نے بستر کو ٹھیک کیا۔ جب سے اس نے ہوسٹل کی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اس میں کافی سگھڑاپا آگیا تھا وگرنہ وہ بہت بے ڈھنگی لڑکی واقع ہوئی تھی۔ اتنی کہ بستر کو پلٹ کر نہ دیکھتی۔ رضائی زمین بوس ہورہی ہوتی تو مارے کاہلی کے اتنا بھی نہ کرتی کہ اسے اٹھا کر اوپر ہی کردے۔ اس کے کمرے کی ہر چیز بہت الٹ پلٹ ہوا کرتی۔ پر جب بھی کام کرنے کا جنون اس پر طاری ہوتا۔ تو بس پھر جت جاتی اور یہ بات تھی کہ پھر مہینوں ہاتھ نہ لگاتی، اس کی بھابھی نے اس کا اور بھی ستیاناس کر ڈالا تھا۔ اپنی دادی کے الفاظ میں وہ تو دو کوڑی کی لڑکی بھی نہ تھی۔

اس نے اپنی پشت والی کھڑکی کھولی، یہ گھر کا پچھواڑا تھا۔ جو ایک گھنے جنگل سے کیا ہی کم

تھا۔ یہاں بانس کے گھنے جُھنڈ، گہری کھائیاں اور گھاس پھونس کی کثرت تھی۔ چمپک کے چند درخت بھی نظر آتے تھے۔

کچھ دیر وہ باہر دیکھتی رہی، ماں سو رہی تھیں اور ٹھنڈی ہوا فراٹے سے اندر آ رہی تھی۔ اس نے کھڑکی بند کر دی اور باہر آ گئی۔

ٹین کی چھت والے کچے باورچی خانے میں گھر کی نوکرانی زینی چولہے میں آگ جلا رہی تھی۔ ڈھیر ساری ہانڈیاں، دھان کوٹنے کے سوپ، دھان پھٹکنے کے رنگین چھاج، اور بانس کی لمبی لمبی ٹوکریاں کونے کھدروں میں پڑی تھیں۔ مندھی مندھی آنکھوں والی خادمہ اسے چیزوں میں یوں دلچسپی لیتے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ کمرے میں دھوئیں سے گھٹن پیدا ہوگئی جس پر وہ بولی: ''باہر جاؤ باہر۔''

سورج نکل آیا تھا۔ گھر سے بیس گز کے فاصلے پر بہت سی باشائیں نظر آ رہی تھیں۔ ایک دو میں مرد لوگ بانس کے چونگے پر ذرا سی چلم لگائے تمباکو پینے میں محو تھے۔

بائیں طرف بہت بڑا پوکھر تھا۔ کچری پانا سارے تالاب میں پھیلی تھی۔ گلابی جل پدو تیر رہے تھے۔

پورب سے چڑھتا سورج فضا پر چھائے ہلکے ہلکے کہر کو چیر رہا تھا۔

پوکھر کے ساتھ ہی ایک برآمدے پر مشتمل چھوٹی سی مسجد تھی۔ پر نمازی ایک بھی نہ تھا۔ اس نے نیم کے درخت کی ایک جھکی ٹہنی کو پکڑ کر توڑا، اس سے دانت صاف کئے۔ پوکھر میں نیچے اتر کر سبزی مائل پانی سے منہ دھویا اور ساڑھی کے پلو سے صاف کرتی وہیں کنارے پر بیٹھ کر پانی میں ناچتی کودتی مچھلیوں کو دیکھنے لگی۔

تب کچھری پانا کے پتوں کو مسلتے ہوئے اس نے خود سے کہا تھا...... 'اب گاؤں میں تمہارے اس پختہ اعلیٰ درجے کے گھر کو دیکھ کر میں تو بہت حیران ہوئی ہوں جہاں سٹیٹس سمبل کی ہر علامت موجود ہے۔ ایسا گھر تو پنجاب کے کسی کھاتے پیتے گاؤں کے نمبردار کا بھی نہیں ہوتا۔

ایسے میں اگر میں تم سے پوچھوں کہ تمہارا تعلق کیا ڈھاکا کی نواب فیملی سے ہے یا تم نے یہ سب چور بازاری سے حاصل کیا ہے تو یقیناً تم میرے ان احساسات کو تعصب کا نام دو گے۔ اس لیے کہ تمہارے خاندان نے طویل جدوجہد کے بعد اپنے لیے معاشرے میں یہ آبرومندانہ مقام پیدا کیا ہے۔ بعینہ یہی سوال تم سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ تم جو لوگوں کی بظاہر شان و شوکت اور رکھ رکھاؤ دیکھ کر انہیں حکمران طبقے سے آنے کا طعنہ دیتے ہو تو کیوں، تعصب کی پٹی اگر اپنی آنکھوں سے اتار کر دیکھو تو چند ایک کے سوا تمہیں ہر جگہ ایک جیسے ہی لوگ ملیں گے۔''

تبھی بینو نے آ کر اسے پکارا...... ''توبہ ہے سومی آپا! سارے جہان میں آپ کو ڈھونڈ مارا۔''

''خیریت؟''......اس نے پوچھا۔

''ماں آپ کو بلا رہی ہیں''......وہ بولا۔

اور کمرے میں اچھا خاصہ ہنگامہ تھا۔ فخر کے پاجامے کا ازار بند شاید بینو اٹھا لے گیا تھا، وہ چیخ رہا تھا۔ ماں اسے دوسرا دیتے ہوئے سمجھا رہی تھیں کہ اس میں کیا ہیرے ٹنگے تھے جو یوں تمہاری جان پر بن آئی ہے۔

پر وہ غصے میں تھا اور کہہ رہا تھا...... ''ماں ہمیشہ اس کی طرف داری کرتی ہے۔'' اسے یوں ہی بولتے چھوڑ کر ماں اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ کتان کی سرمئی ساڑھی اسے دیتے ہوئے بولیں...... ''لو! اسے پہنو۔''

''ماں!''......اس نے شرمندگی سے کہا...... ''میرے پاس تین نئی ساڑھیاں ہیں۔''

''پگلی!......'' وہ بہت پیار سے بولی تھیں...... ''یہ میری طرف سے تمہاری عید ہے۔''

اس کا دل بھر آیا۔ شاید گھر سے دوری کا احساس ہوا تھا۔ اپنی ماں اور بھابھی یاد آئی تھیں۔ اس کا سر بے اختیار ماں کے شانے پر آ گیا تھا۔ جسے انہوں نے محبت سے تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا۔

''تمہیں پا کر مجھے بیٹی کی تمنا نہیں رہی۔''

اور عید گاہ سے آتے ہی ان تینوں نے بابا کے گرد کھڑے ہو کر عیدی کے لیے شور مچایا۔

بابا، دادی ماں اور ماں سے جب وہ کچھ نہ کچھ وصول کر چکے تو انہوں نے اسے دیکھا۔

''شلپی بھیا! یہ آپ اپنی کنجوسی کو کچھ کم کریں''...... بُلبل نے کہا۔

''غریب آدمی ہوں، کنجوسی کا سوال ہی نہیں''......وہ سویاں کھاتے ہوئے بولا۔

اور چہکتے ہوئے بینو نے بھی پانچ کا نوٹ تھام لیا تو اس کا دل تیزی سے دھڑکا۔ اس نے وہاں سے اٹھ جانا چاہا۔ پر یہ مشکل تھا۔ گھر کے سبھی افراد موجود تھے۔ ایک لمحے کے لیے وہ رکا، وہ جو کھادی کے تنگ پاجامے اور کرتے میں سویوں کی پلیٹ ہاتھ میں پکڑے اس سے ذرا دور ہی کھڑا تھا۔

تب وہ اس کی طرف ایک قدم اور بڑھا۔ کھڑکھڑاتے نئے نوٹ کے ساتھ دھیمے سے بولا......''یہ آپ کی عید ہے۔''

اس نے ایک نظر نوٹ پر ڈالی۔ اسے دیکھا اور پھر سب کی طرف نگاہیں اٹھ گئیں۔ سب مسکرا رہے تھے......دادی ماں بولی تھیں۔

لے لو بیٹی۔

اس نے ''دھن وباد'' کہتے ہوئے نوٹ پکڑ لیا۔

پھر وہ ان تینوں کے ساتھ سویاں کھانے بیٹھ گئی۔ سویوں میں دار چینی اور لونگ کا استعمال تھا۔

وہ بُلبل سے کہہ رہا تھا...... ''اسے اردگرد کی باشاؤں میں لے جاؤ اور یہاں کی زندگی دکھاؤ۔''

باہر اکتارہ بجانے والوں کی ایک ٹولی آ گئی تھی۔ وہ ان کے ساتھ باہر آ گئی، اللہ جانے وہ کیا گا رہے تھے۔ جے ہو جے ہو۔ لہک لہک کر گاتے تو بہت اچھے لگتے تھے۔

مختلف گھروں میں وہ گئی۔ آج عید کا دن تھا۔ پر شاذ ہی کسی بچے کے تن پر نیا کپڑا تھا۔ کلبل کلبل کرتے درجنوں بچے، راکھ سے مچھلی صاف کرتی میلی کچیلی عورتیں اور پوکھروں میں نہاتے کمزور کمزور سے مرد......اس کا جی گھبرانے لگا۔

''بس بھئی بہت دیکھ لیا بینو! واپس چلو'' ایسا وہ بولی۔ راستے میں ان کے درمیان کھل کر باتیں ہوئیں۔ فخر کا کہنا تھا کہ حکومت نے اب تک بنگال کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ پر بُلبل بولا......

''حکومت کی کوتاہیاں اپنی جگہ، اس غربت میں ان کا اپنا بھی بہت ہاتھ ہے۔ وہ جنہیں تن آسانی چمٹ جاتی ہے، ان کی حالت سدھرنے کا کوئی سوال نہیں اور دونوں بھائیوں میں ٹھن گئی۔ خوب خوب وہ ایک دوسرے سے الجھے اور اس نے لمبی خاموشی سے سب کچھ سننے پر ہی اکتفا کیا۔

متفقہ فیصلہ یہ تھا کہ اسے شبلی کے ساتھ واپس بھیج دیا جائے۔ جو اگلے دن ڈھاکا کے لیے روانہ ہو رہا تھا، اسے بہت دکھ تھا۔ اتنے اشتیاق اور انتظار کے بعد وہ گاؤں آئی بھی تو یہ نئی مصیبت گلے پڑ گئی۔

رات اس نے ٹرانسسٹر کھولا جس نے کھلتے ہی ہوا میں یہ خبر بکھیری کہ ڈھاکا یونیورسٹی پندرہ کو کھل رہی ہے۔ اس نے تو پھر بھی کوئی پروا نہ کی۔ ماں اور بابا نے جب پوچھا تو وہ مزے سے بولی...... ''میرا تو ابھی کوئی ارادہ نہیں جانے کا۔''

بابا پندرہ دن کی چھٹی پر آئے تھے۔ ''ہوں!...... کہتے ہوئے وہ ماں سے مخاطب ہوئے، اس کا تعلیمی نقصان ہوگا۔ پردیس میں پڑھنے آئی ہے، یہاں کا کیا ہے جون کی چھٹیوں میں پھر بھی آ سکتی ہے۔''

ماں بھی گہری سوچ میں ڈوبی رہیں۔ بینو، بلبل اور فخر چلائے...... ''کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یونیورسٹی کھلتی ہے تو کھل جائے۔ ہم اکٹھے جائیں گے۔''

پر بابا جو پڑھائی لکھائی کے بارے کچھ زیادہ ہی سنجیدہ تھے، کسی طور رضامند نہ ہوئے اور

بالآخر طے یہ پایا کہ اس کا چلے جانا ہی بہتر ہے۔

کھلے پانیوں پر تیرتے بند نوکے میں بیٹھی وہ ٹیپ ریکارڈ پر مختلف گیتوں کو محویت سے سنتی رہی۔ کبھی کبھی پانی سے کھیلنا شروع کر دیتی۔ شام کا سورج بہت جلد پھیکا پڑ گیا تھا۔ فضا میں اڑتے پرندوں اور کناروں پر اُگے کیلوں کے درختوں کو دیکھتے دیکھتے وہ اکتا سی گئی۔ وہ چٹائی پر نیم دراز یا تو سو رہا تھا یا پھر یونہی اونگھ رہا تھا۔

کڑھ کر اس نے سوچا...... ''شاید اسے غصہ ہے کہ میں اس کے ساتھ کیوں چلی آئی پر میری تو اس میں کوئی خطا نہیں۔ میں آنے کے لیے کب رضا مند تھی۔ اور یہ جو مجھ سے اتنی نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ تو یقین کرے کہ مجھے اس سے نفرت ہے۔ اس کے دادو نے اسے فخرِ پاکستان کا نام دیا تھا، کاش وہ زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ ان کا وہ فخرِ پاکستان آج ذلت پاکستان بن گیا ہے۔''

اور جب دونوں وقت مل رہے تھے، اس نے نوکے سے اتر کر لانچ میں قدم رکھا۔ راکٹ جتنی نہ تو اس میں شان تھی اور نہ ہی آرام، کیبن بھی بہت چھوٹا تھا۔ مایوسی سے اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، وہ نہ جانے کہاں تھا۔ کھڑکی سے باہر جھانکا، پورب سے گہرے بادلوں کا ریلا تیزی سے آسمان پر چھا رہا تھا۔

تبھی وہ اندر آیا، اس کے پاس ایک بستر تھا جسے اس نے سیٹ پر بچھا دیا اور بولا......

''شاید آپ کو زیادہ آرام نہ مل سکے، ویسے صرف رات کی بات ہے، آپ اب آرام کیجیے، میں کھانا بھجواتا ہوں۔''...... کہتے ہوئے وہ پھر باہر نکل گیا۔

''ہاں! ویسے صرف رات کی بات ہے''......اس نے ہونٹ سکیڑے اور اس ایک رات میں چاہے میری ہڈیوں کا قیمہ بن جائے۔ وہ کچھ دیر کڑھتی رہی اور پھر کھڑکی سے باہر دریا کو دیکھنے لگی۔ چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں جلتی لالٹینیں اچھی لگ رہی تھیں۔ ہوا تیز ہو گئی تھی...... ''اچھا بھلا آسمان صاف تھا، پل میں ہی بادل آ گئے ہیں۔ شاید بارش ہو۔'' اس نے کھڑکی کا پٹ

گراتے ہوئے سوچا۔

بیرا کھانا لایا...... کھانا کیا ہے؟ اور کیسا ہے؟ اس نے دیکھے بغیر واپس کر دیا تھا۔

''کچھ اور پسند کریں گی آپ؟'' بیرے کے پوچھنے پر اسے یاد آیا تھا کہ اسے چائے چاہیے۔ پر شدید خواہش کے باوجود اس نے انکار کر دیا۔

''کوئی بات ہے بھلا'' وہ رنج سے بولی۔

بستر وہ بچھا گیا تھا، کھانا اس نے بھجوا دیا اور اپنے حسابوں مہمان داری کے تمام تقاضوں سے بری الذمہ ہو گیا۔ اب یہ اس کی بلا سے کہ کھانا کھایا گیا ہے یا نہیں؟ اس نے بہر حال اپنا فرض پورا کر دیا تھا۔

اور کیبن میں اکیلے اس کا جی گھبرا رہا تھا...... ''ارے! اتنا بھی نہ ہوا کہ جھوٹوں ہی پوچھ لیتا کہ آپ یہاں پریشان تو نہیں۔''

اسے نظر انداز کیے جانے کا شدید احساس تھا جس کی نفسیاتی تسکین کے لیے انا یہ سب بہانے گھڑ رہی تھی۔

ہوا بہت ٹھنڈی تھی۔ اس نے کھڑکی گرا دی، زرد روشنی کیبن کی اداسی کو اور بھی بڑھا رہی تھی۔

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ یہاں کچھ دیر میرے پاس بیٹھتا اِدھر اُدھر کے مسائل پر بات چیت کرتا اور یوں خوف کا احساس جو میرے اعصاب پر سوار ہو رہا ہے اس دوستانہ فضا میں ختم ہو جاتا۔ میں نے کیا اسے نگل جانا تھا!''...... اس نے گہرے دکھ سے سوچا۔

لانچ نے لنگر اٹھایا، وہ پھر باہر جھانکی۔ ہوا برچھی کی طرح اس کے چہرے سے ٹکرائی۔ آسمان گہرے گہرے بادلوں سے ڈھنپ گیا تھا۔ اس نے سونے کی کوشش کی جو قطعی طور پر ناکام ثابت ہوئی۔

لانچ کی رفتار خاصی تیز ہو گئی تھی، بستر سے وہ اُٹھ بیٹھی...... ''کیا انسان ہے۔ پوچھا کچھ آ

کر اس نے'' وہ بڑبڑائی۔

چھوٹے سے کیبن میں اس نے چکر لگائے۔ بھوک الگ ستا رہی تھی۔ اوپر سے چائے کی طلب۔ اس کا سر گھومنے لگا تھا۔

تبھی اس نے دائیں طرف کھڑکی کا پٹ اُٹھایا، اس کے ہاتھ کانپے تھے۔ اور آنکھیں حیرت سے پھیلی تھیں۔ وہ ساکت و صامت کھڑی اسے دیکھ رہی تھی جو سینکڑوں لوگوں کے ساتھ پتلی سی چادر میں لپٹا سو رہا تھا۔ وہ جو آکسفورڈ کا تعلیم یافتہ تھا۔ زبردست قانونی دماغ رکھتا تھا، ڈھاکا ہائیکورٹ کا نامی گرامی بیرسٹر تھا، طلبہ کا رہنما تھا، وہ فرش پر سو رہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں بے حد مفلوک الحال لوگ پھٹے پرانے کپڑوں میں سکڑے سکڑائے لیٹے تھے۔

'یہ اگر چاہتا تو الگ کیبن لے سکتا تھا۔ اللہ اس نے اپنے کو کیسے تیاگ دیا ہے۔ پر یہ بہت عظیم ہوتا اگر ان ٹیڑھے میڑھے راستوں کی بجائے سیدھی راہ پر چلتا۔'

وہ واپس پلٹی اور لیٹ گئی۔ اس نے سونے کی کوشش کی پر اس کیبن میں جہاں اذیت وہ تنہائی تھی۔ وہ پٹ پٹ آنکھیں کھولے چھت کو گھورتی رہی اور جب دل زیادہ گھبرایا تو پھر اٹھ بیٹھی۔

''اللہ! میں کیا کروں؟''......وہ کراہی۔ پٹ اٹھایا اور باہر جھانکنے لگی۔ آسمان پر بادلوں کی یلغار ہے۔ بجلی کوندتی تو سارا ماحول ایک دم روشن ہو جاتا۔ ٹھنڈی ہوا اس کے جسم سے ٹکرا رہی تھی۔ پر وہ ایک ٹک باہر تاریکیوں کو گھورے جا رہی تھی۔ اس کا دل بے چین تھا۔

تمہارا یہ اتنا ایثار اور محبت صرف تمہاری اپنی قوم کے لیے ہے۔ نفرت، حسد اور تعصب نے تم سے اخلاقی اقدار اور انسان دوستی کی عظمت بھی چھین لی ہے۔ چھ اور چار فٹ کے اس کیبن میں چھوڑ کر تم نے پلٹ کر مجھ سے پوچھا کہ میں نے کھانا کھایا ہے؟ مجھے کسی چیز کی ضرورت ہے یا نہیں؟ باتھ روم کا راستہ کدھر ہے؟ عرشے پر کدھر سے جایا جا سکتا ہے؟

پر یقین کرو، بنگلہ قومیت کا جو دیوتم پروان چڑھا رہے ہو یہ ایک دن تمہی لوگوں کو نگل

جائے گا۔ خود پرست قومیں بھی کبھی پروان چڑھی ہیں! بہاریوں کو تم نہیں دیکھ سکتے، پنجابی تمہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا، پٹھان تمہارا دشمن ہے...... یہ سب منفی سیاست کے کرشمے نہیں تو اور کیا ہے؟''

وہ سرپٹ سے لٹکائے بہت دکھ سے یہ سب سوچ رہی تھی اور باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔

اس نے وقت دیکھا گیارہ کا عمل تھا۔ وہ لیٹ گئی۔ اسے عجب سی گھبراہٹ کا احساس ہوا تھا۔ کروٹ بدل کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خلوص سے سونے کی کوشش کرنے لگی۔ غنودگی کے غبار میں وہ جانے کب تک ڈوبی رہی، جب دفعتہً کسی نے دروازے پر دستک دی۔ ہڑبڑا کر وہ اٹھی اور کنڈی کھولی۔ دروازے پر وہ کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گہرا تفکر تھا۔

''آپ ٹھیک ہیں؟''...... اس نے پوچھا تھا۔

لانچ نے ایک جھٹکا کھایا وہ لڑکھڑائی۔ ''بیٹھ جائیے، بیٹھ جائیے۔'' وہ اس کے دائیں شانے کو مضبوطی سے پکڑ کر اسے بٹھاتے ہوئے بولا۔

''گھبراؤ نہیں، لانچ طوفان کی زد میں ہے۔''

اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا، اس کی رنگت اڑی اور سانس گلے میں اٹکا...... ''تو موت مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔ اے اللہ! یہ کیسی بے رحم موت ہوگی۔''

اس نے دیکھا، اس کی آنکھوں میں بے بسی اور خوف تھا۔ اس کے گلابی گداز ہونٹ خشک تھے۔ تب وہ اس کے قریب بیٹھا اور نرم لہجے میں بولا۔

''پریشانی کی بات نہیں، کسی امدادی لانچ یا راکٹ کو متوجہ کرنے کے لیے گولے داغے جا رہے ہیں۔

لانچ کی رفتار نہ ہونے کے برابر تھی۔ جتنا آگے بڑھتی، تند ہوائیں اور طوفانی لہریں اتنا ہی پیچھے دھکیل دیتیں۔

اس نے سہمے سہمے کھڑکی کا پٹ اٹھایا۔خون اس کی رگوں میں جم گیا۔باہر گھپ اندھیرا تھا۔آسمان پر سیاہ بادل مست ہاتھیوں کی طرح جھوم رہے تھے۔بجلی چمکی تو...... دریا کی بلند و بالا لہریں ناگ کی طرح پھن پھیلائے دکھائی دیں۔

لانچ اب ڈگمگانے لگی تھی اور ہر لمحے اس کی ڈگمگاہٹ میں اضافہ ہو رہا تھا۔باہر انسانوں کی بھاگ دوڑ اور افراتفری کا عجب سماں تھا...... ''میں ابھی آتا ہوں'' کہتے ہوئے وہ باہر بھاگا۔

لانچ میں موجود بھاری اشیا دریا میں پھینکی جا رہی تھیں، ہر ممکن کوشش اسے بچانے کے لیے جاری تھی۔

تیر کی طرح وہ کمرے میں آیا۔اس نے اسے کچھ کہا۔کیا؟ اسے سمجھ نہ آئی۔پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ اسے دیکھ رہی تھی۔عورتوں اور بچوں کی چیخیں فضا کو اور بھی ڈراؤنا بنا رہی تھیں۔

اور جب خطرے کا سائرن بج رہا تھا، وہ اس کی پشت پر سوار رسی سے بندھی لٹک رہی تھی۔اس نے کیسے اسے اپنے اوپر لادا، کیسے باندھا، اسے کچھ ہوش نہ تھا۔اس کا مفلوج دماغ صرف یہ سوچ رہا تھا۔

......''تو لانچ یوں ڈوب جایا کرتی ہے۔'' وہ جو آئے دن ''پاکستان آبزرورز'' اور ''مارننگ نیوز'' میں پڑھا کرتی کہ فلاں لانچ، فلاں جگہ طوفان کی زد میں آگئی، اتنے آدمی ڈوب گئے اور ایسی خبروں کو پڑھ کر بے اختیار سوچا کرتی ''کیسے مر جاتے ہیں اتنے لوگ!''

لانچ ایک کھلونے کی طرح ہوا میں اچھلی۔اگلے لمحے زوردار دھماکہ ہوا، لانچ میں پانی بھرنے لگا۔وہ عرشے سے دریا میں جست لگا کر کود گیا تھا۔

خوفناک اندھیری رات، موسلا دھار بارش، طوفان اور سردی، سبھی اکٹھے ہو گئے تھے۔

ان سب کے ساتھ اور وہ دریا کا سینہ چیرتا کنارے کی طرف بڑھ رہا تھا، کنارہ جو ابھی تک اس کی نظروں سے اوجھل تھا۔

اس کی زندگی میں پچھتاوؤں کو بہت کم دخل تھا۔ لیکن یہاں دریا کے کنارے بے سدھ پڑی لڑکی کو دیکھ کر، جس کے پیٹ سے وہ اب تک گھڑوں پانی نکال چکا تھا، اسے دکھ ہو رہا تھا کہ اس نے آخر یہ کیا حماقت کی۔

سفر کے وقت مطلع ابر آلود تھا اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ہنگامی صورت میں لانچ محفوظ انتظامات میں ہمیشہ ناکام رہی ہے۔ اکیلی اس کی جان ہوتی تب بھی ایک بات تھی۔ اس کے سر پر ذمہ داری ایک لڑکی کی تھی۔ اور طرہ یہ کہ وہ بھی پردیسی۔ ماں نے چلتے وقت کوئی پندرہ بار تاکید کی تھی کہ راکٹ میں سفر کرنا۔

سورج اب کافی اوپر آ گیا تھا۔ دسمبر کی دھوپ میں خاصی تپش تھی۔ دریا کا پاٹ یہاں اتنا چوڑا تھا کہ افق تک پانی ہی پانی نظر آ رہا تھا۔ لہریں بہت سکون سے بہ رہی تھیں۔ ہوا بند تھی۔ مطلع صاف تھا اور دریا پُرسکون، سینکڑوں جانوں کی بھینٹ لے کر اسے شاید تسکین مل گئی تھی۔

کون کہہ سکتا ہے رات یہاں ایک مہیب طوفان آیا تھا۔ جس نے کتنے ہی لوگوں کو نگل لیا ہے۔ میرا عزم اگر آہنی نہ ہوتا تو میری لاش بھی یہیں کہیں تیرتی پھرتی نظر آتی۔

اس نے جھرجھری لی اور لڑکی کو دوبارہ دیکھا، سانس کی آمدورفت اب ٹھیک تھی۔ کھڑے

ہو کر اس نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ وہ یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ دور دور تک آبادی کا کوئی نشان نہ تھا، کسی کار گو بوٹ کا بھی ادھر سے گزر نہیں ہوا تھا۔

کسی آسمانی امداد کے انتظار میں یہاں بیٹھ کر وقت ضائع کرنے کی بجائے یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ میں اپنی مدد آپ کے اصولوں پر عمل کروں...... وہ خود سے بولا اور لڑکی کو اٹھانے کے لیے جھکا۔ پر رک گیا اور بغور اسے دیکھنے لگا۔

اس کی گھنی لمبی پلکیں رخساروں تک آئی ہوئی تھیں۔ ناک کے نتھنوں کی بناوٹ بہت خوبصورت تھی۔ سنہری دھوپ میں اس کا رنگ چمک رہا تھا، ساڑھی سے اس کا جسم ڈھانپتے ہوئے اسے احساس ہوا تھا کہ دودھ کی طرح سفید اور حد درجہ گداز ہے۔

اس کے اپنے اعضارات کی کڑی مشقت سے اکڑے ہوئے تھے۔ پھر بھی اس نے اسے اپنے کندھے پر لادا اور سامنے کی طرف چل دیا۔

کوئی گھنٹہ بھر چلنے کے بعد باشائیں اسے نظر آئیں۔ وہ ایک گھر کے سامنے ؟ اور اس عورت سے پناہ کے لیے بولا جو باشا کے سامنے بیٹھی جال کی مرمت کر رہی تھی۔

عورت کی مانگ میں سندور چمک رہا تھا۔ جس نے اسے سمجھا دیا کہ وہ ایک ہندو کے دروازے پر کھڑا تھا۔

عورت نے اس کا ناقدانہ جائزہ لیا پھر اسے اندر جانے کا راستہ دکھایا۔

شانوں تک کٹے بالوں والی لڑکی کو جب اس نے تخت پر لٹایا تو عورت نے اسے غور سے دیکھ کر پوچھا تھا...... ”تمہاری دھرم پتنی ہوگی۔ بڑی خوبصورت ہے۔“

وہ اک ذرا مسکرایا تھا پر کچھ نہ بولا...... عورت کا خیال تھا کہ کھاتے پیتے گھرانے کا پڑھا لکھا جوڑا ہے، جو اس مصیبت میں پھنس گیا ہے۔

باشا میں خاصی ٹھنڈ تھی۔ عورت نے تخت کے قریب آگ جلائی، بہت دیر بعد اسے ہوش آیا۔

......اس نے آنکھ کھولی ہے اور اسے اس وقت نفسیاتی علاج کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے

اجنبی جگہ، کسمپرسی کی یہ حالت اور گزشتہ رات کے خوفناک حادثے کی یاد اس پر کچھ غلط اثر ڈالے۔ اس نے یہ سوچا اور اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ تب اس نے نہایت شستہ اُردو میں کہا...... ’’نئی زندگی تمہیں مبارک ہو! ہم خطرے سے باہر ہیں۔‘‘

اور ہوش کا وہ مختصر سا لمحہ، جس میں ہر شے گردش کرتی ہوئی محسوس ہوئی تھی، اس میں بھی اس نے سوچا تھا کہ میری سماعت کو دھوکا ہوا ہے یا واقعی اس نے اردو میں بات کی ہے۔ یہ اردو بول سکتا ہے۔

عورت ڈاب کاٹ کر لائی، قطرہ قطرہ پانی اس کے حلق میں ٹپکایا گیا۔ بمشکل اس کے اندر دو تین گھونٹ پانی پہنچا ہوگا۔

اور جب پھر اس نے آنکھ کھولی۔ باشا میں ہر سو کڑوا کسیلا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ بانس اور گھاس پھونس کی دیواروں پر مچھلیاں پکڑنے کے جال لٹکے تھے۔

’یوں لگتا ہے میں بیسویں صدی سے بہت پیچھے کی طرف لوٹ آئی ہوں۔ پتھر کے زمانے کے کسی گھر میں پڑی ہوں۔ اللہ یہ دن بھی مجھے دکھانا تھا!‘

عورت بڑی سی ہنڈیا میں جانے کیا پکا رہی تھی۔

اور وہ اس کے بالکل پاس بیٹھا اسے ڈاب پلاتے ہوئے اس کی طبیعت کا پوچھ رہا تھا۔ اس نے حیرت سے پھر سوچا تھا، یہ اتنی اچھی اُردو بول سکتا ہے۔

شام تک اسے دو بار مسور کی دال کا پانی دیا گیا۔ وہ خوفزدہ تھا کہ اس پر نمونیہ کا حملہ نہ ہو جائے۔ پر خیریت رہی اور اس نے خود سے کہا تھا۔ پنجاب کی یہ لڑکی مضبوط اعصاب کی مالک ہے۔ کیوں نہ ہو آخر فوجیوں کے خاندان سے ہے اور اپنی سوچ پر وہ خود ہی مسکرا دیا تھا۔

اس کی رات بہت تکلیف سے کٹی۔ کافی تیز بخار رہا۔ کھانسی بھی آتی رہی اور وہ تقریباً ساری رات ہی جاگا۔ دو دن ایسے ہی گزر گئے۔

اور تیسری صبح جب گھر کا مرد انہیں اپنے نوکے میں اس جگہ چھوڑنے کے لیے تیار ہوا جہاں

انہیں کوئی نہ کوئی کارگو بوٹ آسانی سے مل سکتی تھی۔ جس میں لفٹ لے کر وہ ڈھاکا پہنچ سکتے تھے۔

تب وہ خود سے بڑبڑایا...... ''انہیں دینے کے لیے میرے پاس کوئی چیز نہیں اور یہ بہت افسوسناک بات ہے۔''

تبھی اسے اپنی کلائی میں بندھی گھڑی کا خیال آیا۔ واٹر پروف گھڑی، اسے خوشی ہوئی۔ تیرہ سالہ لڑکے کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے وہ بہت عاجزی سے بولا تھا...... ''آپ لوگوں کے احسان کا بدلہ دینے کی تو مجھ میں سکت نہیں تاہم یہ معمولی سی چیز ہے جو شاید کسی آڑے وقت میں کام آسکے۔ ہاں اگر کبھی ڈھاکا آئیں تو مجھے ضرور ملیں۔

پروہ دونوں میاں بیوی...... ''انسان کی سیوا تو دھرم کی خدمت ہے اس کی کوئی ضرورت نہیں'' انہوں نے گھڑی واپس لوٹانی چاہی، پروہ رضامند نہ ہوا۔

اور پھر یوں ہوا کہ اس نے اپنے دونوں کانوں کو چھوا۔ جہاں سونے کے رنگ جھول رہے تھے۔ خاموشی سے اس نے انہیں اتارا اور عورت کے ہاتھ پر رکھ دیے اس نے نہ نہ کیا اور وہ ٹھیک ٹھیک کہتی آگے بڑھ گئی۔

اسے چلنے میں بہت کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ جی ہی نہیں چاہ رہا تھا کہ ایک بھی قدم اٹھائے پر اب چلنا بھی ضروری تھا۔ اس سے ایک قدم آگے وہ بہت مدھم چال چل رہا تھا اور پلٹ کر اس کی طرف بھی دیکھتا جاتا تھا۔

نوکا میں بیٹھنے سے قبل اس کا دل ڈوبا۔ اسے گھبراہٹ ہوئی اور بے بسی سے اس نے اس کی جانب دیکھا جو نوکے میں بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے چھلکتی پریشانی اور خوف دیکھ کر وہ بہت نرمی سے بولا تھا...... ''میں یہاں تمہارے ساتھ ہوں گھبرا کیوں گئی ہو؟''

اس نے اپنا بازو آگے بڑھایا تھا اور اس کے سہارے اس نے نوکے میں قدم رکھا، نوکا پانی میں ذرا سا ڈگمگایا اور وہ کانپی۔

مرد نے چپوؤں کو کھولا اور کنارے کنارے اسے کھینچنے لگا۔ پانی کو دیکھتے ہی، اسے چکر

آنے لگے تھے۔ سر کو اپنے گھٹنوں پر رکھتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

سنہری چمکتی دھوپ، حدِ نظر تک پانی ہی پانی اور اپنے قریب بیٹھی یہ لڑکی جس کے خشک بال ہوا سے اڑ رہے تھے، اسے بھلی لگ رہی تھی۔

لڑکیوں سے اس کے روابط بہت پرانے تھے۔ کم عمری ہی میں سیاست کے میدان میں قدم رکھنے کی وجہ سے وہ لڑکیوں کے بہت قریب رہا تھا۔ عمر کی مختلف منزلوں میں مختلف لڑکیاں اس کی زندگی میں آئیں اور خود بخود نکل گئیں۔ لڑکیوں کی فطرت کے تمام اسرار اس پر بہت اچھی طرح عیاں تھے۔

اور اب تو وہ جنتا کے کاموں میں کچھ یوں اُلجھ گیا تھا کہ فطری تقاضے بھی دب گئے۔ اس کی پارٹی میں بے شمار لڑکیاں تھیں۔ جن کی ایک اکثریت اس کی پُر کشش شخصیت سے بہت متاثر تھی پر اب اس نے ہمیشہ کام سے کام رکھا اور کبھی کسی کو غیر ضروری لفٹ نہ دی۔ دلیش کے لوگ بھوکے تھے اور عشق و محبت کے لیے اس کے نزدیک فضا سازگار نہ تھی۔

اور یہاں کارگو بوٹ کا انتظار کرتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ کیسی انہونی اور عجیب و غریب باتیں ہوگئی ہیں۔ کوئی یقین کرے گا کہ میں یوں موت کے دروازے پر دستک دے کر واپس آ گئی ہوں۔ ایسی باتیں تو مہماتی کہانیوں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ عام زندگی میں تو کوئی ان کی صداقت پر بھی نہ یقین کرے۔ خاص طور پر یہ کہانی اگر میں پچھمی پاکستان اپنی دوستوں کو سناؤں تو یہی سنوں نا کہ اے بی! یہ زمین آسمان کے قلابے تو نہ ملاؤ۔ مانا کہ آپ دریاؤں کی سرزمین سے ہو آئی ہیں، گپوڑ بازی نہ کرو۔

اور پھر یوں ہوا ایک کارگو بوٹ کو دیکھ کر وہ چیخا، یہ اس کے اپنے آدمیوں کی تھی جس میں کوئی آٹھ نو آدمی اسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ اسے زندہ سلامت دیکھ کر جو انہیں خوشی ہوئی اس کا اظہار انہوں نے بوٹ میں اچھل اچھل اور کنارے پر اتر کر اسے اپنے سینوں سے بھینچ بھینچ کر کیا۔ جس انداز میں وہ اس کا جائزہ لے رہے تھے اور جو خوشی ان کی آنکھوں اور چہروں پر تھی۔

وہ اس کی غیر معمولی ہر دلعزیزی کی واضح مثال تھی۔ تب وہ سب اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اسے بھی نئی زندگی کی مبارک باد دی۔ ان کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ ماں، بابا اور تینوں لڑکے روتے پیٹتے ڈھاکا پہنچ گئے ہیں، ماں کی حالت نہایت ابتر ہے۔

''میں حیران ہوں۔''...... ان میں سے ایک لڑکا بات کرتے کرتے رکا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا...... ''ماں تم سے کہیں زیادہ اس کے لیے پریشان ہیں۔''

''ظاہر ہے'' ...... وہ بولا ...... ''ان کی ذمہ داری ان پر جو ہے۔''

''شبلی بھیا کی ڈھاکا میں گمشدگی کا طوفان آیا ہوا ہے۔ یونیورسٹی میں کوئی کلاس نہیں ہوئی۔''

ڈھاکا پہنچ کر جب وہ گھر جانے کے لیے رکشہ میں سوار ہوئے۔ تب اس نے بہت آہستگی سے کہا...... ''میں آپ کی شکر گزار ہوں، میری وجہ سے آپ کو بہت تکلیف اٹھانی پڑی ہے۔''

وہ مسکرا دیا تھا اور اس کی طرف متوجہ ہو کر نرم و ملائم لہجے میں بولا تھا...... ''خدا کا شکر ہے کہ میں تمہیں زندہ سلامت ڈھاکا لے آیا ہوں ورنہ میری ماں مر جاتی۔ نذرل چچا عمر بھر میری صورت نہ دیکھتے اور میں خود کو بھی کبھی معاف نہ کر سکتا۔''

اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو نکل کر ساڑھی پر گر گئے تھے۔ اس نے اپنا رخ بدل لیا تھا کہ کہیں اس کے ساتھ بیٹھا ہوا نوجوان انہیں نہ دیکھ لے۔

پر رات کی تاریکی کے باوجود وہ جان گیا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔

اور ماں نے جس طرح اسے اپنے سینے سے لپٹایا اور جیسے دھاڑیں مار مار کر روئی تھی اس نے اس کے دل پر بہت گہرا اثر کیا، بینو، فخر اور بلبل سبھی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

باہر نعرے لگ رہے تھے طلبا نے گھر کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ وہ جلد ہی نیچے اتر گیا تھا۔

ماں نے صدقہ دیا۔ قرآن پاک ختم کروایا، نفل پڑھے، غریبوں کو کھانا کھلایا۔

اور اس شام جب ماں اس کا سر اپنی گود میں لیے بیٹھی تھی، اس کے دل سے ہوک سی اٹھی...... ''ماں!''...... وہ سسک کر بولی...... ''آپ سے بچھڑ کر میں کیسے زندہ رہوں گی!''

''ہوں! تو گویا تم موت کی وادی سے لوٹ کر آئی ہو؟'' ......راجشاہی پان پر ڈھیر سارا کتھا تھوپتے ہوئے اس نے یہ بات اس سے یوں پوچھی، جیسے وہ کرکٹ کا کوئی میچ دیکھ کر آئی ہو۔

وہ کرسی پر ٹھسے سے بیٹھی تھی، سامنے ڈیسک پر خالی جار کی شیشی میں روکھتو ریدی کی بیلیں سفید دھاگوں سے لپٹی بہت دور کھڑکی تک چلی گئی تھیں۔ پتہ بہار کی دو ٹہنیاں دوسری شیشی میں پڑی تھیں۔ اپلائیڈ سائیکلوجی کی چند کتابیں ڈیسک پر اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔

تمباکو انڈیلنے کے بعد اس نے گلوری منہ میں رکھی اور اس کی طرف متوجہ ہوئی جو بستر پر اوندھی لیٹی اس کی ان حرکتوں کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

''ڈوب مرو کہیں...... عورتوں کی طرح تمباکو کھاتی ہو۔ ہے کوئی لڑکی والی بات تم میں؟'' ......اس نے جل کر کہا۔

''میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔''

''مائی گاڈ!...... کمبخت! ذرا اپنے اندازِ استفسار کو تو دیکھ'' ...... ''دیکھو بھئی! سنجیدگی سے بتاؤ کہ اس نے تمہیں کیسے اُٹھایا؟ کہاں کہاں لے کر گیا، کیسا برتاؤ کیا؟''

''ہوتم پوری بدمعاش۔''

''توتم مجھے اپنی شرافت کی داستان ہی سناڈالو'' ......اس نے عینک اتار کر میز پر رکھی اور بولی۔

اور سر کو تکیے میں گھساتے ہوئے اس نے جواباً کہا۔ ''بی جہاں آراء! گلے پڑا ڈھول بجانا ہی پڑتا ہے، اب جب میں اس کی سپرداری میں تھی تو جو کچھ بھی بن پڑا اس نے میری جان بچانے کے لیے کیا۔''

''دیکھو! بچپن میں پڑھی بائبل کے ایک دو جملے مجھے یاد آئے ہیں لوتم بھی سنو! وہ تھوڑی دیر چپ رہی۔ چشمہ اٹھا کر دوبارہ لگاتے ہوئے بولی۔

''اور یسوع نے کہا اس سے زیادہ محبت کوئی نہیں کرتا کہ اپنی جان تک اپنے دوستوں کے لیے خطرے میں ڈال دے...... کہو کیا کہتی ہو؟''

''بھیجے میں عقل نہیں رہی، نفسیات پڑھتے پڑھتے قطعی آؤٹ ہوگئی ہو۔ چلو اٹھو! چائے پلاؤ۔''

اور عین اس وقت رقیہ زیب النسا چہرے پر ہلدی تھوپے، پیٹی کوٹ اور بغیر آستین کے بلاؤز میں اندر آئی۔

گڈ گاڈ!...... بنگال کی لڑکیوں کو ہلدی سے اتنا پریم کیوں ہے۔ بس رات ہوئی اور ان کے منہ پیلے ہوئے۔

''اے سومی! شلپی کا بابا کیا تمہارا لوکل گارجین ہے؟'' وہ بستر پر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

''ہاں تمہیں کچھ اعتراض ہے؟'' اس نے مسکراتی آنکھوں سے اس نیم پاگل لڑکی کو دیکھا تھا۔

''مجھے تو نہیں ہاں وہ سلمٰی بہت پریشان ہے۔''

''کیوں؟ سلمٰی کیا اس کی سوت ہے؟''...... جہاں آرا نے کپ اسے پکڑاتے ہوئے کہا۔

''بکواس مت کرو جہاں آرا! ہاں جی! رقیہ زیب النساء ان قصوں کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ

بادل تمہیں کب پرو پوز کر رہا ہے؟''

''ارے بادل! لعنت بھیجو اس پر...... میں نے تو اسے ریجیکٹ کر دیا ہے۔''

اور گھونٹ گھونٹ چائے پیتی جہاں آرا کھلکھلا کر ہنسی اور اردو میں اونچی آواز میں بولی......''جواب نہیں اس بانکی سجیلی نار کا۔''

اس کی بھی ہنسی چھوٹ گئی۔ کپ لرزا اور گرم گرم چائے اس کے ہاتھوں پر گر پڑی۔

''مارڈالا ظالم''......اس نے ہاتھوں کو صاف کیا اور ان پر برنول کی ہلکی سی تہہ لگائی اور بولی۔

''سنو رقیہ! بھئی خوبصورتی کو زنگ لگ جائے گا۔ شادی کر لو کہیں جلدی جلدی۔'' اور اس کے جانے کے بعد جہاں آرا نے اس سے پوچھا۔

''یہ چکر کیا ہے؟ کچھ بتاؤ بھی۔''

''ارے بی بی! چکر تو کچھ بھی نہیں۔ بس اسی احمق نے چکر بنا دیا ہے۔ ڈھاکا کی ہائی کلاس سوسائٹی میں مووکرنے والا لڑکا اور شادی کرتا اس رقیہ زیب النساء سے، کوئی تک کی بات تھی۔

''نیچے نہیں چلو گی؟ مجھے فون کرنا ہے۔'' اس نے پاؤں میں چپل پہنتے ہوئے کہا۔

''تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ چھپاتی ہو ہم سے۔ بتائے دیتے ہیں کہ محبت کر بیٹھی ہو۔''

''محبت اور شلپی سے؟ نہایت احمق ہو تم، نظریاتی اختلاف ہے۔ نظریاتی اختلاف میری جان! اس ملک کو بنانے میں میرے عزیزوں کا خون بہا۔ اس کی حفاظت کے لیے میرا سارا خاندان دفاع میں...... ٹھیک ہے، اس نے میری جان بچائی، مجھے اس کی قدر ہے۔ پر اس سے زیادہ کچھ نہیں۔''

یہ تم لوگوں میں کیا برائی ہے کہ سارا دفاع خود سے منسوب کرتے ہو اور مشرقی پاکستان کو قطعی نظرانداز کر جاتے ہو''......اس نے لفٹ میں داخل ہو کر ایک تلے کا بٹن دبایا۔

''تم نے غلط سمجھا۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ مشرقی پاکستان کے نمایاں کردار ادا کرنے پر ہر پاکستانی کو فخر ہے۔''

''وہ سترہ دن ہماری قومی زندگی کے سنہری دن تھے۔ میں تو کہتی ہوں ایک بار اور لڑائی ہو جائے۔ سارے اختلافات خود ہی دھل دھلا جائیں گے۔''...... اس کے لہجے میں بہت حسرت تھی۔

''ارے جہاں آراء! اب تو اختلاف دھلتے نظر نہیں آتے، خود غرض لیڈروں نے بیڑا غرق کر دیا ہے۔''

''آڈیٹوریم میں لگے آٹومیٹک فون پر اس نے ڈھاکا چھاؤنی میں میجر منور سے بات کی کہ وہ ٹرنک کال یا وائرلیس پر اس کے گھر والوں کی خیریت دریافت کر کے اسے اطلاع دیں۔ کینٹین میں بریانی کھاتے ہوئے اس کی نظر رقیہ ہال کی جی۔ ایس پر پڑی جو لڑکیوں کے ایک گرہ میں کھڑی دھواں دھار باتیں کر رہی تھیں۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا''...... وہ جہاں آراء سے بولی تھی۔ چھاترو یونین کے اس مینن گروپ میں پھوٹ ڈلوا دیں، جی۔ ایس اور وی۔ پی اس بار الیکشن میں الٹ جائیں تو مزہ آ جائے۔''

''اسے الٹنا اتنا آسان سمجھ لیا ہے تم نے میری جان! یہ ہندو کی چہیتی ہے، خیال رکھنا۔''

اور جب وہ کھا پی کر باہر جانے لگیں۔ کینٹین کے دادو نے انہیں پکار کر کہا تھا......''اعطا آیا ہوا ہے، کیا کھاؤ گی نہیں۔''

''ارے کیوں نہیں کھائیں گے دادو!''......وہ اسے خریدنے کے لیے تیزی سے واپس پلٹی۔

اور جہاں آرا نے خود سے کہا تھا، اف توبہ کتنی چٹوری ہے!

باہر روشن انہیں ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ مجھ پر ڈپریشن کا شدید دورہ پڑا ہے۔ موڈ ایک دم بیزار ہے۔ طبیعت گھومنے پھرنے کو چاہتی ہے۔

تو پھر آج پرانے ڈھاکا کی صحرانوردی کریں؟

اور اسی حالت میں وہ تینوں رکشے میں لد گئیں، اولڈ ڈھاکا کی پیچ در پیچ گلیوں میں پھرتے ہوئے اسے یوں لگا جیسے تاریخ کی طاقچے میں سجی کتاب دھم سے سامنے آ پڑی ہے اور اوراق تیز ہوا سے پھڑ پھڑانے لگے ہیں۔ کہیں کہیں اب بھی کسی گلی کو سجاتی ماضی کی کوئی حویلی جس کے روغن اترے وسیع چوبی دروازے اور کھڑکیاں، شکستہ حال بلند و بالا چبوترے، باہر سے اندر کا حال بتاتے اس وقت کتاب میں رکھے سوکھے پھول کی سی داستان سناتے نظر آتے تھے۔ ان گلیوں کے سینوں میں بنگال کے سلاطین کے بھاری بھر کم قدموں کی چاپ کہیں دفن ہوگی۔ ان فضاؤں میں مغل شاہوں کی عظمتوں اور جاہ وجلال کے عکس محفوظ ہوں گے۔ قلعہ لال باغ، کبھی یہ قلعہ اورنگ آباد تھا۔ جب قلعہ اورنگ آباد ہوگا تو فن تعمیر کا ایک نادر اور دل کش نمونہ ہوگا۔ اب قلعہ لال باغ ہے تو شکستہ پا۔ نام بدلنے کے ساتھ ساتھ صورت بھی بدل گئی ہے۔ اسے اورنگ زیب کے بیٹے شہزادہ اعظم نے تعمیر کروایا تھا۔ بڑے سے بورڈ پر لکھے ہوئے تاریخی حوالے پڑھتے پڑھتے اس نے کتنی دیر لگا دی۔ اگلی دونوں برجیوں پر ایک حسرت زدہ نگاہ ڈالتے ہوئے وہ پلٹی۔ جہاں آرا ذرا دور بکتے چنے خریدنے چلی گئی۔ روشن اور وہ قریب ہی پری بی بی کے مقبرے کی طرف بڑھ گئیں۔ شکست و ریخت سے دوچار نواب شائستہ خان کی دلاری بیٹی کا مزار۔

اندر اور باہر کی بند اور کھلی آنکھوں نے عروج اور زوال کے کتنے سلسلے پل جھپکتے میں دیکھ ڈالے تھے۔ صدر گھاٹ پر تو میلہ لگا ہوا تھا، پھلوں اور سبزیوں کے ڈھیروں پر غریب لوگوں کے جتھے خریداری میں مصروف تھے۔ صدر گھاٹ کے بازار اندر ہی اندر پھیلے ہوئے تھے جہاں ضرورت کی ہر چیز سستے داموں بکتی ہے۔ دفعتہً جہاں آرا نے انگشتِ شہادت سے ایک سمت اشارہ کیا ''دیکھتی ہو اس طرف!''...... اس کی نگاہیں اٹھانے پر مغلیہ طرز تعمیر کی چند عمارات بصارت میں آئیں۔ استفہامیہ انداز میں اس نے جہاں آرا کی طرف دیکھا تھا۔ ڈھاکا کے

نوابوں کی تاریخی عمارات ہیں۔ وہ احسن منزل ہے جہاں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی تھی، تو پھر وہاں جانا لازم ہے۔ اس نے گویا اعلان کیا۔

نہیں! اس کی زیارت پھر کسی وقت پر اٹھا رکھو۔ میں بہت تھک گئی ہوں، روشن آگے بڑھنے کے قطعی موڈ میں نہیں تھی...... ''ہرگز نہیں، مائی گاڈ! کہیں یہ ممکن ہے کہ میں اس جگہ کو سلام کیے بغیر چلی جاؤں جہاں بنگال کے چند جیالوں نے آزادی کے اولین خواب کو تعبیر دینے کی پہلی کوشش کی۔''

''سنو! ماضی کو دہرانا چھوڑ دو۔ بنگال کو اب اپنے اس کردار پر بھی افسوس ہے'' جہاں آرا کی آنکھوں میں ننگے حقائق ناچ رہے تھے۔

پر اس جذباتی لڑکی کے لیے تو اب واپسی ممکن ہی نہیں تھی۔ بھاگنے لگی۔ بھاگتی گئی اور پھر جیسے وہ وسیع وعریض احسن منزل کے عین سامنے گھاس کے قطعے میں آکھڑی ہوئی۔ شہ نشینوں، غلام گردشوں، برجیوں اور طویل برآمدوں والی عظیم الشان دومنزلہ احسن منزل جس کے گرد اس نے دیوانہ وار چکر لگایا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر آواز دے...... ''نواب سلیم اللہ! تم لوگ کہاں ہو؟ دیکھو تو سہی، تمہارے گھروں کی دیواروں پر پاکستان کا جو نقشہ تمہارے ہاتھوں نے بنایا تھا، وہ اب بدل رہا ہے۔ تم جیسی تاریخ کے دھارے کو بدلنے والی کوئی شخصیت اب بنگال میں کیوں پیدا نہیں ہو رہی؟''

پھر جیسے اس کی آنکھوں سے ڈھیر سارے آنسو بہہ نکلے، جنہیں اپنے پلو سے صاف کرتے ہوئے وہ چپ چاپ گردن جھکائے افسردہ چال چلتی ان کے پاس آگئی۔

پھر وہ ریز گھاٹ گئیں۔ یہاں دریا کے کنارے دومنزلہ بلبل اکیڈمی تھی، وہ اندر چلی گئیں۔ ٹھنڈے اور تاریک کمرے بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔ ایک کمرے میں گٹار بج رہا تھا، بجانے والا بہت مہارت سے بجا رہا تھا۔ فرش پر بیٹھے چند لوگ سن رہے تھے۔

وہ تو خاصی محو ہوگئی۔ پر روشن جلد ہی انہیں وہاں سے گھسیٹ کرلے گئی۔

اور جب وہ واپس ہال آ رہی تھیں تو اس نے کہا چلو! ''مدھومیتا'' بنگالی فلم ''جیون تیکھے نیا'' دیکھنے چلتے ہیں۔ بہت شور ہے اس کا۔

پر فلم دیکھ کر ڈپریشن کا وہ دورہ جو صرف روشن پر پڑا تھا، اب تینوں پر پڑ گیا، انٹرول میں ہی اٹھ بھاگیں۔

''دیکھو ذرا ان کی دیدہ دلیری! فلم بنانے والوں کو گولی ماردینی چاہیے۔''

''مارشل لا کا زمانہ ہے۔ سنسر بورڈ نے اسے پاس کیسے کر دیا؟'' جہاں آرا غصے سے چیخ رہی تھی۔

اور وہ گم سم رکشے کے ایک کونے میں گھسی صرف یہ سوچ رہی تھی...... ''کیا یہ واقعی غلام ہیں؟ اور مغربی پاکستان کی کالونی بنے ہوئے ہیں!''

چلتے چلتے ٹھٹھک کر اس نے پیچھے دیکھا، شاید کسی نے پکارا تھا۔ نیو کیمپس کے کشادہ صحن میں بڑ تلے کے قریب کھڑی اس لڑکی کی آنکھوں میں عود کر آئی تھی۔ جب ایک خاصے خوش شکل، سمارٹ سے لڑکے نے اس کے بہت قریب آ کر نہایت ہی مؤدبانہ انداز میں درخواست کی کہ...... ''کیا وہ اسے اپنے وقت میں سے پانچ منٹ دے سکتی ہے!''

''کیوں؟ کس لیے! کیا کام ہے آپ کو مجھ سے؟''...... وہ خاصی تیز آواز میں بولی تھی۔

''آپ تھوڑی دیر کے لیے زحمت کیجیے گا۔ یہاں کھڑے کھڑے مقصد بتانا کچھ عجیب سا لگتا ہے''...... اس لڑکے نے رسان سے کہا۔

''کہاں جائیے گا؟''...... اس نے گردن کو ذرا خم دے کر تنقیدی نظر سے اسے دیکھا۔

''مدھومیتا کینٹین...... میں آپ سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''شکریہ! میرے پاس وقت نہیں''...... کہتے ہوئے اس نے آگے قدم بڑھائے۔

''دیکھیے! آپ کو شاید غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا نام ارسلان احمد ہے اور میں انٹرنیشنل ایڈمنسٹریشن میں ایم۔ اے کے سال اول میں ہوں''...... لڑکا گڑبڑاتے ہوئے بولا...... وہ ابھی

کچھ اور کہنے والا تھا کہ اس نے قدرے تلخی سے اس کی بات کاٹ دی۔

''آپ ارسلان احمد ہیں...... آپ ایم۔اے کے سال اول میں ہیں تو میں کیا کروں؟''

لڑکا جھینپا...... ''وہ دراصل بات یہ ہے''......اس نے تھوک نگلا...... ''ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہماری پارٹی میں شامل ہوں۔''

''مائی گڈنس!''......اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا...... یہ بتایئے آپ لوگوں کو پارٹی بازی کے سوا اور کوئی کام بھی ہے؟......نہیں بھئی مجھے کسی پارٹی کی ممبر نہیں بننا! کون اس جھمیلے میں پڑے۔یہاں تو بات بات پر چاقو چھریاں چل نکلتی ہیں۔''

''پنجاب سے تعلق رکھتے ہوئے بھی چاقو چھریوں سے ڈرتی ہیں آپ؟''

وہ چل پڑی تھی جب لڑکے کا یہ طنزیہ جملہ سن کر پلٹی۔ یہ بات اسے پسند آئی تھی۔ان ہی قدموں پر واپس لوٹتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔''کون سی پارٹی ہے آپ کی؟''

''اسلامی چھاترو شنگھو''......لڑکے نے متانت سے کہا۔

''اسلامی چھاترو شنگھو''......وہ دھیرے سے خود سے بولی۔

اس نے ایک نظر ڈھاکا یونیورسٹی کی وسیع عمارت پر ڈالی اور پھر اس لڑکے کو دیکھا جو اسے پارٹی میں شمولیت کی دعوت دے رہا تھا۔تب اس نے سوچا۔

''میرے وطن کا یہ حصہ جو کبھی کبھی مجھے خود سے ٹوٹتا نظر آتا ہے۔اسے قائم رکھنے کی جو جدوجہد یہ پارٹی کر رہی ہے اس نے تو بہت پہلے مجھے اس سے متاثر کیا ہے۔ہاں وقت کا یہ تقاضا ہے کہ اس کے ہاتھ مضبوط کیے جائیں۔''

اور اس نے پُر اعتماد آواز میں اس سے کہا...... ''میں آپ کی پارٹی میں شامل ہوتی ہوں اور یہ یقین دلاتی ہوں کہ میری ذات اس کے لیے یقیناً تقویت کا باعث ہوگی۔ پارٹی مجھے سرگرم اور مخلص پائے گی، انشاءاللہ!''

''انشاءاللہ!''......لڑکے نے کہا اور چند پمفلٹ اسے دیے...... ''انہیں آپ پڑھیے۔

ہمارے مقاصد کافی وضاحت سے اس میں بیان کیے گئے ہیں۔کل تین اور چار کے درمیان آپ فلیٹ نمبر 29 میں تشریف لے جایئے جہاں شیرِ بنگال اے۔کے فضل الحق کی صاحبزادی پارٹی خواتین سے خطاب کریں گی۔''اس نے تفصیل بتائی۔

جب وہ ہال میں داخل ہوئی تو میمن سنگھ کی وہ خوبصورت فیروزہ جس کے لانبے لانبے بالوں پر وہ عاشق تھی، اس سے ملی۔ وہ بہت بور ہو رہی تھی، اس کے گھر سے کچھ دنوں سے کوئی خط نہیں آیا تھا۔ باپ نے خرچ بھی نہیں بھیجا تھا، وہ پوکھر کی طرف جا رہی تھی۔ تاکہ وہاں کی رومان بھری فضا میں اپنا غم غلط کر سکے۔ اس نے اسے بھی ساتھ چلنے کی پیشکش کی اور اس کے ساتھ وہ بھی چل دی۔

چپو سنبھال کر اس نے ٹیگور کی غزل گائی، نذرل اور ٹیگور کی شاعری کا فرق اسے سمجھایا، اس کی آواز خوبصورت تھی۔

کنول پانی سے سر نکالے کھڑے تھے، جل بیل پھیلی پڑی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کئی پھولوں کو توڑا اور ان کی پتیاں نوکا میں بکھیرتے ہوئے عجیب سی اداسی محسوس کی۔

پھیکی دھوپ یونیورسٹی پروفیسرز کے فلیٹوں سے نیچے اتر رہی تھی۔ جگن ناتھ ہال کے سامنے ایک نئی عمارت بن رہی تھی جہاں کام کرتے مزدور ترنگ میں آ کر نہ جانے کیا کیا گا رہے تھے۔ دور کہیں ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ لتا اور شمشاد گا رہی تھیں۔

یہاں کے لوگوں کی نفسیات بھی عجیب ہے۔ اردو سے انہیں جتنی نفرت ہے، اردو گانوں سے اتنا ہی عشق ہے۔''اس نے سوچا اور مسکرا دی۔

چنبیلی ہال کے سامنے سے گزری...... چندن ڈھیر سارے جوتوں کے درمیان بیٹھا ان کی مرمت میں مصروف تھا۔ چندن جو ڈھکیہ تھا اور ڈھاکا نواب فیملی کا حد درجہ فرمانبردار، اسے کتنی تاریخی کہانیاں یاد تھیں۔

اس کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ بولی...... ''کہو چندن! کیسے ہو؟''

''بس اس مولا کی دیا ہے۔ ہاں، جوتا نہیں گٹھوائیے گا آپ۔''

''گٹھواؤں کیا؟ جوتا تو اب میرے پاس کوئی رہا ہی نہیں۔ نیا خریدوں گی، اسے توڑوں گی، تبھی تمہیں دوں گی نا''......وہ بیگ جھلاتے ہوئے آگے بڑھ گئی تھی۔

''یہ آپا بھی بس من موجی ہیں''...... چندن پان خوردہ دانتوں سے مسکراتے ہوئے خود سے بولا تھا۔

مین بلڈنگ کے ایک تلہ کے چکنے فرش پر دھوبی رنگ برنگی ساڑھیاں بکھیرے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی ساڑھیاں چھانٹیں اور انہیں بازو پر اٹھائے لفٹ میں داخل ہوئی۔ لفٹ مین نے اسے دیکھتے ہی دانت نکالے۔

''آپا! دوتلہ؟'' اس نے ہاتھ بٹن کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں چارتلہ''...... جواباً وہ مسکرائی۔

''جہاں آرا آپا کے پاس جائیں گی؟''......وہ معصومیت سے بولا۔

یہ سادہ سی زندگی جس میں دوسروں کے لیے خلوص ہی خلوص ہے، سب سے اچھی ہے۔ یہ لفٹ مین، کینٹین کے ملازم چھوکرے، مالی، دھوبی، موچی اور ہال کے کچن میں کام کرنے والی عورتیں، ان سب سے اس کی گہری دوستی تھی۔ گھنٹوں وہ ان کے پاس بیٹھی ان کی کتھا کہانیاں سنتی۔

اور یہاں جہاں آرا ایک دقیق عشقیہ مسئلہ سلجھانے میں مگن تھی۔ اردو ڈیپارٹمنٹ کی ایک لڑکی چہرے پر بارہ بجائے، میز کو زور سے بجاتے ہوئے بہ بانگِ دہل اعلان کر رہی تھی......

''اس نے آخر مجھے سمجھا کیا ہے؟ ابھی پچھلی جمعرات وہ مجھ سے ملا ہے اور اس نے اپنی شادی کا ذکر تک نہیں کیا۔ میں بائی ایئر چٹا گانگ جا کر اس کی سسرال کو بتاؤں گی کہ اس کے مجھ سے تعلقات ہیں۔''

''واللہ! بہت دلیر عاشق ہو۔''......اس نے کتابیں میز پر پٹخیں اور بستر پر لیٹتے ہوئے،

اس طوفانی عشق کرنے والی لڑکی کو دلچسپی سے دیکھا۔

''دیکھونا یہ شرافت ہے؟''......وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''قطعی نہیں، نہایت بے ہودہ حرکت ہے۔''

اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ جواب دیتی جہاں آرا نے اسے، اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا......''بھئی! یہ لڑکے کے گھر کا پتہ ہے اور یہ اس کی سسرال کا، ہاں دیکھو۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ دلہن اور اس کی بہنیں خاصی تیز ہیں۔ کہیں تمہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔''

''ارے واہ! مذاق ہے کوئی''......وہ گرجی۔ دیکھنا مزاج کیسے ٹھکانے لگاتی ہوں۔ وہ چٹ پکڑ کھٹ کھٹ کرتی کمرے سے نکل گئی۔

''بستے ہیں کیسے کیسے، تیری دنیا میں لوگ''......اس نے لمبی سانس لی اور اس سے بولی۔

''بی یہ ان کا مزاج درست کرنے چلی ہے۔ کتنی امید ہے کامیابی کی۔''

''صفر''......جہاں آرا نے ٹانگیں بستر پر پساریں اور بولی......''بہت چالاک بنتی ہے...... لڑکے کی بہنوں اور سالیوں نے جو ایک بال اس کی چندیا پر چھوڑ دیا تو جہاں آرا نام نہیں۔''

دراز سے اس نے جنرل نکالا اور چھیلتے ہوئے بولی......''لو کھاؤ! تمہارے لیے صبح سے سنبھالا ہوا تھا۔''

وہ دن بھر کی کارگزاری اسے سنا رہی تھی کہ جب اسے ایئرپورٹ پہنچنے کا پیغام ملا۔ پنجاب یونیورسٹی کی ڈاکٹر مسز عمر ''منیلا'' سے تعلیمی کانفرنس اٹینڈ کرنے کے بعد ڈھاکا ایک بجے پہنچ رہی تھیں۔ اور ویسٹ پاکستانی طلباء ان کا خیر مقدم کرنا چاہتے تھے۔

بہت میٹھی خوشبو تھی جو سارے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

اس نے کئی بار لمبے لمبے سانس لیے۔ اور اڑتی پھرتی اس خوشبو کو اپنے نتھنوں میں سمیٹا۔ پسی ہوئی ہلدی، سرخ رنگ کا کچا سوت، مختلف تھالوں میں سجے پان، چھالیہ، چاول، ناریل اور ناریل کا تیل مل کر شادی والے گھر میں اپنی مخصوص مہک بکھیر رہے تھے۔ رنگ برنگی ریشمی ساڑھیاں اور شانوں پر ڈھلکتے بھاری بھرکم جوڑے لیے عورتیں اندر باہر گھوم رہی تھیں۔

وہ ماں کے ساتھ یہاں ایک شادی پر آئی تھی اور اب انہیں انگنائی میں بیٹھا چھوڑ کر وہ دلہن کے کمرے میں آئی تھی جو لمبے چوڑے چوک پر بیٹھی اپنی سکھیوں سے باتیں کر رہی تھی۔

بلوغت میں داخل ہوتی دو لڑکیاں زمین پر بیٹھی ہتھیلیوں پر ابٹن زور زور سے گوندھتے ہوئے اپنی لگن میں گا رہی تھیں۔

''ہولدی بانٹوں، مہدی بانٹو۔''

''گائے ماکھو، گائے ماکھو۔''

موٹی سی ایک عورت، لمبی لمبی ٹانگوں والی، ایک چوکی لیے اندر آئی اور کمرے کے عین

وسط میں رکھ کر دلہن کی سہیلیوں سے دلہن کو وہاں لانے کے لیے کہا۔ پیلی ساڑھی میں لپٹی لڑکی کو جب وہاں لا کر بٹھایا گیا...... تو اس کے پاؤں کے قریب گوٹے اور موتیوں کی لڑیوں سے سجا چاول پھٹکنے کا سوپ رکھا گیا...... اس نے جھک کر دیکھا۔ اس میں پسی ہلدی تھی۔ تب ایک منقش لوٹا جس میں پتوں والی آم کی ڈالی لہرا رہی تھی لا کر وہاں رکھا گیا۔

دلہن کی انگوٹھی پر ہلدی لگا کر اس کا صدقہ اتارا گیا اور اس کے ساتھ ہی ناچ اور گیت شروع ہو گئے۔ ناچ بھنگڑے سے ملتا جلتا ہی تھا۔

ماں نے اسے آواز دی تھی۔ وہ کہہ رہی تھیں...... ''بارات آ گئی ہے، دیکھ لو۔''

وہ ماں کے ساتھ ایک محفوظ سی جگہ پر کھڑی ہو گئی۔ دولہا اپنے رشتہ داروں کے ساتھ پیدل آ رہا تھا۔ پیچھے چند لوگ گوٹا لگے سرخ خوان پوشوں سے ڈھکے چند تھال اٹھائے چلے آ رہے تھے، جب ان خوان پوشوں کو ہٹایا گیا تو ان میں رس گلے، ناریل، پان، چھالیا، اور رنگین مچھلیاں جن کے منہ میں چاندی کا ایک ایک روپیہ تھا، رکھی نظر آئیں۔

''ان روپوں کو مچھلیوں کے منہ سے سالیاں نکالتی ہیں''...... ماں نے اسے بتایا۔

دلہن کے لیے ایک سرخ ساڑھی اور ایک سیٹ زیور کا تھا۔

دروازے پر پہنچتے ہی دولہا کا راستہ روک لیا...... ''اب دولہا، دلہن کی ان بہنوں کو حسبِ توفیق کچھ نہ کچھ دے گا۔ اس رسم کو گیٹ چھٹائی کہتے ہیں۔'' ماں اسے بتاتی جا رہی تھیں۔

''ایسا تو پنجاب میں بھی ہوتا ہے، ماں!''...... اس نے کہا۔

دولہا کافی شوخ معلوم ہوتا تھا۔ ہنستے ہوئے دس دس پیسوں کے سکوں سے انہیں چڑاتا رہا اور آخر میں انہیں پانچ پانچ روپے دیے۔

دلہن کی بھابھی اور بڑی بہن نے اُبلے چاولوں کے پانچ گولے دولہا پر سے نچھاور کیے۔ اور سرخ ساٹن اور گوٹے سے سجی ایک چوکی پر، جس کے اردگرد کیلے کے درخت لگائے گئے تھے، لا کر بٹھایا۔ ایک بوڑھی عورت چمکتے تھال میں پانوں کے بیڑے لے کر آئی۔ دولہن کی

سہا گن بہن نے اس کے منہ میں پان ڈالا جسے دولہا نے کتر کر پھینک دیا۔ چار پانوں کے ساتھ ایسا ہوا تب پانچواں پان اس نے کھایا۔

اس رسم کے بعد دولہے کو باہر مردانے میں بھیج دیا۔

''دلچسپ رسمیں ہیں'' ......اس نے ماں کی طرف دیکھا...... ''ویسے تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ یہ رسمیں سبھی جگہ تقریباً ایک جیسی ہیں۔''

اسے اب بھوک لگ رہی تھی اور کھانے میں خاصی دیر نظر آ رہی تھی۔ ماں کی ایک پرانی ملنے والی بارات کے ساتھ آئی تھی۔ وہ ان کے ساتھ باتوں میں مگن تھیں۔

ماں نے رک کر اسے دیکھا اور کہا...... ''یہاں میرے پاس آ جاؤ۔'' ان کی ساتھی نے اس کے بارے میں استفسار کیا۔ جس پر وہ ہنستے ہوئے بولیں۔

''لو بھول گئیں، یہ میری بیٹی ہے۔''

خاتون نے ان کے شانے پر دوہتڑ مارا اور بولی...... ''کہاں سے نکالی ہے یہ؟''...... اندر سے گانے کی آواز آ رہی تھی۔

وہ اندر آ گئی۔ دولہن کو تیار کیا جا رہا تھا۔

تبھی دولہا کی بہنیں، سات پلیٹوں میں مٹھائی، دہی اور رس گلے لیے، گیت گاتی دلہن کے کمرے کی طرف بڑھیں۔

اب دھکم پیل شروع ہوگئی۔ اس نے سوچا یہ اندر آنا چاہیں اور انہیں باہر دھکیلیں گی، پر ایسا نہ ہوا۔''

''ایمون موجاں ہوئے نا۔''

''ایمون موجاں ہوئے نا۔''

''آ جکے بوز مکھے ہاسی......مکھے ہاسی''

(ایسی خوشی کبھی نہیں ہوئی۔ آج بہن کے منہ پر ہنسی ہے) کرتی کرتی وہ اندر آ گئیں۔

کھانا مزیدار تھا۔ مچھلی اور دہی اس کا خاص حصہ تھا۔

کھانا کھاتے کھاتے ماں نے بتایا کہ دولہا کے لیے خاص قسم کا کھانا، کٹھل والا پیٹھا بنایا جاتا ہے اور یہ کھانا دلہن اس کے لیے بناتی ہے، یہ ڈھلکیہ لوگوں کی خاص رسم ہے۔ کھانے کے بعد دولہا کو پھر اندر بلا لیا گیا۔ اس غریب کی جان چھٹنی آج مشکل ہے، اس نے ہنستے ہوئے سوچا۔

تخت پر بٹھا کر اس کے قریب پان کا بیڑا رکھا گیا اور اسے اٹھانے کے لیے کہا گیا پر جب وہ اٹھانے کے لیے جھکا اسے کھینچ لیا گیا۔ دو تین بار ایسا ہوا، تیسری بار اس نے جھپٹ کر چار پانچ پان اٹھا لئے۔ لڑکیوں نے خوب لعن طعن کی۔

دلہن کی بھانجی نے کچے سوت سے دولہا کو باندھا اور پانچ روپے لے کر اسے کھولا۔ آرسی مصحف کے بعد دولہا نے اپنے جھوٹے رس گلے اور دہی دلہن کو کھلایا اور ان رسموں سے نجات پائی۔

پر جب اس نے جہیز دیکھا تو حیران رہ گئی...... اتنا معمولی۔

واپسی پر ماں نے اسے بتایا ''بنگال میں جہیز کا رواج پہلے تو بالکل نہیں تھا، اب پھر بھی کچھ کچھ ہونے لگا ہے۔

یہ بہت ہی اچھی بات ہے، مغربی پاکستان میں غریب طبقہ اس لعنت سے پس گیا ہے۔

سر دھڑ کی بازی لگا کر وہ سیاست کے میدان میں کود پڑی۔ پڑھنا لکھنا، باقاعدگی سے کلاسیں اٹینڈ کرنا، سب ختم ہو گیا تھا۔ شلواریں، قمیص پاجامے اور بیل باٹم سوٹ اس نے لاکر (Locker) میں سنبھال دیے تھے۔ صبح سویرے وہ ابرق لگی اکڑی اکڑی سوتی ساڑھی پہنتی۔ بالوں کو کس قدر گوندھتی، ساڑھی کے آنچل سے شانے اچھی طرح لپیٹتی۔ چائے کی تھرموس، ابلے انڈے بیگ میں ڈالتی اور کنویسنگ کے محاذ پر نکل کھڑی ہوتی۔ میڈیکل کالج، انجینئرنگ کالج، لاء کالج، ایڈن گرلز کالج اور ڈھاکا کالج میں، اپنے ساتھی لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ گھومتی۔ پمفلٹ بانٹتی، پارٹی کے اغراض و مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالتی۔ کچھ لوگ سنجیدگی سے سنتے اور کچھ مذاق اڑاتے اور پھبتیاں کستے۔ کبھی کبھی اس کی زبان لکنت کھا جاتی، بنگلہ غلط بول جاتی۔ یوں بھی وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ کوئی بولتا بہاری ہے اور یہ سب سنتی اور اطمینان سے کہتی۔

نہی بنگالی، نہ بہاری، امی پاکستان۔

تب کچھ لوگ ہنستے آگے بڑھ جاتے اور کچھ کھڑے ہو جاتے۔

یہ ایک نظریاتی پارٹی تھی۔ مشنری سپرٹ خاصی زوروں پر تھی۔ پارٹی کے سبھی لوگ محنتی

اور مخلص تھے۔ رقیہ ہال میں کافی لڑکیاں اس میں شامل ہوگئی تھیں۔ تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی، کام کی رفتار تسلی بخش تھی اور اسے بھی سکون مل رہا تھا۔

اس دن جب وہ نیو مارکیٹ سے کینوس اور ڈھیر سارے کاغذ لے کر باہر نکلی تو ایک عجیب منظر اس کے دیکھنے میں آیا۔ پندرہ بیس ننگ دھڑنگ لڑکے جسم پر رنگ ملے، گلوں میں نیلے پیلے رومال باندھے، ریڑھیوں پر بیٹھے تالیاں بجا رہے تھے۔ چہرے ہرے لال رنگوں سے تھپے پڑے تھے۔

''ارے بھئی یہ کیا؟'' اس نے ارسلان سے پوچھا۔

''آج لا کالج کا ریگ ڈے ہے'' اس نے جواب دیا۔ ریگ ڈے کی تفصیلات بلاشبہ دلچسپ تھیں پر یہ بھوتوں کا سا حلیہ بنا کر گلی گلی، بازار بازار گھومنا اسے تو قطعی پسند نہ آیا۔

اب تو روز ہی ایسا منظر دیکھنے میں آتا۔ آج میڈیکل کالج ریگ ڈے منا رہا ہے۔ تو کل انجینئرنگ کالج۔ اسے غصہ آتا...... ارے! ان لوگوں کے دماغ خراب ہوگئے ہیں؟ مانا کہ سال آخر کے یہ طلبا ایک دن اپنی مرضی سے گزارنا چاہتے ہیں۔ پر کیا ضروری ہے کہ اسے اس طرح گزارا جائے کہ اچھے بھلے انسان تہذیب سے کوسوں دور نظر آئیں۔

باہر دھوپ چنبیلی ہال کی دیواروں پر بہت تیزی سے پھیل گئی تھی اور اندر وہ کمرے میں روشن اور مینا کو نئے پوسٹر دے رہی تھی۔ جب ایک نازک سی لڑکی نے کمرے میں آ کر کہا۔

اگر آپ سال آخر کی طالبہ ہیں تو ریگ ڈے منانے کے لیے پانچ روپے دیں۔

''کیا بات ہے! پانچ روپے بھی دوں اور بھوت بن کر ریڑھیوں پر تالیاں بجاتی بھی پھروں۔ میرا کیا دماغ خراب ہے۔''

لڑکی خاصی دلچسپ تھی۔ محبوبانہ انداز میں سر کو ہلاتے ہوئے بولی۔ ''ہم آپ کو ہرگز بھوت نہیں بنائیں گے بلکہ سرخ ساڑھی پہنا کر چینگوا میں لنچ اور بلاکہ میں فلم دکھائیں گے۔

روشن ہنستے ہوئے بولی...... ''سپنا! یہ سال رواں کی لڑکی ہے۔''

''تو شور کاہے کو اتنا مچا رہی ہے؟''......وہ کچھ غصے سے بولی۔

''تجربہ نہیں، نئی ہوں۔''

''پالیٹکس میں تو بہت تیز ہو۔''

''شامل ہوتی ہو پارٹی میں۔''

''دھن و باد''......لڑکی نے ہاتھ جوڑے ''گھر کی بڑی بیٹی ہوں۔ فارغ ہو کر چھوٹے بہن بھائیوں کو پالنا ہے۔ آزاد نہیں جو سیاست کرتی پھروں۔''

''اور اپنی ان بہنوں کے بارے میں کیا کہتی ہو۔ جن کا کھانا پینا اور اوڑھنا بچھونا سبھی سیاست ہے۔''

''اپنا اپنا نقطہ نظر ہے''......کہتی وہ باہر نکل گئی۔

اس شام ان کے لیڈر کا بنگلہ اکیڈمی میں ایڈریس تھا۔ اسے اٹینڈ کرنے کے بعد جب وہ واپس آ رہی تھی۔ اسے خیال آیا کہ ماں سے ملے خاصے دن ہو گئے ہیں۔ کیا سوچتی ہوں گی؟ وہ آمنہ کو ہال چھوڑتی ہوئی خود عظیم پور اسٹیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

ہوا میں ابھی تک ٹھنڈک ہے......وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سوچ رہی تھی، وہ ٹھٹھکی جب کوئی عین اس کے سامنے رکا تھا، پاؤں پر نظر پڑتے ہی اس کا دل دھڑکا......آنکھیں اوپر اٹھائیں، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''کیسی طبیعت ہے؟''...... بھاری آواز میں پوچھا گیا۔

''خدا کا شکر ہے''......اس نے خود پر قابو پایا۔

''پارٹی پروگریس؟''......اس نے دیکھا اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔

وہ کچھ آگے بڑھی۔ دو تین سیڑھیاں چڑھی اور پھر ایک ادا سے رخ پھیرتے ہوئے بولی۔

''ایکسیلنٹ''

''خوب!''...... کہتا ہوا وہ نیچے اتر گیا۔

''تو گویا یہ سب جان گیا ہے...... وہ زیرِ لب مسکرائی تھی۔ ٹھیک تو ہے، جاننا ہی تھا نا، یہ کوئی ایسی بات تھی جسے چھپایا جاتا اور یہ بھی ایک طرح اچھا ہی ہوا، کیا سمجھتا ہے وہ، اس حصے کے لوگ ابھی ملک کے وفادار ہیں۔''

یوں اسے کچھ عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ اس کے دیکھنے کا انداز کچھ بدلا ہوا تھا، وہ مسکرا بھی رہا تھا، اس کی باتوں میں بھی نرمی تھی۔

''ویسے ہے یہ آئیڈیل شخصیت کا مالک...... جسے ٹوٹ کر چاہا جا سکتا ہے۔''

اس نے آخری زینے تک پہنچتے پہنچتے یہ سب سوچ ڈالا تھا۔

اور ماں نے ملتے ہی ناراضگی کا اظہار کیا کہ اتنے دنوں کے بعد وہ آج آئی ہے، انہیں تو اس پر بھی بہت غصہ تھا کہ اسے کیا مصیبت پڑی تھی کہ وہ پارٹی بازی میں ٹانگ اڑا بیٹھی ہے...... وہ شاکی لہجہ میں کہہ رہی تھیں ''تم پردیس میں ہو اور تمہیں اپنی جان کی حفاظت کرنی چاہیے۔''

''ماں! آپ کو میرے متعلق یہ کس نے بتایا ہے؟''...... اس نے جانتے ہوئے بھی پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے میں گھر میں بیٹھی ہوں اس لیے مجھے کسی بات کا علم نہیں؟''

''ایسی بات تو میں نے کبھی نہیں سوچی ماں!...... پر آپ کو اس بارے میں شبلی نے بتایا ہے نا۔''

''ہاں! وہ ایک دن ہنستے ہوئے طنز سے کہہ رہا تھا...... ماں! تمہاری بیٹی تو سیاستدان بن گئی ہے''...... بینو اور بلبل بھی بتا رہے تھے۔

...... دیکھو بیٹے! وہ بہت فکر مندی سے بولیں ''یہاں کے حالات تم اچھی طرح جان گئی ہو۔ تم پڑھنے کے لیے آئی ہو، اس جھمیلے میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں...... تم جانتی ہو شبلی کی چکر بازی میرے لیے کتنی تکلیف دہ ہے اور اب تم بھی اسی راستے پر چل پڑی ہو۔ چلو وہ تو پھر لڑکا ہے، خدانخواستہ! کل بنگالی بہاری کا جھگڑا کھڑا ہو گیا تو مخالف پارٹیاں تمہارے خون کی پیاسی ہو

جائیں گی۔ یہ قوم بہت تنگ نظر اور ہٹ دھرم ہوگئی ہے۔''

''ماں! اسی تعصب کو کم کرنے کے لیے ہی تو میری پارٹی کام کر رہی ہے۔'' اس نے کہا۔

اس سے فخر اور بینو آ گئے۔ آتے ہی انہوں نے اسے مبارک باد دی۔ اور اس کے نام کے نعرے لگائے۔

''یہ کیا بے ہودہ پن ہے بینو!'' وہ چیخی۔

''ارے سومی آپا!'' وہ بولا ''یہ تو بہت ضروری چیز ہے۔ لوگ تو پیسے دے کر نعرے لگواتے ہیں اور میں مفت لگا رہا ہوں تو بھی آپ غصہ ہو رہی ہیں۔ لگتا ہے ابھی آپ سیاست کے گروں سے واقف نہیں ہوئیں۔''

تب اسے اپنا بچپن یاد آیا جب وہ جغرافیہ کی کتاب گود میں رکھے، جھوم جھوم کر سبق کو گھوٹا لگایا کرتی۔ چٹاگانگ، سلہٹ اور آسام کے پہاڑی سلسلے جو اسے کسی طرح یاد ہی نہ ہوتے تھے۔

اور اس وقت عین اس کے سامنے چٹاگانگ کی سبز پہاڑیاں، ہلکے ہلکے نیلے دھوئیں کے غبار میں لپٹی دور تک پھیلتی چلی گئی تھیں۔

ان کی گہری نیلی مزدا چٹاگانگ کے اندر داخل ہو رہی تھی جس میں وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔

صبح سویرے وہ ڈھاکا سے چلے تھے۔ سفر کافی لمبا تھا۔ راستے کی فیریوں سے وہ اب بالکل نہیں گھبراتی۔ خاصی عادی ہوگئی تھی۔ پر فیری آتی تو وہ یہ ضرور اپنے آپ سے کہتی......

''اللہ! گھڑ گھڑ کرتی یہ مشینیں اگر بند ہو جائیں تو پل بھر میں تختوں پر کھڑی کاریں اور لوگ نیچے گہرائیوں میں ڈوب جائیں اور بچنے کے لیے ذرا سا سہارا بھی نہ ملے''......

یوں یہ اور بات تھی کہ ایسے لمحوں میں وہ اسے بے اختیار یاد آتا تھا جسے وہ یاد کرنا بالکل نہیں چاہتی تھی۔

''ان فیریوں پر بند باندھ کر مضبوط پل بنانے چاہئیں۔ پر اتنا پیسہ خرچ کرنا اس ترقی

پذیر ملک کے شاید بس کی بات نہیں۔ اس لیے کہ یہاں جم خانوں، کلبوں اور اعلیٰ پایہ کے ہوٹلوں کی اشد ضرورت ہے۔

سفید فورڈ کونسل میں سفر کرتے تین آسٹریلین، ہر فیری پر جب ارد گرد کی دھڑا دھڑ تصویریں کھینچتے تو اسے بھی کیمرہ نہ لانے کا افسوس ہوا۔

پہاڑی پیچ وخم نے اس کی طبیعت کافی خراب کی۔

انہیں واپڈا ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرنا تھا۔ نیچی سی پہاڑی پر جدید طرز کی ایک عمارت کے سامنے کار رک گئی۔ وہ تعداد میں کل پانچ تھے۔ تین لڑکیاں اور دو لڑکے جو پارٹی کی طرف سے چٹاگانگ یونیورسٹی اور میڈیکل کالج میں کنویسنگ کے لیے آئے تھے۔

تازہ دم ہو کر انہوں نے کھانا کھایا۔ یہ سادہ بھات، گوشت اور سلاد پر مشتمل تھا۔ چائے پی کر انہوں نے پروگرام کی تفصیلات کا جائزہ لیا۔

شام ابھی جوان تھی، جب وہ چٹاگانگ کی سیر کے لیے نکلے۔ مزمل مولا، تاریخی واقعات اور معلومات کا ایک انسائیکلو پیڈیا تھا۔ سڑک کی ڈھلان سے اُترتے ہی اس نے کہا......''کل سلطان بایزید بسطامی کے مزار پر چلیں گے جو شہر سے سات میل دور نصیر آباد کے ٹیلے پر ہے۔''

وہ دائیں بائیں دیکھتے ہوئے مزمل کو سن رہی تھی۔

اونچی نیچی سرسبز پہاڑیوں کے سینوں پر چھوٹے بڑے مکان یوں ایستادہ تھے جیسے کسی شو کیس کے مختلف شیلفوں میں رکھی گئی گڑیاں۔

دریائے کرنافلی کے پانیوں پر اتری ہوئی شام کی دلہن کس قدر حسین تھی کہ جسکی پور پور سنہری غازے میں لپٹی ہوئی ماحول کو زرنگار بنائے ہوئی تھی۔ کراچی کے بعد پاکستان کی اس سب سے بڑی بندرگاہ کا ساحل جہازوں، لانچوں، سٹیمروں اور کشتیوں سے بھرا پڑا تھا۔

بے کراں پانیوں پر بستا شہر اسے ہیون سانگ کی وہ بات یاد دلا گیا جو اس نے یہاں سے گزرتے ہوئے کہی تھی اور جو تاریخ کے سینے میں محفوظ تھی۔

شہر تو ایسے لگتا ہے جیسے پانی کی تصوراتی سیج پر کوئی حسین سراپا محوِ استراحت ہو۔ واقعی چٹاگانگ ایسا ہی شہر تھا۔

ریاض الدین بازار کی سیر ایک اور زبردست ایکٹویٹی تھی۔ کھیروں کا جہازی اور مرچوں کا چُنامُنا سائز دونوں نے اسے کھلکھلا کر ہنسنے پر مجبور کر دیا۔

اناس سے دکانیں بھری تھیں۔ سلہٹ کا شنگاپوری اناس ذائقے، رسیلے پن اور مٹھاس میں لاجواب تھا۔ اس نے ڈٹ کر کھایا اور ساتھ لے جانے کے لیے بھی خریدا۔

رات کو وہ حمیدہ شریف کے ساتھ جہاں آرا کے گھر گئی۔

مولانا محمد علی روڈ پر دو کنال کے رقبے میں گھرا ہوا اس کا محل نما گھر مکینوں کے اعلیٰ ذوق اور امارت کا ثبوت تھا۔ گھر والوں نے والہانہ گرم جوشی سے ان کا خیر مقدم کیا۔

بہت دیر گپ شپ رہی، خوب خوب باتیں ہوئیں۔ آٹھ بجے جب وہ جانے کے لیے اٹھیں تو گھر کا ہر فرد چاہ رہا تھا کہ وہ رات یہاں گزاریں۔ اماں ابا کی بے پناہ اپنائیت سے وہ بے حد متاثر ہوئی۔ اس نے معذرت کی اور انہیں بتایا کہ آرٹ گیلری میں زین العابدین کی تصویروں کی نمائش کا آخری دن ہے اور وہ وہاں جانا چاہتی ہے۔

دس بجے وہ چٹاگانگ کلب گئیں۔ صوفیہ لارین کی فلم دکھائی جانے والی تھی، رش شاید اسی وجہ سے بہت زیادہ تھا۔

اور برآمدے میں کافی پیتے ہوئے وہ عورتوں کو آتے جاتے دیکھتی رہی۔ نیلگوں روشنی میں لاؤنج کی ویرانی نمایاں تھی۔ غیر ملکی بھی کافی تھے۔ وہ رقیہ کے ساتھ اندر گئی۔ یہاں ایک کمرے میں بلیئرڈ کھیلا جا رہا تھا۔ اونچی اونچی کرسیوں پر بیٹھ کر کچھ دیر اس نے دیکھا پر لطف نہ آیا۔ کھیلنے والے ابھی اناڑی تھے۔

اگلی صبح وہ چٹاگانگ میڈیکل کالج میں گھومے۔ نئی عمارت عالی شان تھی۔ یہاں وہ مغربی پاکستان سے آئے ہوئے طلبا سے بھی ملی۔ ان میں سے کچھ ایکسچینج پروگرام کے تحت آئے

تھے اور کچھ اپنے خرچ پر...... یہ لوگ بھی پریشان ہی تھے۔

وہاں سے انہوں نے چٹا گانگ یونیورسٹی کا رخ کیا۔ شہر سے بارہ میل دور یہ جدید طرز کی یونیورسٹی ابھی زیر تعمیر تھی۔ مختلف پہاڑیوں پر مختلف ڈیپارٹمنٹ تھے۔

''اللہ کا شکر ہے جو میں یہاں نہ آئی۔''...... وہ حمیدہ سے بولی ''وگرنہ اتنی رومان بھری فضاؤں میں میرا جی تو کبھی پڑھائی میں نہ لگتا۔''

یہاں کی فضا نسبتاً بہتر تھی۔ لڑکے لڑکیاں سیاست کے چکروں کی بجائے پڑھائی میں کافی سنجیدہ نظر آتے تھے۔ انہوں نے طلبا سے باتیں کیں۔ اپنی پارٹی کے پمفلٹ انہیں دیے، دیواروں پر پوسٹر لگائے اور اندازہ لگایا کہ یہاں پارٹی کے لیے ڈھاکا سے زیادہ سکوپ ہے۔

ان کے دن کا بیشتر حصہ یونیورسٹی، شام میڈیکل کالج اور رات چٹا گانگ نیو مارکیٹ ساحل سمندر اور کلب میں گزرتی۔

دورہ چھ دن کا تھا۔ دو دن کے بعد لڑکوں نے جو پروگرام ترتیب دیا، اس میں کپتائی، رانگاتی، چندر گونا اور کاکس بازار کی سیر تھی۔

چندر گونا میں کرنافلی پیپر مل دیکھنے کی بات ہوئی تو اس نے فوراً کہا...... ''بھئی! مجھے اب پیپر مل کی سیر نہیں کرنی، میں کاغذ کی پیدائش کے تکنیکی عمل سے بخوبی آگاہ ہو چکی ہوں۔''

''چلو تم سمپان میں بیٹھ کر دریا کی سیر کر لینا''...... عبداللہ بولا۔

''آپ کی اطلاع کے لیے میں سمپان میں بیٹھ چکی ہوں اور یہ بھی جان چکی ہوں کہ ان کشتیوں کا رواج عرب جہاز رانوں نے کیا تھا۔''

''تو پھر تمہیں وہاں کرنافلی میں دھکا دے دیں گے، ذرا غوطے وطے کھا لینا''...... مزمل نے ہنستے ہوئے ٹکڑا لگایا۔

''ارے چلو چھوڑو مزمل! تم سمجھتے ہو کہ تم بنگالی ہی غوطے کھانے میں ماہر ہو، میں تمہارے پدما کی طوفانی موجوں میں یہ کام بھی کر بیٹھی ہوں۔''

''ماشاءاللہ! ذرا یہ بتاؤ کہ کون سا کام تم نے چھوڑا ہے؟''......رقیہ فوراً بول اٹھی۔

چندر گونا کے لیے وہ بہت سویرے نکلے۔ رات بارش ہوئی تھی اور موسم بے حد خوشگوار تھا۔ راستہ خوبصورت اور دل موہ لینے والا تھا۔

مِل کی عمارت بہت شاندار تھی۔ چٹا گانگ کی پہاڑیوں کے جنگلات کا بانس اس کاغذ کی تیاری میں استعمال ہوتا تھا۔ طریقہ کار کم وبیش وہی تھا جو وہ کھلنا نیوز پیپر مل میں دیکھ چکی تھی۔ پر یہاں وہ ہوا جس سے وہ کھلنا میں خوف زدہ تھی۔ مارکیٹنگ (Marketing) منیجر نے صورت حال کا اس درجہ سفا کی سے جائزہ پیش کیا کہ وہ خوفزدہ ہوگئی۔ اس نے بتایا کہ چٹا گانگ کے ان ساحلی علاقوں میں بانس نے غریب آدمی کی جھونپڑی سے لے کر اس کے منہ میں بھات ڈالنے تک کی ذمہ داری اٹھا رکھی تھی اور اب یہ مہنگا ہونے کے ناطے اس کی رسائی سے اوپر جا رہا تھا۔

اور یہ بات بھی وہ کس دکھ اور کرب سے بار بار دہرائے چلا جا رہا تھا کہ بانس کا اس کثرت سے استعمال تو ہمارے جنگلات کو خالی کر دے گا۔ جتنی کھپت پیداوار میں ہے، اتنی تیزی ان کی افزائش میں نہیں۔

اور جب اس نے طنز سے بھرپور نظروں سے سمعیہ علی کو دیکھا اور کہا...... ''سچی بات ہے کہ آپ کے اسلام آباد کے محل مینارے تو ہمارے غریب کی زندگی کا پٹڑا کر کے دم لیں گے۔

تو مانو اسے یوں لگا جیسے اس کی رگ رگ میں سے شرمندگی، دکھ اور ندامت کا پسینہ پھوٹ نکلا ہو۔ کس قدر کرب تھا اس کے لہجے میں جب وہ بولی تھی...... ''کاش! میرے بس میں ہوتا تو میں اسلام آباد اٹھا کر آپ لوگوں کے قدموں میں ڈھیر کر دیتی کہ مجھے تو اپنے وطن سے کوئی بھی چیز عزیز نہیں، پر میری بساط صرف کُڑھنے، جلنے اور اپنا خون آپ پینے تک ہے اور میں آج کل یہی کام کر رہی ہوں۔''

چندر گونا سے کپتائی کا سفر، باوجود راستے کے حسن اور دلآویزی کے اسے متاثر نہ کر سکا۔ پہاڑی علاقے کے دونوں اطراف بانس کے گھنے جنگلوں کے ساتھ ساتھ ناریل، سپاری اور کھجور

کے درختوں سے ماحول پُرسحر بنا ہوا تھا۔

رقیہ نے ایک بارنہیں کئی بار اسے متوجہ کیا، پر اس کی آنکھیں بھر بھر آ رہی تھیں جنہیں جانے کتنی دِقتوں سے وہ نمناک ہونے سے بچانے میں لگی ہوئی تھی۔

کھجور کے درختوں نے اسے ضرور متوجہ کیا کہ یہ یہاں کیسے؟ اس کی وضاحت مزمل مولا نے کی کہ یہ عرب تاجروں کا تحفہ ہے جو مختلف اوقات میں بحری راستے سے یہاں وارد ہوئے۔ یہ سمپان بھی ان کے جہازوں کے نمونے پر ہے۔ ہاں البتہ ان درختوں پر پھل نہیں پکتا۔

مزمل کی اس بات پر اس نے حیرت سے اسے دیکھا اور بولی...... ''پھل نہیں پکتا، پر میں نے تو اس کا گڑ کھایا ہے۔'' صاحب رائے میں دادی ماں کے گھر کھجور کا گڑ اسے اتنا بھایا تھا کہ وہ دن میں تین چار بار ان کے سٹور میں گھس کر دیا نما کچی ٹھوٹھی میں سے ڈلی توڑ کر باہر لاتی اور پھر منہ میں رکھ کر اسے چوستی رہتی۔

عبداللہ تفصیل بتانے لگا...... ''بیچارے پھل کو تو پکنا نصیب نہیں ہوتا، دراصل پھل کے پکنے کے وقت دھواں دھار قسم کی طوفانی بارشیں شروع ہو جاتی ہیں۔ بیچاری کھجوروں کو درختوں پر ہی پھپھوندی لگ جاتی ہے۔ رہا گڑ تو درختوں کو چوٹی کے قریب سے تیز آلے سے کٹ دے کر ایک لمبے منہ کا ایک برتن اس کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے رس اس میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ اسی رس کو آگ پر گاڑھا کر کے گُڑ بنا لیا جاتا ہے۔

دریائے کرنافلی پر کپتائی بند انجینئرنگ کا شاندار شاہکار تھا جسے دیکھ کر اور جس کی بجلی پروڈکشن کے بارے میں جان کر اس کی جلتی آنکھوں، اس کے جلتے دل اور جلتی رگوں میں ٹھنڈ اتری اور اس کی دل گرفتگی کم ہوئی۔

بڑے بڑے پہاڑوں کے سینوں کو چیر کر اور اس منہ زور دریا کو نتھ ڈال کر جو عظیم الشان اور پُرشکوہ بند وجود میں آیا تھا اسے دیکھ کر اس نے یہ بھی اپنے آپ سے کہا تھا...... ''آخر یہ چیزیں کیوں نظروں سے اوجھل رہتی ہیں۔''

کپتائی جھیل کی سیر اور بریانی، تازہ جھینگون کا شوربہ، روسٹ مرغی وسلاد کھانے کا مزا آیا۔
کھانے سے فراغت کے بعد ان کا مارچ، رانگاماٹی کی طرف ہوا۔ رانگاماٹی، چکمہ قبائل کی مرکزی جگہ ہے۔ چٹاگانگ کے ان پہاڑی جنگلوں میں ان خوفناک جانوروں کے درمیان مختلف قبائل آباد ہیں۔ یہ بدھ مت کے پیروکار ہیں۔ چکمہ ان کی مادری زبان ہے۔ رانگامتی پہنچ کر احساس ہوا کہ رنگوں اور نظاروں کی ایک اور دنیا اسے حیرت زدہ کرنے کے لیے موجود ہے۔ سرکٹ ہاؤس میں کچھ دیر ستانے کے بعد وہ کرنافلی دریا کے اس پار چکمہ راجا کا محل دیکھنے گئے۔ ریسیپشن روم، مہمان خانے، سبھی نوادرات سے سجے ایک ایسی دنیا کی داستان سنا رہے تھے جو قدیم ترین تہذیب کی نمائندہ تھی۔ راجہ ملک سے باہر تھے، رانی بیمار تھیں۔ انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا، چائے بھیجی گئی۔ وہ چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑے، اس پیانو کے پاس آ کھڑی ہوئی جس کی قدامت اور شان وشوکت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ واپسی جلد ہوگئی۔ کشتی کے ملاح نے ٹیگور کا گیت گایا۔
اسے تو کچھ سمجھ نہ آیا پر بولوں میں جو نغمگی تھی، بس وہ اس سے محظوظ ہوتی رہی۔
وہ ہاٹ کیا گئی کہ اسے یوں لگا جیسے اس کے بچپن کی رنگ رنگیلی چیزیں، چمکتے دمکتے بٹنے، رنگین گڑیوں کے کپڑے اور پتنگوں سے وابستہ یادیں جو دماغ کے کسی گوشے میں سکڑی سکڑائی پڑی تھیں، اب یکدم چھلانگیں مارتیں، کلکاریاں بھرتیں، سامنے آ کر ڈھیر ہوگئی ہیں۔
عورتوں نے اپنے جسموں پر جو کپڑے پہن رکھے تھے وہ ویسے ہی تھے جیسے وہ اپنی گڑیوں کو پہنایا کرتی تھی۔ پاؤں سے اونچے تنگ سکرٹ اور بلاؤز نما۔
خیموں کی ایک لمبی قطار کے سامنے آریائی اور منگول خدوخال والی چکمہ عورتیں، گھونگھے، سیپیاں، مونگے اور فیروزوں کے ہار، مقامی طور پر بنے ہوئے سوتی رنگین کپڑوں کے ڈھیر اور بانس کی سجاوٹی اشیاء سجائے بیٹھی لمبے لمبے پائپوں سے تمباکو نوشی میں مصروف تھیں۔
ذرا دوران کے ننگ دھڑنگ بچے پتنگ بازی میں جتے ہوئے تھے۔ وہ کچھ دیر ان کے پتنگ اڑانے کے عجیب وغریب انداز کو دیکھتی رہی۔ پتنگ کو ڈور دینے کے لیے لڑکے پیچھے جا رہے تھے، یہ

بات ذہن میں رکھے بغیر کہ وہ کسی کھائی کھڈے میں بھی گر سکتے ہیں۔ عبداللہ نے اسے بتایا کہ جب پتنگ اتارنی ہوتو پھر پیش قدمی ہوتی ہے، یہ پس قدمی اور پیش قدمی خاصے ہنسنے والی چیزیں تھیں۔

کرنافلی کے پانیوں پر سمپان میں یہ سفر سُندر بن جیسی فینٹسی لیے ہوئے تھا۔ بدھ بھکشوؤں کا دیدار، ماگھ راجہ کا محل اور ان سے ملاقات، سُندر بن کے گھنے جنگلات میں خوفناک جانوروں اور ہاتھیوں کے درمیان رہنے والے پنکھوس، مورنگ موک اور ماگھ قبائل کے لوگوں کی داستانیں جنہیں سن کر اسے یوں لگا جیسے اسے کوئی الف لیلوی کہانی سنائی جا رہی ہے۔

وہ رات بھی یادگار تھی جب لڑکے، قبائلی لڑکوں کو پکڑ لائے جنہوں نے اِس خوبصورتی سے بانسری بجائی کہ چند لمحوں کے لیے اسے کچھ یاد نہیں رہا۔

اگلے دن کا پروگرام، کا،کس بازار کے لیے تھا۔ کا،کس بازار کا راستہ بہت خوبصورت تھا۔ دن ڈھلے وہاں پہنچا گئے۔ ریسٹ ہاؤس میں سادہ چائے کا ایک ایک کپ پی کر جب انہوں نے بل مانگا تو وہ سولہ روپے تھا۔

''گڈ ہیونز، یہاں رات کا کھانا کھایا گیا تو ہمارا پٹڑا ہو جائے گا''......حمیدہ شریف نے کہا۔

اور پھر وہ اس لمبے چوڑے دو منزلہ ریسٹ ہاؤس میں آئے جو سیاحوں کے لیے حال میں ہی تعمیر کیا گیا تھا۔

رات چاندنی تھی۔ برآمدے میں کھڑے وہ سمندر اور اس کا مہیب شور سن رہے تھے۔ اس نے ساحل پر چلنے کے لیے کہا پر عبداللہ بولا۔

''اس وقت وہاں جانا ٹھیک نہیں۔ دریائی کیڑے مکوڑے باہر نکل آتے ہیں۔'' مزمل مولا نے کچھ خوفناک کہانیاں سنانے کی کوشش کی۔ جس پر وہ بولی...... ''اے مزمل! تم مجھے ڈرانا چاہتے ہو، تو بھئی میں اتنی بزدل نہیں ہوں، ہاں اگر یہ حمیدہ کے لیے ہیں تو ضرور سناؤ۔ یہ آدھی رات کو یقیناً......مزمل مولا، مزمل مولا کہتے ہوئے تمہارا دروازہ کھٹکھٹائے گی۔''

رات کا کھانا کھا کر وہ آرام کے لیے اپنے اپنے کمروں میں آ گئے۔ حمیدہ اور مینی لیٹتے

ہی سوگئیں اور وہ زولا کی The Human Beast دیکھنے لگی۔ باہر لہروں کا شور بہت زیادہ تھا۔ ناول کی ہیروئن نفسیاتی، جنسی مریض تھی۔ کتاب اُٹھا کر اس نے دور پھینکی۔ ٹرانسسٹر کھولا، کہیں بھیرویں گائی جا رہی تھی۔ وہ جھنجھلائی اور گاؤن کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے باہر نکل گئی۔

اور یہاں اس لمبے برآمدے میں ریلنگ کے سہارے کھڑے ہوئے اس نے سوچا۔ چاندنی، شوخ اور چمکیلی ہے۔ سمندر میں جوار بھاٹا اٹھ رہا ہے اور کاکس بازار کا ستر میل لمبا سنہری ساحل ہے۔ اب اگر مجھے گاڑی چلانی آتی تو میں اس کے کنارے کنارے ڈرائیونگ کرتی اور اس فسوں خیز چاندنی سے بھرپور لطف اٹھاتی۔

دور گیسٹ ہاؤس کی سرخ اور سنہری بتیاں جگمگا رہی تھیں۔ سامنے وی۔ آئی۔ پی کی سفید عمارت چاندنی میں چمک رہی تھی۔

''دیکھو تو! ان کم بختوں کو نیند آ گئی ہے۔''...... اس نے خود سے کہا ''کتنے بور ہیں یہ! بھلا اتنی حسین رات کوئی سونے کے لیے ہے۔''

اس نے سوچا کہ وہ مینی اور حمیدہ کو جگائے پر وہ رکی، مینی شام سے سر درد کی شکایت کر رہی تھی۔ سارا برآمدہ سنسان پڑا تھا۔ گیسٹ ہاؤس کی طرف سے ایک گاڑی آتی جان پڑی، اندر کی بتیاں گُل تھیں۔ ہیڈ لائٹس سے کچھ دکھائی نہ دیا کہ کار میں کتنے لوگ ہیں۔

کوئی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ آنے والے کے قدموں کی آواز سناٹے میں اور بھی نمایاں تھی۔ اس نے اندر چلے جانے کے بارے میں سوچا۔ پر بعد میں وہ خود سے بولی...... ''میں بھی عجیب ہوں، مجھے کسی نے کیا کہنا ہے۔''

وہ گاؤن کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اطمینان سے سامنے سمندر کو دیکھتی رہی، آنے والا چلتے چلتے، ٹھٹھک کر رکا اور اس کے ساتھ ہی اس نے بھی گردن موڑی۔

وہ حیران رہ گئی۔ ماں کا بیٹا، سرمئی چادر کی بکل مارے ہاتھ میں بریف کیس پکڑے کچھ دور کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ برآمدے میں جلتے بلب کی روشنی اور چاندنی دونوں مل کر اس کے

چہرے پر پھیلے حیرانی کے اثرات بہت واضح کر رہی تھیں۔

''آپ یہاں کیسے؟'' اس نے پوچھا۔

اس نے لمبی، نازک گردن کو اونچا کیا۔فخر اور غرور کی بلندی سے اسے دیکھا اور کہا...... ''ہم چٹا گانگ کنوینسگ کے لیے آئے تھے، سوچا جاتے جاتے کا'کس بازار بھی دیکھتے جائیں۔''

وہ رکی۔ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا، اس نے کپکپی محسوس کی اور جسم کو گون کے اندر سکیڑتے ہوئے بولی۔

''میرا خیال اگر غلط نہیں تو آپ بھی شاید اسی مقصد کے لیے آئے ہیں۔''

''جی نہیں۔''...... بلا کا اعتماد تھا اس کے لہجے میں۔

بہت غصہ کھایا اس نے۔ بہت تنک کر بولی...... ''ہاں آپ لوگوں کو ان باتوں کی بھلا کیا ضرورت ہے۔''

''تعمیر سے تخریب آسان ہوتی ہے۔چیزوں کو بنانا جتنا کٹھن اور مشکل ہے، انہیں بگاڑنا اتنا ہی آسان''...... اس نے چوٹ کی۔

''ہاں محنت، شوق اور لگن سے بنائی ہوئی چیزیں جب آزار دینے لگیں تو انہیں توڑ دینا ہی اچھا رہتا ہے۔''

اس نے بریف کیس کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔اسے غور سے دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔

اور چاندنی کے غبار میں لپٹی ہوئی بال کٹی لڑکی کا اس سے جی چاہا کہ وہ یا تو اس کی مرمت کر ڈالے اور یا پھر خود اس ریلنگ سے نیچے کود جائے۔ بھلا خودکشی کے لیے اس سے بہتر اور موقع کون سا ہو سکتا ہے۔

پر جلد ہی غصے سے تپتے اس کے کان ٹھنڈے ہو گئے۔سر جھکائے اپنے کمرے کی اور بڑھتے ہوئے اس نے مایوس آواز میں خود سے پوچھا۔

''کیا وہ ٹھیک کہتا ہے؟''

سمعیہ علی اس وقت پبلک لائبریری کے سامنے والی سڑک کی پٹڑی پر بہت فراغت سے بیٹھی، ابلے پیاز ملے چنوں کو بکری کی طرح منہ چلا چلا کر کھانے میں جتی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ آنکھوں پر چشمہ چڑھائے، گود میں ڈھیر سارے موٹے موٹے بیر رکھے، ہاتھوں میں مرچ ملے نمک کی پڑیا پکڑے، جہاں آرا بھی بیٹھی تھی۔

کیمپس کے سامنے والی سڑک آج بہت ویران تھی۔ اِکا دُکا راہگیر چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ وجہ وہی پرانی تھی۔ ایک بہت بڑے جلاؤ گھیراؤ والے لیڈر نے جنرل سٹرائیک کال کی تھی۔

وہ اوپر اپنے کمروں میں سخت بور ہو رہی تھیں۔ دن بہت ڈل لگ رہا تھا۔ تب وہ دونوں نیچے آئیں۔ کامن روم میں بیٹھ کر اخبار دیکھتے ہوئے انہوں نے شہر میں چلنے والی مختلف فلموں پر تبصرے کیے۔ پر اُداسی دور نہ ہوئی۔

''چلو جہاں آرا! باہر چلتے ہیں۔''......اس نے اکتاہٹ سے کہا۔

''جانے کیا پارہ بھر دیا ہے اللہ نے تجھ میں۔ ٹکتی بھی ہو کہیں۔ باہر کس کے پاس جائے گی تو۔''

''کیا بکواس شروع کردی ہے، اٹھتی ہے کہ نہیں''......وہ چڑ کر بولی۔

دونوں گیٹ سے باہر نکلیں۔ یہاں سرخ سرخ بیر بک رہے تھے اور اُبلے چنے خوانچے پر سجے تھے۔

بہت تاسف سے انہوں نے اپنے حنائی ہاتھوں کو دیکھا، اب کیا کیا جائے! دونوں میں کوئی بھی اوپر جانے کے لیے تیار نہ تھی۔

لائٹ آف تھی، لفٹ کام نہیں کر رہی تھی۔ کون اتنی لمبی چوڑی سیڑھیاں چڑھ کر جائے۔

''چلو! نومی سے مانگتے ہیں''......اس نے تجویز کیا۔

''چغد ہو!......نوکروں سے مانگنے چلی ہو۔ کیا ٹانگیں نہیں، جاؤ نا لے آؤ۔''

''مجھے کہہ رہی ہو، تم کیا لولی ہو؟ تم ہی بھاگ کر چلی جاؤ نا!''......اور اس نے کندھے اچکائے......

''نہ بابا! اپنے بس کا روگ نہیں۔''

''کھانا تیرے بس کا روگ ہے؟''......اس نے ایک دوہتڑ اس کے رسید کیا۔

نومی سے پیسے مانگے، غریب کے پاس کھوٹا پیسہ تک نہ تھا۔ نورالہدیٰ سے پوچھا، بیچارے نے چار بار جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور چار آنے نکالے۔

''اللہ تیرا ہزار بار شکر ہے!......آج اگر میں بیر اور چنے نہ کھا پاتی تو جانتی ہو، رات تک اسی غم میں میرا ہارٹ فیل ہو جاتا۔''

''اور میں حلوہ منگوا کر، تیرا ختم دلوا دیتی۔''

''دونوں چیزیں خرید کر، فیصلہ یہ ہوا کہ وہیں سڑک کے کنارے بیٹھ کر کھایا جائے۔''

''دھوپ خوشگوار تھی۔ موسم کچھ بدل گیا تھا۔ سامنے کیمپس کی چار منزلہ عمارت تھی جس کے برآمدے سے کوئی سر کبھی کبھی باہر جھانکتا۔''

اور اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی جہاں آرا پر اسے اس وقت بہت غصہ آیا جب اس نے چنوں کو

درمیان میں ہی چھوڑ کر بیروں پر بسم اللہ کر دی، اس نے ضبط کی کوشش کی پر جب اس نے ایک کھا کر دوسرا اٹھایا تو وہ جل کر بولی...... ''پہلے انہیں تو کھالو۔''

''کیوں آگ لگ گئی ہے؟''...... وہ عیاری سے مسکرائی۔

اور اس نے چنوں کا لفافہ سڑک کے عین درمیان میں پھینک کر اس کی گود میں سے بیر اٹھا کر کھانا شروع کرتے ہوئے سرور آگیں لہجے میں کہا تھا۔

''ہاں بے ہودہ حرکتیں جو کرتی ہو۔''

''کیسا مزہ رہے، اگر دن کا بقیہ حصہ یوں ہی یہاں بیٹھ کر گزارا جائے۔'' اس نے سوں سوں کی کیوں کہ وہ مرچیں زیادہ کھا گئی تھی۔

''ضرور! پر وہ تیری مامی پرووسٹ اگر اِدھر سے گزریں تو بیٹے کے ان لانبے بالوں کا بہت خوبصورتی سے صفایا ہو جائے گا۔ جنہیں بہت ارمانوں سے پروان چڑھایا جا رہا ہے۔''

سمعیہ علی نے بیر کھاتے ہوئے کہا۔

''اسے کیا اپنی نئی نویلی کارٹینا کو نسل کا پنکچر کروانا ہے۔''

پبلک لائبریری کے گیٹ سے سلیقہ نکلتی دکھائی دی، سر اور آدھے ماتھے کو دوپٹے سے ڈھانپے ہوئے، اس پر نظر پڑتے ہی سمعیہ علی نے کہا۔

''لو ان سکالر بی بی کو دیکھو ذرا۔ اس قیامت کے سمے بھی انہیں پڑھائی سے فرصت نہیں۔''

''بکواس...... وہاں اپنے اس ناٹے گائیڈ کے ساتھ بیٹھی گپیں ہانک رہی ہو گی۔''

''زہر لگتی ہے ہمیں یہ''...... سمیعہ علی نے پھپھولے پھوڑے۔ دکھا دکھا کر دوپٹے سے سر کو یوں اہتمام سے ڈھانپتی ہے جیسے رابعہ بصری کی حقیقی جانشین یہی تو ہے۔ اور ہم سب نہایت فضول اور بدمعاش لڑکیاں ہیں۔ میں نے تو کانوں کو ہاتھ لگایا ہے۔ جو اس نیک پرہیزگار بی بی کے ساتھ ایک قدم بھی اٹھاؤں، اللہ قسم۔ جہاں آرا اِتی اَن سوشل ہے یہ، اس دن اردو

ڈیپارٹمنٹ میں سے گزرتے ہوئے اس سے ملاقات ہوئی۔ میرے ساتھ ہی ہال کے لیے چل دی، راستے میں پشاور کا گُل ملا۔ میں نے تعارف کروایا تو جانتی ہو اس نے کیا کیا؟

''کیا؟''...... جہاں آرا نے چٹخارہ بھرا۔

''ارے! منہ موڑ کر کھڑی ہوگئی، نہ علیک نہ سلیک، ہمارا جی چاہا مار مار کر بھرتا بنا دیں۔ شہید بھی گُل کے ساتھ تھا۔ تم جانو وہ ایک نمبر خرانٹ لڑکا ہے۔ بہت طنز سے بولا......''سنا ہے پنجاب کے لوگ بہت خوش اخلاق ہوتے ہیں؟ ہم تو کٹ کٹ گئے۔''

''ارے ہاں دیکھو!''...... جہاں آرا کو دفعتہً کوئی اہم بات یاد آ گئی، تمہاری پنجاب یونیورسٹی کا معیار بہت ڈاؤن ہے۔ ایم۔ اے فرسٹ کلاس، ریسرچ کے لیے بنگال آئی ہے۔ اور انگریزی کا ایک لفظ تک نہیں بول سکتی۔ مجھے تو پکّا یقین ہے اسے لکھنا بھی نہیں آتا۔''

''اپنی ٹانگ اڑا بیٹھی ہو بیچ میں، پہلے میری بکواس تو سن لو'......وہ جھنجھلا کر بولی۔

''ہاں سناؤ!''......اس نے سر جھکا کر اچھا سا بیر اٹھاتے ہوئے خاصی بے نیازی سے کہا۔

''جب میں نے اس سے یہ کہا کہ تم نے بہت برا کیا کم از کم تمہیں سلام کا جواب دینا چاہیے تھا۔ تو معلوم ہے اس نے کیا کہا؟......''

وہ رکی، نہایت تیزی سے بیر کھاتی اس لڑکی کو اس نے دیکھا، یہ جاننے کے لیے کہ وہاں کتنا تجسس ہے پر اس کا سپاٹ چہرہ دیکھ کر اسے تو آگ لگ گئی۔

''اے! کیا سو رہی ہو؟''

''میری جان! سلیقہ نے تم سے یہی کہا تھا نا، آج تو سلام کیا، کل ملے گا تو کیفے چلنے کو کہے گا اور وہ تو پردیس میں ماں باپ کی عزت لے کر آئی ہوئی ہے، یہ کتنی افسوس ناک بات ہوگی کہ اگر وہ کسی کے ساتھ چائے پینے چلی گئی تو ایک ہزار میل دور بیٹھے اس کے والدین کی ناک فوراً کٹ جائے گی۔''

''یہ تم سب کیسے جانتی ہو؟''......اس نے حیرت سے کہا۔

''خوش قسمتی سے یہ حادثہ میرے ساتھ بھی ہو چکا ہے۔ پر میں نے تو اس وقت کہہ دیا تھا کہ سلیقہ بیگم آپ پینتیس سے کیا کم ہونگی، خوبصورتی بھی آپ کے یہاں پانی نہیں بھرتی اور خیر سے بات بھی آپ کو ڈھنگ سے نہیں کرنی آتی کسی کا دماغ خراب ہے جو وہ آپ کو چائے پلانے پر پندرہ بیس روپے غرق کرے گا۔ کس خیال میں ہیں آپ؟''

''اچھا گولی مارو اسے...... چٹا گانگ کا سناؤ، تو گویا بالکل رومانی کہانیوں کی طرح تم وہاں اپنے ہیرو سے ملیں اور خوب اسے سنائیں۔ اور بعد میں اپنی حرکت پر متاسف بھی ہوئیں۔ پھر کچھ ایکشن لیا تم نے؟''

''ایکشن؟...... اس نے اپنی ناک ملی، دماغ خراب تھا میرا جو ایکشن لیتی!''

''نمک حرام ہے تُو! وہ تیرا محسن تھا۔''

''تو کیا ہوا؟...... ہم احسان کا بدلہ کبھی اتار ہی دیں گے۔''

''اگلی جون میں۔ ہے نا۔''

تبھی روشن اخبار ہاتھ میں پکڑے انہیں ڈھونڈتی وہاں آ گئی اور یوں لفنگوں کی طرح، انہیں وہاں بیٹھے دیکھ کر چیخی۔

''دماغ خراب ہو گیا ہے تم لوگوں کا کیا...... پر ووسٹ آپا نے دیکھ لیا تو؟''......

''تو پہلی گاڑی سے ہمیں چٹا گانگ اور انہیں لیڈر کے گھر چلتا کریں گی...... اور ہاں! تم بھی آ جاؤ۔ شاباش! بہت سویٹ ہو۔''

اور جب وہ بھی آ کر ان کے ساتھ بیٹھ گئی تو سمعیہ علی نے کہا...... ''اب آپ کو کہاں پہنچائیں گی پر ووسٹ آپا، روشن بی ذرا بتلائیے گا ہم کو......''

''لال میز ہاٹ''...... بیر کھاتے کھاتے اس نے کہا۔ اور تھوڑی دیر بعد انکشاف کیا......

''یہاں بیٹھ کر بہت مزہ آ رہا ہے۔ کم بختو! تم نے مجھے ساتھ نہ لیا۔''

''اچھا لو! اخبار دیکھو۔ دو بجے سٹرائیک ختم ہو جائے گی، پکچر چلیں گے۔''

''سبحان اللہ! یہ سالم اخبار تمہیں کہاں سے ملا؟''

''میں تو اسے سویرے ہی اڑا لے گئی تھی۔''

''اور اخبار کھول کر انہوں نے اپنے سامنے پھیلایا۔''

''اللہ! سب بور فلمیں۔ اس نے صفحے پر جلدی سے نظر دوڑا کر مایوسی سے کہا۔ لارنس ہاروے بکواس، انھونی کوئن فضول، ہالی ووڈ کی یہ این مرگریٹ، خدا کی قسم! سر دکھنے لگتا ہے میرا اسے دیکھ کر، یہ پٹیر لی لارنس گوارہ، چلو 32 Caliber Killer دیکھ لیتے ہیں۔''

''شان ہے تمہاری!''...... جہاں آرا نے اس کے سر پر تھپڑ مارا اور بولی۔

''کیڑے نکالتی ہے یہ، لارنس ہاروے اور انھونی کوئن میں۔ ہونا آخر پنجاب کی چھوکری، تم تو وہ مظہر شاہ کی بھڑکیں مارنے والی فلمیں دیکھا کرو، ہو اسی قابل۔''

پتلی سی لکڑی پر بکول کے کوئی پندرہ بیس ہار لٹکائے وہ چھوٹا سا لڑکا، اندر جانے اور باہر آنے والی ہر لڑکی کے تعاقب میں بھاگتا، منمناتے ہوئے، عاجزی سے انہیں ایک دو ہار خرید لینے کی درخواست کرتا پر لڑکیاں بے اعتنائی سے ایک نظر اسے دیکھتیں اور اپنے اپنے راستے پر آگے بڑھ جاتیں۔

وہ جب سائیکل رکشے سے اتر کر اندر جانے لگی تو اس نے اس کی نرسندی ساڑھی کا آنچل پکڑ کر بہت مسکینی سے کہا۔

"آپا! دوپہر ہو رہی ہے۔ ایک ہار بھی نہیں بکا، یہ نہیں بکے گا تو بھات کہاں سے کھاؤں گا۔"

اس کا دل کڑھا۔ اکٹھے چار ہار اس نے خرید لیے اور اندر آ کر تازہ ڈاک دیکھنے لگی۔

پانچ خط اس کے نام تھے۔ ٹیبل ٹینس کی میز پر بیٹھ کر اس نے سب خطوں کو پڑھا اور اوپر جانے سے پہلے سوچا کہ آج کا اخبار ابھی تک نظر سے نہیں گزرا، دیکھنا چاہیے۔

کامن روم میں دوپہر تک کسی اخبار کے سالم رہنے کا سوال ہی نہ تھا۔ یہ اسے اچھی طرح معلوم تھا پھر بھی وہ موہوم امید پر ہال میں چلی آئی۔

اور یہاں اخباروں کے بس آدھے پونے ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ اس نے چند لڑکیوں سے پاکستان آبزرور اور مارننگ نیوز کا پوچھا۔ ایک لڑکی نے بہت شان سے آبزرور کا ایک صفحہ اسے تھما دیا۔

دوسری لڑکی بولی...... ''سنا تھا آج ڈینک پاکستان اور سنگ باد میں بہت اچھے مضامین آئے ہیں، یہاں آکر دیکھا تو چند پُرزے ملے ہیں۔'' اس نے مڑے تڑے اخباری صفحوں کی طرف اشارہ کیا۔

دبیز صوفے پر وہ بیٹھ گئی۔ کامن روم کی تین طرف کی دیواریں شیشے کی تھیں۔ کمرے کے درمیان میں اُگے شفتار کے درخت کو شیشے کی دیواروں سے مقید کر کے چھت میں سے اوپر نکال دیا گیا تھا۔

کونے میں رکھے ہوئے ریڈیو کے گرد تین چار لڑکیاں بیٹھی گانے سن رہی تھیں۔ دس بارہ کا ایک گروپ کیرم کھیلتی دو لڑکیوں کو گھیرے میں لئے کھڑا تھا۔ اس کے قریب بیٹھی لڑکیاں ''چترالی'' پکڑے وحید مراد کے بنگالی فلموں میں کام کرنے کے امکانات پر بحث کر رہی تھیں۔ بائیں طرف فلاسفی میں آنرز کرتی دو بہنیں Thd Summer Holiday کو فور کلاس فلم کہہ رہی تھیں۔

اس نے وہیں، سلیقہ کو بھی دیکھا جو کسی لڑکی سے ٹوٹی پھوٹی بنگلہ میں باتیں کر رہی تھی۔ اس کے تن پر جدید وضع کی قمیص دیکھ کر اس نے خود سے کہا اسے پہلے تو نہیں دیکھا پر شاید اس کے گھر والوں نے حال ہی میں بھیجی ہے، جہاں آرا اسے ڈھونڈتی وہاں آ گئی۔

''سنو...... وہ گھبرائی ہوئی تھی، خورشید بھائی کی گھر سے کال آئی ہے۔ میرے لوکل گارجین کا نوکر مجھے بلانے آیا ہے، چلتی ہو؟''

بغیر کچھ کہے، وہ اس کے ساتھ چل پڑی، صاحب خانہ اور ان کی اہلیہ، دونوں مقامی کالج میں پروفیسر تھے۔ گھر والی کو دیکھ کر اسے خدا کی شان یاد آئی، بے اختیار اس نے سوچا۔

اس گھر کے پلنگ اور کرسیاں، یا تو لوہے کے ہوں گے یا پھر بہت مضبوط لکڑی کے سپیشل بنوائے گئے ہوں گے۔

جہاں آرا فون پر مصروف رہی اور وہ ان کے لمبے چوڑے حدود اربعہ کے جائزے میں، اللہ نے موٹاپا دل کھول کر دیا ہے، دیا ہے اُس کی۔''

صاحبِ خانہ پچاس پچپن کے پھیر میں ہوں گے۔ مشرقی یو۔پی سے تعلق تھا ان کا، گھر کی فضا پر بھی وہی رنگ غالب تھا۔

''تم نے آنا ہی چھوڑ دیا ہے، کن کاموں میں مصروف ہو؟''......انہوں نے جہاں آراء سے پوچھا تھا۔

پڑھائی سے بڑا بھی کوئی کام ہوسکتا ہے؟ سیمسٹر سسٹم نے نتھ ڈال رکھی ہے۔ مسکراتے ہوئے جہاں آرا نے معذرت کی اور ساتھ ہی اس کا بھی تعارف کروادیا۔

''کیا مصیبت پڑی تھی تمہیں یہاں آنے کی!''...... وہ براہ راست اس سے مخاطب ہوئے۔

عجیب بے تکا سا سوال تھا۔ وہ سٹپٹا سی گئی۔

''معاف کیجئے گا میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔''

''میں نے کوئی مشکل بات تو نہیں کی جو تمہاری سمجھ سے بالا ہے۔ کتنا عرصہ ہوا ہے تمہیں یہاں آئے ہوئے؟''

''سات ماہ''......اس نے متانت سے کہا۔

''خاصہ عرصہ ہے۔ تو آٹے دال کا بھاؤ ابھی تک معلوم نہیں ہوا؟''

''اب وہ سمجھ گئی تھی''......رسان سے بولی۔

''میں نے یہاں غیریت محسوس نہیں کی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر دل کبھی کبھی گھبرایا پر یہ سوچتے ہوئے کہ قوموں کی زندگی میں ایسے مسائل تو اٹھا ہی کرتے ہیں، خود کو مطمئن کرلیا۔''

''جواب نہیں آپ کا!''......وہ طنز سے بولے......''گھر بار لٹا کر یہاں آتیں اور جب تحفظ نہ ملتا تب اس اطمینان کا پتہ چلتا۔''

بہت جلے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد دوبارہ بولے۔

''ہم تو پچھتاتے ہیں اس وقت کو جب یہاں چلے آئے، ایسے پاکستان کی تو ہم نے تمنا نہیں کی تھی۔ جہاں ہمیں ہر لمحہ صرف اس بات پر جان کا دھڑ کا لگا رہتا ہے کہ بدقسمتی سے ہم اُردو سپیکنگ اور وضعدار لوگ ہیں''......

''معاف کیجئے گا! میں یہ کہوں گی کہ آپ لوگوں نے بھی انہیں نکمے، نااہل، ست اور سازشی کہہ کران سے نہایت توہین آمیز برتاؤ کیا ہے۔ اوران کے روّیے میں خوداس سلوک کے ردعمل کو دخل ہے۔''

''تو آپ کیا سمجھتی ہیں، یہ ایسے نہیں، حسد ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، کام کرنا انہیں نہیں آتا، فتنہ پسند یہ ہیں۔ تاریخ اٹھا کر دیکھ لو، یہ خطہ ہمیشہ سے سازشوں اور بغاوتوں کا مرکز رہا ہے۔''

''مغربی پاکستان سے لوگ آتے ہیں''......انہوں نے دائیں ٹانگ کو بائیں پر رکھتے ہوئے مزید کہا......''پوربانی اور شاہ باغ میں قیام کرتے ہیں۔ اور واپس جا کران کی زبوں حالی کی داستانیں بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ یہ ڈھاکا یونیورسٹی جہاں 55ء تک میری ان آنکھوں نے دھوتیوں میں لڑکے دیکھے ہیں۔ آج ان کے مزاج آسمان پر ہیں...... آج یہ کسی غیر بنگالی کو انسان ہی نہیں سمجھتے!''

اور سمعیہ علی نے بہت دکھ سے انہیں دیکھا تھا، اس کا سینہ غم سے پھٹا جا رہا تھا، بے اختیار اس نے سوچا تھا......''وہ ڈاکٹر ٹھیک ہی کہتا تھا۔ اس ملک کا کوئی مستقبل نہیں، جہاں بنگالی، بہاری، سندھی، پٹھان، بلوچی اور پنجابی ایک دوسرے کی شکل تک دیکھنے کے روادار نہیں۔''

ان کے سروں کے اوپر سے ایک جیٹ فائٹر گزرا جس کی کرخت آواز سے سارا ماحول

گونج اٹھا، کمرے کی کھڑکی سے اس نے باہر جھانکا، آسمان نیلا اور شفاف تھا۔ انگنائی میں اُگے درخت اور گھاس، سرسبز اور تازہ تھی۔ وہ اٹھ گئی۔ جب اس معمر مرد نے کہا...... ''بیٹھیے اور چائے پی کر جایئے، گھبرا کیوں گئی ہیں۔''

''گھبرانے والی کوئی بات نہیں، مجھے باہر جانا ہے۔''

تبھی نوکر نے چائے کی ٹرالی کمرے میں لا کر ایک طرف کھڑی کی، پلیٹیں اور نیپکن، ان کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے سروس شروع کر دی۔

وہ چائے پینے کے موڈ میں نہیں تھی پر اب بھاگنا بھی بدتمیزی تھی، چپکی بیٹھ گئی۔

اس نے چائے کا ایک گھونٹ ہی لیا تھا جب ایک خوش پوش سے صاحب اندر آئے، علیک سلیک ہوئی۔ صاحبِ خانہ نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ سمعیہ علی ہیں...... لاہور سے آئی ہیں۔ بنگالیوں کی بہت مداح ہیں، کچھ ان سے بات کرو۔''

وہ جل گئی، بیزاری سے بولی...... ''میں کسی کی مداح نہیں۔ میں تو صرف اتنا چاہتی ہوں کہ اس ملک کی بقا کے لیے ایثار کی ضرورت ہے، جو سب کی مشترکہ جدوجہد سے وجود میں آیا۔''

''سب کی مشترکہ جدوجہد سے؟''

انہوں نے حیرت سے کہا تھا...... بھئی! سچ تو یہ ہے کہ یہ لوگ رات ہندوستان میں سوئے اور صبح پاکستان میں جاگے۔ پکی پکائی کھیر انہیں ملی جواب ان سے ہضم ہی نہیں ہو رہی ہے۔ بقیہ رہا بقا کے لیے ایثار کا سوال، تو اس حصے نے ساتھ رہنا ہی نہیں ایثار کیسا؟''

''اللہ، تعصب کی انتہا ہے''

اس نے اپنے آپ سے کہا۔

پھر وہ دھیمی آواز میں بولی۔

آپ جیسے انٹلیکچوئل کو اگر میں تاریخ کا چہرہ دکھانے کی کوشش کروں تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے

میں سورج کے سامنے چراغ رکھوں۔ تاریخ آپ اور آپ کی مسز کے گھر کی باندی ہے۔ آپ یقیناً اس سے اختلاف نہیں کریں گے کہ کسی تحریک، کسی موومنٹ کو چلانے والے لوگوں کا شمار اکثر خواص میں ہوتا ہے۔ عوام کی ایک اکثریت اسے پذیرائی یا عدم پذیرائی کا شرف بخشنے والی شمار ہوتی ہے۔ تحریکِ پاکستان میں بنگال کے کردار کی اگر آپ نفی کرتے ہیں تو یہ محض آپ کی ضد اور آپ کا تعصب ہے۔''

وہ کھڑی ہوگئی۔ بات کو طول دینے کا اس کا قطعی موڈ نہیں تھا اور جب وہ دونوں باہر آئیں۔

اس نے جہاں آرا سے کہا تھا...... ''ہم انسانی فطرت کی اچھائیوں سے کیوں مایوس ہو گئے ہیں۔ کوئی قوم بھی بھلا ایک جیسی ہو سکتی ہے؟''

تب سفید اور سبز پروں والے طیارے نے زمین کو چھوا اور اس نے کسی قدر دلچسپی سے باہر جھانکا...... پر یہاں جنگلے کے گرداگرد، خودرو جنگلی جھاڑیاں اور ٹنڈ منڈ درخت ہی نظر آئے۔

اس نے حفاظتی پیٹی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا۔ تو گویا میں چند لمحوں بعد اس شہر میں اترنے والا ہوں۔ جو تاریخی اہمیت سے کہیں زیادہ اب اپنی امارت اور صنعتی ترقی سے شہرت لے رہا ہے۔

اس نے گہری اور تنقیدی نگاہ، ایروڈرم کی پُرشکوہ عمارت پر ڈالی اور عین اس لمحے، وہ شانوں تک بال جھلاتی لڑکی اسے یاد آئی جو اس جگہ کی باسی تھی اور کچھ اس عمارت ہی کی طرح شاندار تھی۔

خاموشی سے وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا۔ اپنے دونوں دوستوں کو دیکھ چکا تھا جو بہت زور شور سے رومال ہلا رہے تھے۔ آہستگی سے ہاتھ کو فضا میں اوپر اٹھاتے ہوئے اس نے انہیں اشارہ دیا کہ وہ انہیں دیکھ چکا ہے۔

اور یہاں پھولدار کریپ ڈی شین کی ساڑھی میں وہ ریلنگ کے پاس کھڑی اپنے سامنے

کندھوں پر بیگ لٹکائے ہوئے، ہاتھوں میں بریف کیس پکڑے، درجنوں کیلوں کو رسیوں سے تھامے، ان مختلف لوگوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی جو طیارے سے اتر کر اس کے پاس سے گزرتے ہوئے اندر جارہے تھے۔ وہ گول مٹول، پھولی پھولی گالوں والے بونی اور راجہ بھی اس کی ٹانگوں سے چپکے کھڑے تھے۔

''خدایا، مجھے تو ان میں وہ نظر ہی نہیں آتا۔ وہ خوبصورت آنکھوں اور سانولی رنگت والا جس کا نام اس نے مجھے اجتبیٰ الرحمٰن بتایا ہے۔ اب یہ میرے لیے کتنا کٹھن ہے کہ ان ڈھیر سارے لوگوں میں سے اسے پہچان لوں، جسے میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔

اس نے قدرے دور کھڑے جہاز کو ایک بار پھر دیکھا۔ چند لوگ اور اترے، پر ان میں وہ تو نہیں جان پڑتا تھا۔ جہاز میں اب کوئی مسافر نہیں تھا۔ ایئر ہوسٹس اور وجیہہ سٹیورڈ واپس آ رہے تھے۔

وہ گھبرائی۔ بوبی کو اس نے گودی اٹھایا اور راجہ کی انگلی پکڑی اور تیزی سے ویٹنگ روم کی طرف بھاگی، کتنی تاکید کی تھی اس نے ...... ''آپا! دیکھئے کہیں وہ مس نہ ہو جائے آپ سے، جس طرح بھی ہو، آپ نے اسے ڈھونڈ نکالنا ہے۔''

اور اب سمعیہ رانی! تم میرے پاس نہیں وگرنہ تمہیں معلوم ہوتا کہ میرا دماغ چکرا گیا ہے اور اس کے حلیے کی بھی تو تم ڈھنگ سے وضاحت نہ کر سکیں، خوبصورت آنکھوں کے بل پر کسی کو پہچاننا تو جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

انکوائری آفس کے سامنے پہنچ کر اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں، کاؤنٹر پر بیٹھی خاتون سے درخواست کی کہ وہ اس نام کو اناؤنس کر دے۔

تب اس شوروغل والے ماحول میں ایک شیریں آواز گونجی، ڈھاکہ سے آنے والے اجتبیٰ الرحمٰن سے درخواست ہے کہ وہ انکوائری آفس کے سامنے پہنچیں۔ ایک بار، دوبار، جب تیسری بار بھی یہی اعلان ہوا تو وہ چونکا۔ اپنے ساتھی سے اس نے پوچھا کہ کیا ان کے ساتھ کوئی

اور بھی ہے؟ پر ان کے نفی میں جواب دینے پر وہ حیران ہوتے ہوئے انکوائری آفس کی طرف بڑھا۔ اچٹتی سی ایک نظر وہاں کھڑی ایک خاتون پر پڑی جس کا چہرہ کچھ جانا پہچانا محسوس ہوا، اس کے پوچھنے پر فلائٹ انکوائری اسسٹنٹ نے انگلی سے اس کی جانب اشارہ کیا۔

''یہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔''

اور چھریرے قد کی اس سرخ وسفید رنگت والی خاتون نے بہت میٹھے لہجے میں اسے مغربی پاکستان آنے پر خوش آمدید کہا اور اپنے متعلق بتایا کہ وہ سمعیہ کی بھاوج ہے۔ اس شاندار ویٹنگ روم میں جہاں لوگوں کی گہما گہمی تھی، کھڑے کھڑے اس نے حیرانی سے سوچا۔

''انہیں میری آمد کا علم کیسے ہوا! میں نے تو کسی کو نہیں بتایا تھا''......اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ پوچھ بیٹھا۔

''کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ کو میرے لاہور آنے کے بارے میں کیسے علم ہوا؟''

''ہمیں کل شام سومی نے ٹرنک کال کی تھی۔''

''وہ الجھ سا گیا''......اسے کیسے اور کہاں سے معلوم ہوا؟''

اور اب وہ وہاں کھڑا تذبذب میں ڈوبا تھا، اس کے دونوں ساتھی بھی اس کے پاس آ گئے تھے۔ اس نے ایک بار پھر بہت شائستگی سے معذرت کی کہ وہ انہیں تکلیف دینا نہیں چاہتا اور یہ کہ اس کا کمرہ ٹی۔ ایس۔ سی میں بک ہو چکا ہے۔''

پر وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی......''یہ تو ممکن ہی نہیں کہ آپ لاہور آئیں اور ہمارے گھر کی بجائے کہیں اور قیام کریں۔''

اور بالآخر ایک خاتون کے پیہم اصرار پر اسے ہی جھکنا پڑا۔

باہر ان کی سیاہ مورس کھڑی تھی۔ اس نے بچوں کو پچھلی سیٹ پر بٹھایا، خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور اسے اپنے ساتھ بیٹھنے کے لیے کہا۔

چھاؤنی کی سڑکیں صاف اور کشادہ تھیں۔ کاروں اور ٹیکسیوں، سکوٹروں، رکشاؤں اور

سائیکل سواروں کی آمدورفت کا ایک سلسلہ جاری تھا۔ پر دھوپ پھیکی تھی، درخت ننگے اور گھاس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ ویرانی اور اُداسی کا گھمبیر تاثر سب چیزوں پر چھایا نظر آ رہا تھا۔

دودھیا رنگ والی خاتون اس سے گھر والوں کے متعلق کچھ یوں پوچھ رہی تھی۔ جیسے وہ انہیں بہت اچھی طرح جانتی ہو۔ اپنے میاں کے متعلق بتاتے ہوئے اس نے افسوس ظاہر کیا کہ وہ اس کے استقبال کے لیے موجود نہ تھے...... ''دراصل ہمارے محسن ماموں کو وہم ہو گیا ہے کہ غزالی کے سوا کوئی اور ان کا علاج نہیں کر سکتا۔''

کار کھلی آبادی میں سیمنٹ کے بنے ہوئے ایک ستھرے مکان کے سامنے رک گئی، گھر اوسط درجے کا نمائندہ تھا۔ سویٹ پی۔ گل اشرفی اور پام کے پودوں سے گھرے برآمدے میں دھوپ کے رخ تخت پر بیٹھی، ایک معمر عورت تسبیح میں مگن تھیں۔

''یہ ماں جی ہیں''......اس نے تعارف کروایا اور ماں جی نے جم جم آؤ، جی صدقے آیاں نوں، کہتے ہوئے اس کے بالوں، پیشانی اور کوٹ پر بوسے دیئے۔ سفید بالوں والی اس خاتون کی محبت میں جو خلوص تھا، وہ ان کی آنکھوں کے راستے سے چھنتا ہوا باہر آ رہا تھا۔

اسے گھٹن ہو رہی تھی، اعصاب پر بوجھ تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ وہ وجہ اچھی طرح جانتا تھا۔

جب وہ غسل سے فارغ ہو کر چائے کے لیے برآمدے میں آیا تو انہوں نے سومی کے متعلق پوچھا۔ خجل سا ہو کر اس نے بتایا...... ''وہ ٹھیک ہے، دراصل میں گزشتہ دنوں بہت مصروف رہا، یوں بھی میرا لاہور آنا اچانک ہوا، جس کی وجہ سے خصوصی طور پر اسے نہیں مل سکا، ویسے وہ وہاں آرام سے ہے۔''

ماں جی کی اردو اچھی نہ تھی۔ اسے سمجھنے میں دِقت ہو رہی تھی پر وہ اتنا ضرور سمجھا کہ وہ اس کے گھر والوں کو دعائیں دے رہی تھیں جنہوں نے ان کی لڑکی کو پردیس میں اتنی اپنائیت اور پیار دیا۔

چائے بہت پُر تکلف تھی اور سب سے بڑھ کر دونوں خواتین کی میزبانی۔

بوبی اور راجہ، گھلنے ملنے والے بچے تھے۔ بہت جلد اس سے مانوس ہو گئے۔

''ان کے گھر کا آدھا حصہ کرائے پر اٹھا تھا۔ جس میں جیسور کا ایک خاندان پچھلے ماہ اسلام آباد سے تبدیل ہو کر سکونت پذیر ہوا تھا۔ مالک مکان کے گھر میں ایک بنگالی مہمان کی آمد کا سن کر وہ لوگ بھی آ گئے۔ خوب گپ شپ رہی۔ دونوں گھروں کے درمیان تعلقات بہت ہی خوشگوار تھے۔ ان لوگوں کو مغربی پاکستان بہت پسند تھا۔ بس ذرا موسم کی شدت کی تکلیف تھی۔

''آپ کو دیش یاد نہیں آتا'' ......اس نے بیگم میزان الاسلام سے پوچھا۔

اور اس نے بہت ادا سے کہا...... ''اپنا دیش تو خیر کبھی بھلایا ہی نہیں جا سکتا۔ پر مجھے یہاں رہنا زیادہ پسند ہے۔ ادھر کا لوگ بہت اچھا ہے، مخلص اور محنتی ہے۔ ہمارے لوگوں کی طرح حسد نہیں کرتا۔''

رات کے کھانے پر بنگالی کھانوں کی کثرت تھی۔ اس نے میز پر بیٹھتے ہوئے، خاصی شگفتگی سے کہا...... ''یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ بنگالی کھانے تو ہمیشہ سے کھاتا آیا ہوں، آپ پنجاب کی چیزیں کھلائیے نا۔''

اور جب باہر رات گہری ہو رہی تھی تو نفاست سے سجے ڈرائنگ روم میں کافی پیتے ہوئے، وہ بچے، وہ عورت اور اس کا گھر، اسے قطعی اجنبی نہ لگا۔

کانجی وارم اور جامدانی کی چند ساڑھیاں جو وہ اپنے ملنے والوں کے لیے لایا تھا، اس نے سمعیہ علی کی بھاوج کو پیش کرتے ہوئے معذرت چاہی کہ وہ ان کے لیے ڈھاکا سے مزید چیزیں نہ لا سکا۔

اس کا اگلا سارا دن ہائیکورٹ اور لا کالج میں گزرا۔ رات کو جب وہ گھر آیا، سمعیہ علی کا بھائی، ڈاکٹر غزالی اس کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ وہ تقریباً تیس کے چکر میں تھا۔ ہنس مکھ اور خوش اخلاق نوجوان جسے اجتبیٰ الرحمٰن نے پسندیدگی سے دیکھا۔

گھر والوں نے کار مکمل اس کی تحویل میں دے دی، اس کے قیام کو ہر طرح سے آرام دہ

اور دلچسپ بنانے کی پوری پوری کوشش کی گئی۔

دو دن کے لیے وہ اسلام آباد گیا۔ نیا دارالحکومت جس کی عالی شان عمارتوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے محسوس ہوا کہ پٹ سن کی بُو اس کا دماغ اڑائے دے رہی ہے۔ عظیم الشان بندوں کو دیکھ کر، اسے سیلاب کی ہلاکت خیزیوں نے تڑپایا۔

اور جب وہ واپسی کے لیے ہواؤں میں پرواز کر رہا تھا۔ اس کے دل میں سلگتی نفرت کی آگ کچھ اور بھی بھڑک اٹھی تھی۔

پر ایک گھرانہ ایسا تھا جس کی یاد آتے ہی وہ بے چین ہو اٹھا تھا۔ وہ گھرانہ جس نے اس کے قدموں میں دل اور آنکھیں دونوں بچھائی تھیں۔

پھاگن کی یہ رات بہت خوشگوار تھی۔ چاندنی بہت فیاضی سے کرشنا چوڑا کے درختوں، گھاس کے قطعوں اوران میں اُگے پتہ بہار کے بوٹوں پر بکھری پڑی تھی۔ستارے ٹمٹماتے اور ہوائیں سرسراتی تھیں۔ دورانٹر کونٹی نینٹل کی بادامی عمارت میں روشنیاں جھلملاتی تھیں۔جگن ناتھ ہال سے گٹار بجنے کی آواز آرہی تھی۔کوئی ایک ہی تار بجائے چلا جارہا تھا۔جناح ہال کے دریچوں سے روشنی چھن چھن کرتی باہر آرہی تھی۔اس نے بہت کاہلی سے اپنے دونوں بازو دیوار پر رکھے اور نیچے جھانکا......لڑکیاں مشعلیں جلانے میں محو تھیں کبھی کبھی جوشیلے نعرے بھی فضا میں گونجنے لگتے۔

سامنے نیو کیمپس کے گنبد پر سیاہ پرچم لہرا رہا تھا۔اور نیچے شہید مینار پر بھی اسی سائز کا پرچم ہوامیں پھڑ پھڑا رہا تھا۔

اس نے وقت دیکھا، بارہ بجا ہی چاہتے تھے۔پلکوں کو تیزی سے گردش دیتے ہوئے، اس نے اپنی کوفت اور بیزاری کو کم کرنے کی کوشش کی۔ پر جھنجھلاہٹ اور ڈپریشن اس کے اعصاب پر بری طرح سوار تھا۔

رات کی خوشگوار ہوا، اس کے چہرے سے ٹکرائی۔

اس نے کمرے میں ٹہلنے کا ارادہ کیا۔ پر جانے کیا ہوا، اسے لگا جیسے وہ منجمد سی ہو گئی ہے۔

نیچے سے اس کی پارٹی کی لڑکیاں چلائیں...... ''سومی! اب آ بھی چکو۔''

''یہ سب مجھے اتنا گراں کیوں محسوس ہو رہا ہے''...... سستی سے اس نے قدم آگے بڑھائے۔

بارہ بجے، مشعل بردار جلوس کو شہید مینار جانا تھا۔

اس نے سیاہ ساڑھی پہنی، بالوں میں سیاہ ربن ڈالا، شانے پر سیاہ پٹی پن سے لگائی۔

آئینے میں خود کا جائزہ لیا، وہ بجھی ہوئی تھی۔

آج بیس فروری ہے۔ ابھی کچھ دیر بعد اکیس ہو جائے گی، یہ اکیس فروری پوربو پاکستان کی تاریخ میں بہت اہم ہے۔

اس پریشان حال لڑکی نے دوبارہ شیشے میں خود کو دیکھا تھا۔ آنکھوں کی ساری چمک اور جگمگاہٹ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ افسردگی اور ویرانی سارے وجود میں پاؤں پسارے پڑی تھی۔

اس نے رُخ پھیرا اور اپنی روم میٹ کو دیکھا، وہ سرخ کاٹن کا لحاف اوڑھے سو رہی تھی۔ رات کے دو بجے تک پڑھنے والی یہ محنتی لڑکی، آج گیارہ بجے سے ہی بستر میں چلی گئی تھی۔ شاید اس نے جاگنا فضول سمجھا تھا۔ یوں اسے رات سے کھانسی کی بھی شکایت تھی، تھوڑی دیر قبل اس نے اسے کف سیرپ کا ایک چمچہ پلا کر آرام کرنے کے لیے کہا تھا۔

مینی اور راشو گھر گئی ہوئی تھیں، کمرہ خالی تھا۔

وہ بوجھل دل و دماغ کے ساتھ کرسی پر بیٹھی تھی۔

نیچے سے چھاترو کی چین نواز لڑکیاں چلائی تھیں۔

''مارکسزم، لینزم، ماؤازم زندہ باد، مفاد پرست مردہ باد۔''

چھاتر و لیگ کا گروپ چیخا۔ ''جے بنگلہ، پور بو بنگلہ۔'' کوریڈور میں چھاتر و یونین کی روس نواز لڑکیوں نے زور زور سے کہا۔

''دور ہو...... دور ہو''

دیوانگی اور جنون نے انہیں ہوش و خرد سے کوسوں میل دور کر دیا ہے۔ کوئی ان احمقوں سے پوچھے کہ بنگلہ زبان سے یہ کیسا پیار ہے کہ اس پیار نے انسانیت اور شرافت کی قدروں کو تار تار کر دیا ہے۔ اُردو اور انگریزی کے بورڈ توڑ دیے گئے ہیں۔ راہ چلتے لوگوں کو روک روک کر بنگلہ پڑھوائی گئی ہے اور نہ پڑھنے پر انہیں زدوکوب کیا گیا ہے۔ شرفا گھروں کے کونوں میں دبک گئے ہیں۔

وہ گزشتہ دنوں سے یہ سب دیکھ رہی تھی اور کڑھ کڑھ کر اس نے دس بار جہاں آرا سے کہا تھا...... ''اے بی! تم ہی بتاؤ یہ کیسا اندھا تعصب ہے؟ سارا سال یونیورسٹی میں انگریزی پڑھتے ہیں، انگریزی لکھتے اور انگریزی بولتے ہیں پر اس خاص دن، انہیں کیا بھوت چمٹ جاتے ہیں جو یہ انسانوں کے جامے میں ہی نہیں رہتے ہیں۔ یہ چھاترو لیگ اور چھاترو یونین جنہیں بنگلہ کی اتنی ممتا آئی ہوئی ہے، ان کے نام دیکھو۔ سارے عشق کی قلعی کھلتی ہے، لیگ اور یونین کے لیے کیا بنگلہ الفاظ ہیں؟''

''سومی! کیا سریش لگ گئی ہے، جس نے تمہیں کمرے میں چپکا لیا ہے؟''...... نیچے سے آمنہ کی گونج دار آواز سنائی دی۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھی، ساڑھی کے پلو کو اس نے ٹھیک کیا، جوتا اتارا اور ننگے پاؤں نیچے اتر آئی۔

مستورہ آپا پمفلٹ ترتیب دے رہی تھی اور آمنہ لئی ٹیسٹ کر رہی تھی، باقی چند بینر اٹھائے چلنے کی مشق کر رہی تھیں، کچھ ایک مشعلیں جلا رہی تھیں۔

''حد ہوگئی اوپر جا کر کیا سو گئی تھیں؟'' مستورہ نے خفگی سے کہا۔ روشن ساڑھی کا آنچل سر

پر ڈالے، آنرز بلڈنگ سے دو لڑکیوں کے ساتھ نکلی، اس نے آتے ہی جہاں آرا کے متعلق پوچھا۔ جس پر وہ بولی...... ''مجھے نہیں معلوم، اپنے کمرے میں ہوگی۔''

''کیوں؟ اسے کیا ہمارے ساتھ نہیں چلنا؟''

''اب میں کیا جانوں؟''

''تو جاؤ نا! اٹھا لاؤ اسے، جلدی کرنا، وقت تو ہو رہا ہے۔''...... چھاترو لیگ کی لڑکیاں کامن روم کے سامنے کھڑی چیخ رہی تھیں...... ''جے بنگلہ...... جے بنگلہ۔''

یونین کا روس نواز گروپ بھی چلایا...... ''شنگھرام، شنگھرام۔ اگیا و دفعہ بھنتی ہوبے۔ بھنتی ہوبے۔''

آمنہ پارٹی کی لڑکیوں کو لان میں لے گئی۔ تب وہاں پاکستان جندہ باد، اسلامی چھاترو شنگھو جندہ باد کی آوازیں گونجیں۔

آڈیٹوریم کی دیواروں پر پوسٹر لگاتی اس لڑکی کی رگ رگ میں سرور آگیں لہریں دوڑیں تھیں۔ اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا اور نم آلود نظروں سے، اس نے آسمان اور زمین کو دیکھا اور گلوگیر لہجے میں خود سے بولی تھی۔

''معبود! چاند تارے کے عَلَم والا میرا یہ وطن، ہمیشہ قائم رہے۔''

وہ پوسٹر ادھورے چھوڑ کر ان کی طرف بھاگی تھی۔ اس نے اپنا بازو ہوا میں لہرایا اور جسم و جان کی پوری قوت سے چیخی تھی۔

''پاکستان زندہ باد''

اس کی دل گرفتگی ختم ہوگئی تھی ایک نیا جوش و جذبہ وہاں لہرایا۔ جہاں آراء آچکی تھی، سیاہ سوتی ساڑھی سے اس نے اپنا سر ڈھانپ رکھا تھا۔ ننگے پاؤں آڈیٹوریم کے فرش پر چلتی وہ اچھی لگ رہی تھی۔

مستورہ نے بتایا کہ مسعود اشرف باہر آنے کے لیے کہہ گیا تھا۔ انہوں نے آنچلوں سے

سر ڈھانپے، بینر اٹھائے اور باہر آ گئیں۔

رمنا ریس کورس کی جانب سے ایک ٹرک آیا، جس میں لدے لڑکے لڑکیاں مرکزی حکومت کو لعن طعن کر رہے تھے۔

مشعلیں لیے ان کی پارٹی کے لڑکے باہر کھڑے تھے۔ تب ان کی پارٹی نہایت وقار اور شائستگی سے، شہید مینار کی طرف چلی۔

''اللہ اکبر...... پاکستان جندہ باد'' کے نعرے گونج رہے تھے۔

وہ ننگے پاؤں چلنے کی عادی نہ تھی، احتیاط سے قدم اٹھا رہی تھی، سڑک پر جا بجا نقاشی کی ہوئی تھی۔

ٹراٹسکی ازم، شودھون مردہ باد، آگے سے آوازیں آ رہی تھیں۔

امریکی روسی سامراج مردہ باد۔ شہید مینار پر پہنچ کر انہوں نے بینر رکھے، فاتحہ پڑھی اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی جنہوں نے بنگلہ کو قومی زبان بنانے کے سلسلے میں اپنی جانیں قربان کی تھیں۔

فراغت سے زمین پر بیٹھا ایک گروپ، طبلے پر اکیس فروری کا مشہور گیت ''امار بھائی جو رکھتو ریدد...... امی کی بھلتے پاری'' گا رہا تھا۔

شلپی کی پارٹی کو بھی اس نے سرگرم عمل دیکھا، البتہ وہ اسے کہیں نظر نہ آیا۔ اکیس فروری کی رات دن کی طرح جوان تھی۔ آدھا ڈھاکا یہاں امنڈا ہوا تھا۔ زہر میں بجھی تقریریں جاری تھیں۔

کسی نے نعرہ لگایا...... ''جاگو بنگالی جاگو۔''

سرفراز پنجابی میں بولا...... ''اب اتنے بھی نہ جاگو کہ پنجابی جاگ جائیں۔'' اس کی اس بات پر وہ زیرِ لب مسکرا دی۔

صبح عام تعطیل تھی۔ رمنا ریس کورس میں لڑکیوں نے پیشانیوں پر چمکتی بندیاں لگا کر،

ٹیگور کو خراج عقیدت پیش کیا۔

بنگلہ اکیڈمی میں مذاکرات ہوئے، جگہ جگہ جلسے اور جلوس نکلے، پر اسے حیرت تھی کہ شہدا کی یاد منانے کا یہ کون سا طریقہ ہے!

اور پھر ایک دن جب وہ گھر پر تھی اور فخر اس سے زبان کے مسئلہ پر الجھ رہا تھا۔ اس نے کہا...... ''میں مانتی ہوں فخر! لسانی تحریک کو دبانا اس وقت کے حاکموں کا انتہائی احمقانہ قدم تھا۔ پر تم مجھے بتاؤ کہ ان ہنگاموں میں مرنے والوں کو اگر شہادت کو رتبہ دیا گیا ہے تو کیا شہداء کی یاد منانے کا وہ طریقہ مناسب تھا، جس کا مظاہرہ اکیس فروری کو ہوا۔

باہر سے بیرا چلایا تھا...... ''آپا! آپ کے وزیٹر کا چٹ۔''

اس نے سُنا اور اپنے دونوں بازوؤں کو انگڑائی کے انداز میں اوپر کرتے ہوئے مینی سے کہا...... ''اے بی! ذرا پکڑ، دیکھوں تو کون سا وزیٹر ٹپکا ہے۔''

وہ اس وقت کرسی پر بیٹھے سامنے ڈیسک پر پاؤں پسارے کتاب گود میں رکھے آہنی جالی کے بڑے بڑے سوراخوں سے باہر دیکھتے ہوئے صرف یہ سوچ رہی تھی کہ کل رحمٰن سر جو ٹیسٹ لینے والے ہیں، اس سے کیونکر چھٹکارہ حاصل کیا جائے۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس نے نہ لیکچر سنے تھے اور نہ ہی کسی سے نوٹس لینے کی تکلیف گوارہ کی تھی۔ رحمٰن سر جو کسی بھی بے قاعدگی کو برداشت نہیں کرتے تھے، اب اس سے خاصے خفا تھے۔ سختی سے انہوں نے اسے تنبیہ کی کہ اگر وہ اس بار بھی ٹیسٹ سے غیر حاضر رہی تو یہ اس کے لیے برا ہوگا۔

وہ اب گھبرائی تھی، اس کی پارٹی کے لڑکوں نے اسے یوں ہراساں دیکھ کر پوچھا اور جب بات کھلی تو انہوں نے بھاگ دوڑ کی اور کہیں سے نوٹس لا کر اسے دیے۔

پر چار پانچ ورق الٹنے کے بعد اس نے کاپی عطا کے ہاتھ میں دے دی۔ یہ نوٹس میرے معیار کے نہیں، فضول ہی وقت ضائع کیا۔

اور دبلے پتلے عطاء الرحمٰن نے کاپی پکڑتے ہوئے اپنے دل میں کہا تھا...... تو یہ ان کے معیار کے نہیں، اتنی قابل تو نہیں دکھتیں۔ یوں کہو پڑھنا ہی نہیں۔

وہ بیمار ہو جائے، میڈیکل سرٹیفکیٹ بھیج دے۔ پر رحمٰن سر تو اسے کھانے کو آجائیں گے۔

''میرے اللہ! میں کیا کروں، ٹیسٹ میں فیل ہونا ٹیسٹ نہ دینے سے زیادہ ذلیل بات ہے۔''

مینی نے اسے چٹ دی۔

بینو نے لکھا تھا...... ''سومی آپا! شبلی بھیا لاہور سے آگئے ہیں، آپ فوراً گھر آئیں۔''

وہ مسکرائی، کتاب کو لاپرواہی سے بستر پر پھینکا، منہ ہاتھ دھویا، ساڑھی بدلی، بالوں میں کنگھی کی اور عظیم پور جاتے ہوئے اس نے اپنی بھاوج کی باتیں یاد کیں جو انہوں نے کل شام فون پر اس سے کی تھیں۔

گھر تو اسے گھسیٹ کر ہی لے جایا گیا تھا۔ یوں وہ ہم لوگوں میں جلد ہی گھل مل گیا، اس کی خاطر مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی۔ کار اس کی تحویل میں دے دی گئی، ہم لوگوں کے درمیان بہت کم سیاسی بحثیں ہوئیں۔ وہ ویسے بہت پسند آیا ہے، ہمارے خلوص اور محبت سے وہ خود بھی بہت متاثر ہوا ہے۔ بہت اصرار سے ڈھاکہ آنے کے لیے کہا گیا ہے۔

ماں کمرے میں کپڑے استری کر رہی تھیں۔ بینو، بلبل اور فخر میں سے کوئی بھی گھر نہ تھا۔ ہمیشہ کی طرح ماں نے گلہ کیا کہ وہ اتنا کم کیوں آتی ہے؟...... ''لیجیے ماں! ابھی پرسوں تو ہو کر گئی ہوں۔''

ماں نے اسے بتایا کہ شبلی باہر برآمدے میں بیٹھا ہے۔ وہ کچھ جھجکی اور ان سے بولی...... ''آپ میرے ساتھ چلیے۔''

''پگلی!''...... انہوں نے پیار سے اسے دیکھا...... ''تم چلو اور اپنے گھر والوں کا حال احوال، اس سے پوچھو۔ میں ابھی آرہی ہوں، یہ دو کپڑے رہ گئے ہیں، تمہارے بابا آکر پہنیں گے۔''

اس کا دل ذرا گھبرایا اور چال میں بھی لڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی۔ اپنے آپ کو اس نے بہت نفرت سے طعنہ مارا...... ''تو اپنی ذات پر اعتماد تمہیں بس اتنا ہی ہے کہ احساس کی ہلکی سی کمزوری

اسے یوں ڈھیر کردے۔"

کمرے کے آخری سرے پر ٹھہر کر اس نے اپنا حوصلہ بڑھایا اور برآمدے میں آئی جہاں وہ بانس کی ایزی چیئر پر بیٹھا، گزشتہ دنوں کے بنگلہ اخبار دیکھ رہا تھا۔

اسے دیکھ کر وہ لمحہ بھر کو مسکرایا، آنکھوں اور ہونٹوں پر پھیلی یہ مسکراہٹ خاصی اپنائیت لیے ہوئے تھی۔

"کیسی ہیں آپ؟"......نرم آواز میں پوچھا گیا۔

"اچھی ہوں! کہتے ہوئے وہ بولی...... "آپ سنایئے، لاہور کا چکر کیسا رہا، میرے گھر والے تو اچھے ہیں؟"

تب اس نے اپنا رخ تھوڑا سا بدلا اور اسے دیکھا جو برآمدے کی بیرونی دیوار پر رکھے گملے کے پاس کھڑی، مالوتی کے پھولوں کو انگلیوں سے مسل رہی تھی۔ اس نے راج شاہی سلک کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔

یہ اس کے گھر والوں نے تو فلیپر اور بیل باٹم میرے ہاتھ بھیجے ہیں پر میں تو عرصۂ دراز سے دیکھ رہا ہوں کہ یہ ساڑھی کے علاوہ کوئی دوسرا لباس پہنتی ہی نہیں اور اس میں یہ لگتی بھی گریس فُل ہے۔

"آپ مجھے کچھ بتائیں گی؟"

وہ چونکی، اس کی طرف دیکھا۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا، گھبرا کر وہ باہر دیکھنے لگی۔

"کہیے! کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟" وہ بدستور باہر دیکھ رہی تھی۔

"آپ کو میرے لاہور جانے کا علم کیسے ہوا؟"

"بس ہو گیا، کیسے ہوا، یہ بتانا قطعی ضروری نہیں۔ آپ مجھے گھر والوں کے متعلق بتائیں"......اس کا لہجہ تیز تھا۔

وہ مسکرایا، پاؤں پلنگ کی پٹی پر بجاتے ہوئے بولا۔

"آپ کے گھر والے الحمد اللہ ٹھیک ٹھاک ہیں۔ آپ کو بہت یاد کرتے ہیں، خاص طور

پر آپ کی ماں جی''......

''ماں جی، مجھے یاد کرتی ہیں!''......اس نے اپنا کٹے بالوں والا سر نفی میں ہلایا......''آپ مذاق کرتے ہیں۔ وہ تو دس نفل روز شکرانے کے پڑھتی ہوں گی کہ میں گھر سے دفعان ہوئی۔''

اس نے کھڑے ہو کر چپل پہنی اور دوسرے دروازے سے اندر جاتے ہوئے بولا......

''تو اتنا تنگ کر رکھا تھا نہیں۔''

اس کا جی جل کر رہ گیا۔ کھلے برآمدے سے نیچے جھانکتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

''لو! ماں نے مجھے اس کے پاس باتیں کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ اور وہ اٹھ کر بھی چلا گیا ہے۔ ایک بات بھی ڈھنگ سے نہیں بتائی۔''

آسمان شفاف تھا۔ شام کا سورج بہت نیچے جا رہا تھا۔ عظیم پور اسٹیٹ کے چار منزلہ فلیٹوں کی چمنیوں سے دھواں اڑ کر فضا میں پھیل رہا تھا۔ بچے گراؤنڈ میں شور مچا رہے تھے۔

اس نے پلٹ کر دیکھا جہاں وہ بیٹھا تھا......''بدتمیزی کی انتہا ہے۔ تمہیں اگر جانا ہی تھا تو کیا مجھ سے معذرت نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے کیا تمہارے پاؤں میں زنجیر ڈال لینی تھی۔ افسوس! تعصب نے تم سے ایٹی کیٹس بھی چھین لیے ہیں۔''

اس کا جی چاہا، مالوتی کے پھولوں والا گملا اٹھا کر پھینک دے اور یہاں سے بھاگ جائے۔

اور جب وہ اپنے ہاتھ میں چھوٹا اٹیچی کیس پکڑے واپس آیا۔ تو اس نے بے یقینی کے انداز میں اسے دیکھا۔ وہ جھک کر اسے کھول رہا تھا۔

چند جدید وضع کے خوش رنگ ملبوسات، اس نے بستر پر رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ بھابی نے آپ کے لیے بھیجے ہیں۔''

''میرے لیے!''......وہ تیزی سے آگے بڑھی......ناک سکوڑ کر نفرت سے بولی۔

''یہ سب کس لیے بھیجے ہیں؟ میں نے تو انہیں پہننا ہی چھوڑ دیا ہے''......وہ حیران تھی، کل آپا نے فون پر کپڑوں کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔

''گڈ گا ڈیہ فلیپر!''......اس نے چیک فلیپر اٹھا کر دیکھا۔

ماں بھی آ گئی تھی......''دیکھو ماں! کیا فضول چیزیں بھیج دی ہیں بھابھی نے، مفت میں پیسے ضائع کیے۔''

''بس ساڑھی پہنا کر دتم''......ماں نے فیصلہ کر دیا۔

بینو آیا تو وہ بولی......''بہت شیطان ہو تم، مجھے چٹ بھجوا کر کہاں غائب ہو گئے تھے؟''

بلبل اور فخر بھی تھوڑی دیر بعد آ گئے۔ وہیں چائے پیتے ہوئے اس نے بوبی اور راجہ کی ڈھیر ساری دلچسپ باتیں سنائیں جنہیں سن کر وہ سب خوش دلی سے ہنستے رہے۔

''شبلی بھیا!''......فخر مسکرایا......''آپ نے سومی آپا کے بارے میں ان لوگوں کو کچھ نہیں بتایا۔''

''کیا بتاتا وہ!''......ماں فخر کا مطلب سمجھ کر قدرے غصے سے بولیں۔

''یہی کہ ان کی بیٹی، اب چٹا گانگ ہل ٹریکس یا باریسال کے ساحلی علاقے کی ایک سندر بنگالن لگتی ہے۔ وہ ایک نامی گرامی شخصیت بن چکی ہے جو بنگلہ میں ایسی شاندار تقریریں کرتی ہے کہ کیا بنگالی کریں گے۔ جلسے جلوس میں جب تک وہ نہ ہو، ان کی کامیابی کا کوئی سوال ہی نہیں۔ کتابیں اس نے گم ہو جانے کے ڈر سے لاکر میں بند کر دی ہیں۔ کیونکہ ان کے لیے وہ دِقت افورڈ نہیں کر سکتی۔ ٹیسٹوں میں تین چار سے زیادہ نمبر لینا اسے قطعی پسند نہیں، جنرل پروگریس بہرحال اچھی ہے۔''

بلبل اور بینو کے ساتھ ہی وہ بھی ہنس پڑی۔ ہنسا وہ بھی لیکن ذرا کم۔ ماں خفگی سے بولیں۔

''الٹی پٹیاں پڑھاؤ اسے۔''

''ارے ماں! جان کیوں نکلنے لگی ہے تمہاری......شبلی بھیا تو لاہور سے آ گیا ہے۔'' ہنستے ہوئے فخر چائے کے کپ پر جھک گیا تھا۔

وہ کرسی پر بیٹھی آلتا لگا رہی تھی۔ ساڑھی کا آنچل اس کی گود میں پڑا تھا۔ سفید جالی کے بلاؤز میں اس کے سینے کے خدوخال نمایاں نظر آتے تھے۔ اس نے جھرجھری لی اور جوت کو دھپ سے فرش پر مارا۔ دھپ کی آواز پر اس نے چونک کر سر اٹھایا اور پھرتی سے آنچل کو اپنے سینے پر پھیلاتے ہوئے شگفتگی سے اس سے پوچھا کہ وہ کیسی ہے؟

یہ بیلا اسلام اسے بہت پسند تھی۔ وجہ بس اتنی سی تھی کہ وہ اُردو گانے گاتی تھی، اُردو بولنے کی کوشش کرتی تھی اور اس پنجابی کپتان چھوکرے سے محبت کرتی تھی جو اسے لمبے لمبے خط لکھتا تھا اور جس کے خطوط وہ اسے ہمیشہ پڑھایا کرتی۔

اس وقت وہ اپنے کمرے میں پاؤں پر آلتا لگا رہی تھی اور جہاں آراء بیوٹی سلیپ لے رہی تھی۔

''کمبخت!'' اس نے اسے سفید چادر اوڑھے دیکھ کر کہا۔

اور جب اس نے چادر اتار کر اس کا منہ ننگا کیا تو مُندی مُندی آنکھوں سے وہ اسے دیکھتے ہوئے بولی...... ''اے چلو ہٹو! سونے دو، میرا گھنٹہ پورا نہیں ہوا۔''

''اللہ گنجے کو ناخن نہیں دیتا، ٹھیک ہی کرتا ہے وہ۔ اس صورت پر تمہارا یہ نخرہ اور جو کہیں حسن مل جاتا تو معلوم نہیں کیا ہوتا۔''

اس نے ایک زوردار انگڑائی لی اور اٹھ کر بیٹھ گئی...... ''میری جان! یہ تم نے خود کو زلیخا کب سے سمجھنا شروع کر دیا ہے؟''

''بکواس بند کرو! وقت دیکھو چلنے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟''

آنکھوں کو ہتھیلیوں سے مسلتے ہوئے اس نے طویل جمائی لی اور بیزاری سے بولی...... یہ سالگرہ منانے کی منطق کبھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ بھئی سال گزرتے ہیں تو یہ کون سا فخر کی بات ہے؟ انہیں تو گزرنا ہی ہے۔ مفت میں لوگوں کی جیبیں خالی کروانی، فضول چونچلے۔

لطف النسا کے بچے کی سالگرہ تھی۔ جہاں آرا کی خاص دوست تھی۔ پر اس سے بھی بہت محبت سے پیش آتی اور اکثر جہاں آراء کے ساتھ اسے ملنے اس کے ڈیپارٹمنٹ آیا کرتی۔ شلپی کی پارٹی کی ایک اہم ستون تھی۔

وہ اسے تیار ہونے کا کہہ کر نیچے چلی آئی۔ لاکر میں سے اس نے وہ پھولدار فلیپر نکالا جو بھابھی نے اس کے لیے شلپی کے ہاتھ بھیجا تھا۔

وہ آج ساڑھی نہیں پہننا چاہتی تھی۔ اکتا گئی تھی۔ وگ سے اس نے جدید وضع کے بال بنائے، ہلکا ہلکا میک اپ کیا، کمر کے گرد سنہری موتیوں والی زنجیر باندھی اور تیار ہو کر جہاں آرا کے کمرے میں آ گئی۔

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی بال بنا رہی تھی۔ آئینے میں اس کی جھلک دیکھ کر مسکرائی اور بولی...... ''آج کس پر بجلی گرے گی؟''

اس نے کرسی پر بیٹھ کر دراز کھولا تھا، اس میں پڑی پرفیوم کی مختلف شیشیوں کو دیکھا اور ٹیولپ کا ڈھکنا کھول کر خوشبو اپنی گردن کی ابھری ہوئی ہڈی پر لگاتے ہوئے کہا...... ''جہاں آرا بنتِ میر حسن پر۔''

''لو کس زعم میں ہو؟ ایسی ایسی بجلیاں مجھ پر گرنے لگیں تو سمجھ لو میرا اللہ حافظ ہے۔ اے بی! یوں کیوں نہیں کہتی کہ شلپی پر گرے گی۔ جو آج کی تقریب کا مہمانِ خصوصی ہے۔''

''اس پر گرے گی تو وہ کون سا جل جائے گا۔''

اور جب وہ لمبے فیتے والا بیگ ہاتھ میں جھلاتے ہوئے گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی تو اس سے ذرا پیچھے آنے والی نے چشمہ اپنی ناک پر فٹ کرتے ہوئے کہا...... ''یہ اسلامی چھیتر و شنگھو کی سرگرم رکن ہے یا کیرلی بیکر کی بہن۔''

''بکواس بند کرو!''...... اس نے رخ پلٹ کر کہا۔

''ڈوب مرو کسی گندے تالاب میں۔ کیوں اسلام کے نام پر بٹہ لگا رہی ہو؟'' وہ چڑاتے ہوئے بولی۔

''اب میری جان اتنی بھی سستی نہیں کہ دور دیس کے گندے تالابوں میں ڈوبتی پھروں اور اسلامی چھاتر و شنگھو کو سپورٹ کرنے کا یہ قطعی مقصد نہیں کہ میں تارک الدنیا ہو جاؤں۔''

''کوئی ضرورت نہیں۔ پر جانی! اگر تیری پارٹی کا امیر تجھے اس حلیے میں دیکھ لے تو یقیناً یہ پریس ریلیز جاری کرے کہ سمعیہ علی کو فی الفور پارٹی کی رکنیت سے خارج کیا جاتا ہے۔''

''میرا خیال ہے لطف النسا کے ہاں جانے کی بجائے مَیں کیوں نہ تجھے ڈاکٹر وصی کے پاس لے چلوں۔ بلڈ پریشر زیادہ ہائی ہونے کا سخت امکان ہے۔''

اب اس کی باری تھی بکواس بند کرو کہنے کی۔

اور جب وہ کوہان نما جوڑے والی لڑکی، جس کی کمر کے گرد سنہری زنجیر اس کی چال کے ساتھ ہلکورے کھاتی گیٹ میں داخل ہوئی تو اس نے چونک کر اسے دیکھا جو ہلکے گیروے رنگ کے کرتے پاجامے میں دس بارہ کے مجمع میں بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ اس کی موٹی حسین آنکھوں نے بغور اس کا جائزہ لیا تھا جو نپے تلے قدموں کے ساتھ لان میں اُگے پیپتے کے درختوں کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں لڑکیاں اور لڑکے بیٹھے تھے۔

کیسا عجیب لگا تھا اسے، جانے کیوں وہ اسے اپنے سے اس سمے دور محسوس ہوئی تھی۔ وہ جو ساڑھی میں اتنی گریس فل لگتی، آج کیسی لگ رہی تھی۔

اور کچھ دیر بعد جب لطف النسا اسے اپنے شوہر سے متعارف کروانے کے لیے ان کے پاس لائی تو فضا میں اس کی آمد کے ساتھ ہی مسحور کن خوشبو بکھری۔

علیک سلیک کے بعد سمعیہ علی نے خاصی بے اعتنائی سے اسے نظر انداز کر دیا۔ وہ دوسرے لوگوں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ پہلی بار اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کی شخصیت میں سحر ہے، اس کی آواز میٹھی اور گفتگو کا انداز دلکش ہے۔

پھر جب انہوں نے پہی برتھ ڈے ٹو یو ڈیر کاظم، گالیا تو اس نے کیک اور پیسٹریوں سے سجی میزوں کے درمیان پلاسٹک کے پیالوں کو بہت رغبت سے دیکھا تھا۔ جن میں آم کا گودا اور کھلی کے سفوف کا آمیزہ تھا اور بہت لذیذ لگ رہا تھا۔

تبھی کسی نے لوچ دار آواز میں اسے سندیش کی پلیٹ پاس کرنے کے لیے کہا۔ اس نے گھوم کر دیکھا، قامت درمیانی اور صورت کا دیسی تھا۔ پر لب ولہجہ غضب کا امریکی تھا۔ اس نے پلیٹ اٹھا کر اسے دی اور خود مونگرہ لینے کے لیے ڈش پر جھک گئی۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ مغربی پاکستان کے کس حصے سے اس کا تعلق ہے؟

اس کے ہاتھ میں پکڑا چمچہ پلیٹ کے کنارے سے ٹکرایا تھا۔ مونگرہ کے دانوں کو بغور دیکھتے ہوئے اس نے سوچا تھا...... ''اب کیا پھر مجھے حکمران طبقے سے آنے کا طعنہ سننا پڑے گا۔''

مدھم آواز میں اس نے اس سوال کا جواب دیا۔ امریکیوں کی طرح انگریزی بولنے والے نے سندیش کھاتے ہوئے مسکرا کر کہا...... ''آپ کی شان بھی کچھ لاہور کی طرح ہے۔''

اس نے لمبی گردن پر ٹکے سر کو خفیف سی جنبش دی اور اتنی خوبصورت بات کہنے والے کا رواں بنگالی میں شکریہ ادا کیا۔

اور جب وہ اپنے لیے چائے بنا رہی تھی تو اس نے ایک اور کپ بھی بنا دینے کا سوچا۔ وہ

سیدھی ہوئی اور اپنے قریب کھڑے اس نوجوان سے چینی اور دودھ کے بارے میں دریافت کرنے لگی۔

اور جب وہ اسے چائے کا کپ پکڑا رہی تھی تو اسے یہ معلوم ہی نہیں ہوا تھا کہ دور کھڑے اجتبیٰ الرحمٰن نے اسے غور سے دیکھا تھا۔

وہ چائے بھی پی رہی تھی اور اس سے باتیں بھی کرتی جاتی تھی۔ نوجوان مرکزی ڈائرکٹریٹ میں اونچے عہدے پر فائز تھا۔ حال ہی میں امریکہ سے واپس آیا تھا اور چند دنوں تک اسلام آباد جانے والا تھا۔ اس نے میجر احسن کے بارے میں اسے بتایا اور ملنے کی بھی تاکید کی۔

تبھی پاس کھڑے ایک اور نوجوان نے اس سے پوچھا کہ اس کی مادری زبان اردو ہے یا پنجابی؟

''پنجابی''......اس نے جواب دیا۔

''یہ تو بتایئے ذرا'' وہ مشکی رنگ والا نوجوان پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوا......''کہ آپ لوگوں نے اپنی زبان کو اپنے ہی ہاتھوں کیوں قتل کر دیا؟''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی''......اس کی نکھری نکھری آنکھوں میں حیرت واضح تھی۔

''بھئی! اپنی زبان کی نشوونما کرنے کی بجائے ایک غیر زبان کی آبیاری جو کر رہی ہیں آپ۔''

''غیر زبان!''......اس نے لکنت زدہ لہجے میں کہا، اس کے ہاتھ میں پکڑا کپ لرزا تھا۔ اس کے شاداب چہرے پر غم و غصہ کا ایک سایہ لہرایا تھا۔ اپنی آواز میں تیزی اس نے خود محسوس کی جب اس نے یہ کہا تھا معاف کیجئے گا، اُردو کے لیے آپ نے غیر کا لفظ استعمال کر کے انتہائی تعصب کا ثبوت دیا ہے۔ یہ ہماری اپنی زبان ہے، یوں اس کے ساتھ ''ہماری'' کی تخصیص کچھ موزوں بھی نہیں، یہ تو برصغیر کے مسلمانوں کی زبان ہے، اس کی آبیاری کچھ پنجاب والوں نے نرالی نہیں کی، اسے تو بنگال نے بھی پروان چڑھایا ہے۔''

اور اپنے لیے چائے کا دوسرا کپ بناتے ہوئے اس نوجوان نے مزید کہا...... ''آپ اُردو بولتی ہیں، اُردو سے محبت کرتی ہیں۔ کیا میں یہ جان سکتا ہوں کہ آپ کس تہذیب کی نمائندہ ہیں؟ محترمہ! زبانیں تو قوموں کی تہذیب وثقافت کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔''

''درست فرماتے ہیں آپ!''......اس نے طنز سے اس آدمی کو دیکھا جو تیس اور پینتیس کے ہیر پھیر میں ہوگا اور تیکھی آواز میں بولی...... ''تبھی آپ کی سنسکرت اور ہندی زدہ زبان یہ ظاہر کرتی ہے کہ آپ ابھی بھی ذہنی طور پر ہندوؤں کے غلام ہیں۔ میں جان سکتی ہوں کہ آپ کی بنگلہ بھاشا کس کلچر اور تہذیب کی نشاندہی کرتی ہے؟''

اور اس آدمی نے اسے بہت دھیان سے دیکھا۔ چم چم اپنی پلیٹ میں لیتے ہوئے اس نے کچھ بولنا چاہا ہی تھا کہ امریکہ پلٹ نوجوان، ایک دبلی پتلی لڑکی کے ساتھ اس کے پاس آیا۔ یہ لطف النسا کی نند اور اس نوجوان کی چھوٹی بہن تھی۔ جہاں آرا دوسرے کونے میں اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ اب جو اس نے دیکھا، وہ وہاں نہیں تھی...... ''یہ کدھر چلی گئی ہے؟ جبکہ اس کے سبھی ساتھی یہیں کھڑے ہیں۔''......اس نے سوچا اور پھر باتوں میں جت گئی۔ یہ نوجوان کھلے دل کا مالک تھا، فراٹے کی انگریزی بولتا تھا۔ اُردو بنگلہ دونوں سے آزاد تھا۔

جہاں آرا داہنے دروازے سے اندر آتی دکھائی دی۔ وہ سیدھی اس کے قریب آ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

ڈاکٹر وصی آئے ہیں۔ شمع بھابھی بیمار ہیں اور بچیاں پریشان ہیں۔ میں ان کے ساتھ گھر جا رہی ہوں۔ تم اگر چلنا چاہتی ہو تو چلو تمہیں ہال ڈراپ کرتے جائیں گے۔

''پر انہیں لطف النسا کے گھر کا علم کیسے ہوا؟''

''ہال گئے تھے جہاں سے روشن کو لے کر آئے ہیں۔''

''بھئی! تمہارے ساتھ ہی چلتی ہوں۔ وگرنہ سائیکل رکشاؤں پر میں کہاں دھکے کھاتی پھروں گی۔''

اور لطف النساء کی نند جہاں آرا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''پارٹی کا لطف تو ابھی آئے گا، گیت ویت ہوں گے۔''

چلیے آپ کی تو مجبوری ہے پر انہیں چھوڑتے جایئے ہم لوگ پہنچا آئیں گے۔ پھر وہ اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ کو بنگلہ گیت پسند نہیں۔''

پسند کی کیا بات کرتی ہو بی بی!...... میری تو جان ہیں یہ گیت۔ پر رات گہری ہوگئی تو جانا مسئلہ بن جائے گا۔''

''اس کی فکر مت کریں''...... اب کی بار نوجوان بولا۔

اور پھر لطف النسا کے چھوٹے سے لان میں برقی روشنیوں میں راگ رنگ کی محفل جمی۔

شہید نے ستار بجایا، وہ ٹی۔ وی اور ریڈیو کا اچھا آرٹسٹ تھا۔

وہ کرسی پر بیٹھی موسیقی کے سحر میں کھوئی رہی اور اس وقت چونکی جب شلپی سے ستار بجانے اور گیت سنانے کی فرمائش کی گئی۔

پونے چھ فٹ کا وہ نوجوان جو اس کا محسن بھی تھا اور اس کی قوم سے نفرت بھی کرتا تھا، ستار کو مہارت سے بجا رہا تھا۔ اس کی خوبصورت پُرکشش آنکھیں اس کے چوڑے چکلے شانوں کے ساتھ ستار کے تاروں پر جھکی تھیں۔

لطف النسا کا گلا بھی اچھا تھا۔ دو گیت اس نے نذرل کے سنائے، وہ اب بے چین ہو رہی تھی۔ اور اس کی وجہ اس کی کلائی پر بندھی گھڑی کی سوئیاں تھیں جو تیز رفتاری سے نو کے ہندسے سے دس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

اس نے آہستگی سے لطف النسا کا شانہ دبایا۔

''لو میں تو بھول ہی گئی تمہیں تو دس سے پہلے ہال پہنچنا ہے۔''

اس نے اپنا بھاری بھرکم جوڑے والا سر اپنے شوہر کی طرف گھمایا اور کہا۔

''آپ سومی کو اس کے ہال نہیں چھوڑ آتے۔''

ان کا وہ امریکہ پلٹ دیور جلدی سے بولا......''مجھے ڈھا کا کلب جانا ہے، میں انہیں لیے جاتا ہوں۔'' تب وہ اپنی جگہ سے اٹھا، اس نے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی جو اس وقت گومگو کی حالت میں بیٹھی تھی۔

''لطف النسا! آپ لوگ رہنے دیں، یہ میرے ساتھ گھر جائے گی، ماں کو اس سے کام ہے۔

''یہ اور بھی اچھا ہے''......وہ بولی۔

اور سمعیہ علی نے دیکھا تھا، اس فراٹے کی انگریزی بولنے والے کا چہرہ اتر گیا تھا۔

اب یہ کیسے ممکن ہے کہ میں تمہیں یوں کسی اور کے ساتھ جانے دوں، تم بہر حال ہماری ذمہ داری ہو!......اس نے خود سے کہا تھا۔

اور جب وہ اس کے ساتھ کار کی طرف بڑھ رہی تھی، اس نے سوچا تھا کہ میں کیا سمجھوں۔ تمہیں میرا کسی کے ساتھ جانا پسند نہ تھا۔ تمہیں اپنی ذمہ داری کا خیال آیا۔ یا تم نے سوچا کہ تم اس طرف جا رہے ہو۔ کیا واقعی ماں کو مجھ سے کام ہے؟ پر اس کا دل جو کچھ کہہ رہا تھا اس پر اسے یقین نہ تھا۔

تاتاش گیس کمپنی کا بورڈ برقی قمقموں کی روشنی میں بہت نمایاں نظر آ رہا تھا۔ مختلف انشورنس کمپنیوں، بینکوں اور چھوٹی موٹی صنعتوں کے لمبے چوڑے انگریزی اور بنگلہ بورڈ موتی جھیل کی جدید عمارتوں کی پیشانیوں پر چمک رہے تھے۔ یہ کمرشل ایریا تھا۔ بوتل گرین ٹیوٹا اس پُررونق علاقے کی کشادہ سڑک پر کسی چھوٹے بچے کی طرح ننھے منے قدم اٹھاتی دوڑ رہی تھی۔

رات کا پہلا پہر جوان تھا۔ چھٹی کا چاند جگمگاتی مصنوعی روشنیوں میں بالکل ماند پڑا ہوا تھا۔

اس نے ریڈیو کا بٹن دبایا۔ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس شروع تھی۔ طلعت محمود گا رہا تھا۔ آواز ذرا ابھر رہی تھی۔ اس نے ٹھیک کی اور اطمینان سے پھر باہر دیکھنے لگی۔

ایک پل کے لیے اسے خیال آیا کہ اس نے اُردو گانا لگا دیا اور ریڈیو بھی خود ہی آن کر لیا ہے۔ ممکن ہے وہ محسوس کرے۔

''مائی فٹ! محسوس کرتا ہے تو کرے، میں از خود بیٹھی ہوں کوئی؟''......اس نے بہت رعب اور شان سے یہ سوچا، سر جھٹکا اور گیت سننے میں محو ہو گئی۔

تبھی اس سے پوچھا گیا کہ......وہ گاڑی چلانا جانتی ہے۔

اس نے ایک نظر اپنے قریب بیٹھے نوجوان پر ڈالی۔ اس کے چہرے پر بشاشت تھی۔ لمبے چوڑے ہاتھ سٹیئرنگ کو سکون سے گھمار ہے تھے۔ موٹی موٹی آنکھیں باہر سڑک کو دیکھ رہی تھیں جہاں چاندنی اور ٹیوب لائٹس کی روشنی گڈمڈ ہو رہی تھی۔

''نہیں''......اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''سیکھیں گی۔''

اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اُسی انداز میں بیٹھا تھا۔ چہرے پر کوئی خاص تاثر نہ تھا۔ وہ الجھی اور خود سے بولی۔ یہ سوال پوچھنے سے اس کا کیا مطلب ہے۔ کیا یہ خود سکھائے گا۔ یہ جسے میری قوم سے اللہ واسطے کا بیر ہے۔ جس کا سارا وقت زہر اگلنے اور ذہنوں میں زہر بھرنے میں گزرتا ہے۔ یہ مجھے ڈرائیونگ سکھائے گا۔ کیسے ممکن ہے۔ یہ مذاق ہے غالباً وہ میرے خیالات معلوم کرنا چاہتا ہے۔''

اس نے باہر دیکھا۔ بیت المکرّم کے سامنے کھڑی ریڑھی پر پڑے بچے کھچے کیلوں کو ایک لڑکا گن رہا تھا۔ ایک عورت سڑک پار کرنے کی کوشش میں دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔ دو چھوٹے بچے ایک بوڑھے آدمی کا ہاتھ پکڑے اچھلتے کودتے جا رہے تھے۔

اس نے اپنا بازو سیٹ کی بیک پر پھیلایا اور روکھے مگر پُر اعتماد لہجے میں بولی...... ''نہیں''۔

اور یہ چار حرفی لفظ کہہ کر اس نے اس کی طرف بالکل نہیں دیکھا۔ اپنی لانبی گردن کو کچھ اور بھی لانبا کیا۔ اپنے آپ پر اسے کچھ زیادہ غرور محسوس ہوا۔ ونڈ سکرین سے باہر سڑک کو دیکھا جو کشادہ تھی اور اس وقت بہت سیاہ نظر آ رہی تھی۔

کار بہت آہستہ چل رہی تھی۔ طلعت محمود اپنی محبوبہ کو اپنے دلی جذبات سنا چکا تھا اور اب آل انڈیا ریڈیو کی اُردو سروس حالات حاضرہ پر تبصرہ کر رہی تھی۔ اس نے ریڈیو بند کر دیا۔

ریس کورس روڈ پر ڈھاکا کلب جگمگا رہا تھا۔ ٹی۔ ایس۔ سی کی ارغوانی عمارت چاندنی میں نہا رہی تھی۔ گاڑی مڑی اور رقیہ ہال کے سامنے رُک گئی۔

''تو میرا دل جو کچھ کہہ رہا تھا ٹھیک ہی تھا۔'' اس نے سوچا اور گھڑی دیکھی۔ پونے دس ہو رہے تھے۔

اس نے دروازہ کھولا اور اترنے سے پہلے اسے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے دونوں کی نگاہیں ملیں۔ رسمی شکریے کے وہ الفاظ جو وہ کہنے لگی تھی۔ اسے بھول گئے۔ اس کا دل دھڑکا اور وہ تیزی سے باہر نکلی۔ اس کے پاؤں زمین سے چھوئے۔ اس کے نازک ملائم ہاتھ کی گرفت دروازے پر سخت ہوئی کیونکہ اسے محسوس ہوا تھا جیسے وہ گر رہی ہو۔

وہ چلتی گئی اور وہ سٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے اسے جاتے دیکھتا رہا۔

''یہ اندر چلی جائے تو میں جاؤں۔''......اس نے اپنے آپ سے کہا۔

پر وہ حیران تھا۔ اس وقت ساڑھے دس ہو رہے تھے۔ رقیہ ہال کا گیٹ ٹھیک دس بجے بند کر کے چابی ہاؤس ٹیوٹر کو پہنچا دی جاتی تھی...... ''کیا اسے ہال کے قواعد کا علم نہیں؟''

اس نے لوہے کا گیٹ زور سے تھپتھپایا۔ پھر تھپتھپایا۔ اسے معلوم تھا کہ گاڑی کھڑی ہے۔ جھلا کر اس نے پوری قوت سے ہاتھ مارا...... ''کیا بے ہودگی ہے؟ پندرہ منٹ پہلے ہی بند کر دیا ہے۔''......وہ غصے سے بڑبڑائی۔

یوں وہ خوف زدہ تھی کہ کہیں یہ ٹھپ ٹھپ، پرووسٹ نے سن لی تو اسے پارٹیاں اٹینڈ کرنے کا مزہ آ جائے گا۔

قدموں کی چاپ سنائی دی تو اس کی جان میں جان آئی کہ نومی گیٹ کھولنے آ رہا ہے۔

اور جب اس نے آواز دی...... ''کون ہے؟''......تو وہ رو دینے والے لہجے میں بولی...... ''دروازہ کھولو نا نومی! میں ہوں۔''

اور اس نے جواباً کہا...... ''آپا! اس وقت تو پونے گیارہ ہو رہے ہیں۔ چابی ہاؤس ٹیوٹر آپا کے پاس چلی گئی ہے۔''

''پونے گیارہ'' ......وہ چیخی اور اپنی گھڑی کو روشنی کی طرف کیا جہاں ابھی دس بجنے میں چار منٹ باقی تھے۔

جب وہ کار کی طرف واپس آ رہی تھی۔ اس کی چال شکستہ تھی اور جب اس نے جھک کر کھڑکی میں سے اس سے وقت پوچھا تو اس نے دیکھا کہ اس کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے اور اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

تب اس نے دروازہ کھولا اور اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ پر وہ بولی...... ''میں ہال جانا چاہتی ہوں۔''

''گھبرایئے نہیں۔ گھر چل کر میں پرووسٹ کو فون کر دوں گا۔''

''پر میری روم میٹ لڑکیاں کیا کہیں گی؟ میں تو انہیں نو بجے واپس آنے کا کہہ کر آئی تھی۔''......آنسو تیز رفتاری سے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

''اب کیا ہو سکتا ہے؟ وقت کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔ بیٹھیے کچھ نہیں ہوتا۔''

اور اب بیٹھنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ گاڑی خفیف سے دھچکے کے ساتھ راستے پر چل پڑی۔

اور جب وہ گھر میں داخل ہوئی، ماں اور بابا سو چکے تھے، فخر اور بلبل پڑھ رہے تھے۔ دونوں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ جب اس کی پریشانی کا انہیں علم ہوا تو وہ اسے تسلی دینے لگے...... ''سومی آپا واہ! ہم تو آپ کو اتنا بہادر سمجھتے تھے اور آپ اتنی بزدل نکلیں۔ ارے! آپ کے ہال کی لڑکیاں تو دو دو دن بغیر اطلاع کے غائب رہتی ہیں۔''

''ان کی بات اور ہے فخر! میں مغربی پاکستان کا سمبل ہوں۔ کوئی بھی ایسی بات ہوئی تو

تان ویسٹ پاکستان پر ٹوٹے گی۔''

''چھوڑیئے! اتنی گہری باتیں نہیں سوچتے۔''......وہ اطمینان سے بولا۔

اور پھر وہ چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں اس کے قریب ہی بیٹھی سُن رہی تھی۔ وہ فون پر رقیہ ہال کی پرووسٹ کو صورتحال بتا رہا تھا۔ جانے کیا بات ہوئی تھی، وہ مسکرا دیا تھا۔ پھر اس نے ریسیور اس کے کان کو لگاتے ہوئے کہا......''لو تم خود معذرت کرو۔''

اور جب اس نے ایسا کیا تھا، اس کا مضبوط ہاتھ اس کی گردن سے چھوا تھا۔ انہوں نے اسے محتاط رہنے کی تاکید کی۔ ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس نے سکھ کا سانس لیا تھا۔

ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے اس نے ممنون نگاہوں سے اسے دیکھا اور باہر آ گئی۔

اس کی جان تو ان دنوں سولی پر اٹکی ہوئی تھی۔ اس کا کھانا پینا اور آرام کرنا کبھی حرام ہو چکا تھا۔ اس کی رنگت پیلی پڑ گئی تھی اور ہونٹ سفید ہو گئے تھے۔ وہ ڈھاکہ کی گلیوں بازاروں میں گھومتی پھرتی، گندوراج کا وہ پھول لگتی جوان دنوں شہر میں جا بجا کھلا پڑا تھا۔

یہ بہار کے دن تھے۔ بکول کی کلیاں چٹک چٹک کر لوگوں کو محبت و شانتی کا درس دے رہی تھیں، پر یہاں طوفان آیا ہوا تھا۔ ڈھاکا یونیورسٹی کے الیکشن قریب تھے۔ کنویسنگ کا محاذ گرم تھا۔ گردنیں چاقو چھریوں کی زد میں تھیں اور نظریں خون کی پیاسی ہو رہی تھیں۔

یہ صرف ڈھاکا یونیورسٹی کے الیکشن نہ تھے۔ یہ نظریاتی جنگ تھی۔ یہ دو نیتاؤں کے درمیان کشمکش تھی۔

ایسے میں وہ اپنے آرام کا خیال رکھتی اور صحت دیکھتی کہ وہ متاثر ہو رہی ہے۔ اب اسے تو وہاں جانا بھی یاد نہ رہا تھا۔ جہاں وہ خوبصورت رنگ و روپ والی ماچھ بھات پکاتے، کمروں کی صفائی کرتے اور گھر میں گھومتے پھرتے، اچانک کال بیل کی آواز پر چونک پڑتی۔ رک کر دروازے کی جانب دیکھتی اور اسے وہاں نہ پا کر بجھ سی جاتی۔

اور پھر ایک دن انہوں نے فخر سے کہا...... ''اے بیٹے! تم ہی اس کی کچھ خبر لاؤ۔''

''ماں! آپ بھی بچوں والی باتیں کرتی ہیں۔ میں کہاں ڈھونڈتا پھروں گا۔ اسے تو ان دنوں اپنا بھی ہوش نہیں اور آپ ہیں کہ اس کے فراق میں گھلی جا رہی ہیں۔''

اور انہوں نے اس کی بات کا برا مناتے ہوئے کہا تھا۔

''دیکھو تو کیا کہتا ہے؟ اب میں اسے یہ کیسے سمجھاؤں کہ دور دیس کی وہ لڑکی تو مجھے یوں معلوم ہوتی ہے جیسے میرے ہی جسم کا ٹکڑا ہو۔''

تب ایک دن وہ خود اس سے ملنے چلی گئیں۔ وہ اس وقت ریسپشن روم میں بیٹھی پارٹی کے ارکان سے مختلف امور پر بحث کر رہی تھی۔ ماں نے اسے دیکھا تو سر پیٹ لیا۔

جھاڑو نہیں پھیرتیں ایسی پالیٹکس پر! دیکھو تو کیا صورت نکل آئی ہے؟ تمہارے گھر والوں میں سے اگر کوئی آ جائے تو میرے جنم پر تھوکے گا ہی نہ؟

اور اس چھوٹے سے کمرے میں جہاں کلاک ٹک ٹک کرتا تھا، سرمئی جے پارہ کی ساڑھی میں ماں پیار سے اسے اونچ نیچ سمجھا رہی تھیں۔

ماں کی محبت کیا چیز ہوتی ہے؟ اسے اس لطیف جذبے سے کچھ زیادہ آشنائی نہ تھی، پر بنگال کی اس عورت نے اپنی ممتا کا خزانہ اس پر جس طرح لٹایا تھا اس نے اس جذبے کی ماہیت اسے اچھی طرح سمجھا دی تھی۔

اور جب وہ انہیں سائیکل رکشے میں بٹھا کر واپس آئی تو اس کا جی عجیب سے نامعلوم جذبوں سے سرشار تھا۔ ملحقہ کمرے میں اس کے ساتھی شور مچا رہے تھے۔ ان کے پاس جانے کی بجائے وہ اسی کمرے میں پھر آ گئی جہاں چند لمحے پہلے اس کے سامنے ماں بیٹھی تھیں۔

آنسوؤں کے دو قطرے اس کی آنکھوں سے نکلے اور اس کے دامن پر گر گئے...... ''تم میرے سیاست میں الجھنے پر شاکی ہو، تمہیں گلہ ہے کہ میں آگ سے کھیل رہی ہوں۔ ماں! میں تمہیں کیا بتاؤں تم خود ہی سب کچھ جانتی ہو! یہ آگ جو کالجوں اور یونیورسٹیوں کی بلند و بالا

عمارتوں کے اندر بھڑک اٹھی ہے۔ جس نے خلوص اور رواداری سبھی کو جلا ڈالا ہے اب گھروں کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ان گھروں کی طرف جن کے مکین سیدھے سادے اور نیک طینت ہیں۔ ماں، جو گھر اس کی لپیٹ میں آ گئے تو تمہاری یہ بے پایاں محبت میرے لیے ختم ہو جائے گی...... میں اور تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ جائیں گے۔

ماں...... اس کے سینے سے ہوک اٹھی۔ دونوں بازو میز پر پھیلاتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دیر بعد آمینہ نے جھانکا تو اسے یوں تنہا روتے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ دوسرے لوگ بھی آ گئے۔ سب نے وجہ دریافت کی۔ پر وہ کیا بتاتی؟ ان سے معذرت کر کے اوپر چلی گئی۔ طبیعت قابو میں ہی نہ تھی۔

اور اگلے دن وہ پھر پارٹی کے مخصوص نعرے لگا رہی تھی۔

ان دنوں ماؤ کے خیالات کی پرستار لڑکیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ بڑ تلے کے نیچے بیٹھ کر وہ روز گاتیں۔

امار باڑی...... تمہاری باڑی کتھائے پٹنہ (میرا گھر...... تمہارا گھر کہاں پٹنہ! واضح رہے کہ پٹنہ میں بہت بڑا دماغی امراض کا ہسپتال ہے۔)

اور پھر جلوس کی شکل میں وائس چانسلر کی رہائش گاہ پر جاتیں اور پارٹی کو منظور کرنے کی درخواست کرتیں۔

تب نیل گگن کے سینے پر وہ چڑھا جس کے چڑھنے سے اندھیرے چھٹتے اور اجالے پھیلتے ہیں۔ یہاں وہاں روشوں قطعوں پر روپہلی چادریں بچھ گئیں۔ پر اس لڑکی کو کچھ نظر نہ آتا تھا۔ آنکھوں کے آگے نیلے پیلے کالے سرخ دھبے ناچ رہے تھے۔ موسم ہرگز گرم نہ تھا۔ خوشگوار ہوا پتہ بہار کے بوٹوں اور کیلوں کے پتوں پر دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی۔ پر وہ تھوڑی دیر بعد اپنی گردن پر ہاتھ پھیرتی اور کہتی۔

"کتنی گرمی ہے! جان نکلی جا رہی ہے۔"

اور واقعہ یہ تھا کہ اس پونے چھ فٹے متعصب نوجوان کی پارٹی بہت زوروں پر جا رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا بیلٹ بکسوں کو توڑ ڈالے، لڑکیوں کے بال نوچ لے اور ہر طرف بھگدڑ مچا دے۔ لوگوں کے سینوں میں اتر کر انہیں وہ کچھ دکھا دے جو اس کا شعور دیکھ رہا تھا۔

لڑکیاں ووٹ ڈالنے کے لیے جونہی گیٹ سے اندر آتیں وہ ان کی طرف بھاگتی، انہیں اپنی پارٹی کو سپورٹ کرنے کے لیے کہتی، دور تک ان کے ساتھ چلتی، پینسل ان کے ہاتھ میں دیتی۔ مسعود اشرف کو یاد رکھنے کا کہتی اور جب وہ آگے جا کر اس کا پینسل پھینک دیتیں تو اس کا دل بیٹھ جاتا۔

دن جو نیچے اور بہت نیچے ڈوبتا چلا گیا۔ مینگولیا کے پھولوں نے خاموشی سے اپنے سروں کو جھکا لیا تھا۔

اندر گنتی ہو رہی تھی اور باہر وہ جھروکوں سے لگی اندر سے آنے والی آوازوں کو سن رہی تھی۔ اس کا ہاتھ اپنے دھڑکتے دل پر تھا۔ اضطراری حالت میں وہ پلٹی، اس نے شفاف نیلے آسمان کو دیکھا تب وہ گڑگڑائی اور اس کے حضور سجدہ ریز ہوئی جسے دنیا رحمان اور رحیم کہتی ہے۔ معبود! یہ ملک تیرے نام پر حاصل کیا گیا ہے۔ اس کی بقا کو خطرہ ہے۔ اسے محفوظ کر میرے پروردگار۔ کہ اس سے کروڑوں انسانوں کا مستقبل وابستہ ہے۔

باہر کسی نے جئے بنگلہ کا نعرہ لگایا تھا۔ جہاں آرا آئی تو معلوم ہوا کہ سلیم اللہ، محسن، اقبال اور جناح ہال میں شبلی کی پارٹی جیت گئی ہے۔ لیکن وی۔ پی اور جنرل سیکرٹری کی سیٹیں دو ہالوں میں ان کی پارٹی کو ملی ہیں۔

دس بجے رات تک یونیورسٹی اور اس کے ملحقہ ہالوں کے نتائج کا اعلان کر دیا گیا، ان کے لیے نتائج اگر زیادہ امید افزا نہ تھے۔ تو اتنے مایوس کن بھی نہ تھے۔

حالات تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔

تاریخ کا انجانا موڑ سامنے تھا۔

اس نے غصے سے کہا...... ''کیا بہرے ہو گئے ہو؟ دس منٹ سے فون کی گھنٹی بج رہی ہے، سنتے کیوں نہیں؟''

اور وہ بھی اسی لہجے میں بولا تھا...... ''مجھے کہہ رہے ہو خود کیوں نہیں سن لیتے؟''

''بہت بدتمیز ہوتے جا رہے ہو تم بینو! دیکھتے نہیں میں پڑھ رہا ہوں۔''...... فخر برہمی سے بولا۔

''دیکھوں کیسے؟ درمیان میں دو فٹ موٹی دیوار جو حائل ہے۔''

اور قصہ یہ تھا کہ ماں کی جوان بھتیجی کا بوگرہ میں انتقال ہو گیا تھا۔ بابا اور وہ وہاں پُرسے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ گھر میں یہ لوگ اکیلے تھے۔ دوپہر کو دونوں بھائیوں میں خوب کھٹ پھٹ ہوئی تھی۔ کیونکہ فخر نے اس کی خوبانیاں کھالی تھیں جنہیں وہ دو دن سے سینت سینت کر رکھتا چلا آیا تھا۔ بینو کو اس کا بہت غصہ تھا۔ خوب صلواتیں سنائی تھیں اس نے فخر کو۔ نوبت تو مار کٹائی تک بھی آ پہنچی تھی۔ پر عین موقع پر ان کا بڑا بھائی کسی کام سے گھر آ گیا تھا۔

رہ رہ کر بینو کے دل میں اُبال اُٹھ رہا تھا۔ اتنی لذیذ اور میٹھی خوبانیاں جو سومی آپا کے

بھائی نے ان کے لیے بھیجی تھیں جنہیں وہ ڈھنگ سے کھا بھی نہ پایا تھا۔

اب ایسے میں وہ فخر سے کیسے بات کرتا۔

اور یوں بھی وہ اس وقت خواتین کے ہفت روزہ بنگالی رسالے ''بیگم'' میں دیناج پور کی چند لڑکیوں جو کسی کلچرل شو میں منی پوری رقص کا مظاہرہ کر رہی تھیں، کی تصاویر غور سے دیکھ رہا تھا۔

فخر پھر چیخا۔ اٹھتے کیوں نہیں بینو؟

''تمہاری کوئی دھونس ہے، جاؤ نہیں اٹھتا۔''

چار و ناچار وہ خود ہی جلتا بھنتا اٹھا۔ فون پر رقیہ ہال کی ہاؤس ٹیوٹر مسز چوہدری بول رہی تھی کہ سمعیہ علی کو صبح سے تیز بخار ہے۔ بہتر ہے کہ وہ لوگ اسے آ کر لے جائیں۔

ریسیور رکھ کر وہ بینو کے پاس آیا اور اسے بتایا۔ اپنا غصہ وہ یکسر بھول گیا۔ ''بیگم'' اس نے اُٹھا کر تپائی پر پھینکا اور فکر مندی سے بولا۔

''اب کیا کریں؟''

تب انہوں نے اپنے بڑے بھائی کے دفتر فون کیا۔ پر وہ وہاں نہیں تھا۔ ہائی کورٹ سے رابطہ کیا، وہ وہاں بھی موجود نہ تھا۔ وہ دونوں سائیکل رکشا پر بیٹھے اور اسے ڈھونڈنے نکلے۔ کسی نے بتایا کہ اقبال ہال میں آل سٹوڈنٹس ایکشن کمیٹی کا اجلاس ہو رہا ہے۔

وہاں پہنچے تو سٹوڈنٹس ایکشن کمیٹی کی گول میز کانفرنس تھی جس کی صدارت وہ کر رہا تھا۔ اجلاس کافی لمبا تھا۔ کچھ دیر انہوں نے اس کے ختم ہونے کا انتظار کیا اور آخر اکتا کر وہ بینو سے بولا...... ''ان کی فضول باتیں تو کبھی ختم ہی نہ ہوں گی، تم جاؤ اور کہو ہمیں کام ہے۔''

پر بینو نے کہا...... ''بھئی! اس وقت تو مجھے ان کے پاس جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ کہیں ڈانٹ ہی نہ بیٹھیں۔''

اور اس کے حوصلہ دلانے پر وہ ڈرتے ڈرتے اندر گیا۔ اس کے بالکل قریب پہنچ کر اس

نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

اس نے بھائی کو ایک نظر دیکھا۔ کچھ سوچا اور بولا...... ''میرا انتظار کرو۔''......اس نے باہر آ کر بتایا تو فخر کے چہرے پر بیزاری پھیل گئی...... ''بینو! تم نے کار کے لیے کہنا تھا۔''

''کہا تو تھا، اب میں کیا اس کی جیب سے چابی نکال لاتا؟''

خلافِ توقع میٹنگ جلد ہی ختم ہوگئی۔ اس کے دونوں بھائی جب کار میں بیٹھ چکے اور کار سڑک پر دوڑنے لگی۔ تب اس نے پوچھا...... ''کیا تکلیف بتاتی تھیں؟''...... بینو نے بتایا۔

کار رقیہ ہال کے گیٹ کے سامنے رکی۔ اس نے ملازم کو دروازہ کھولنے کے لیے کہا۔ شام سنہری تھی۔ دراز سیاہ گیسو یہاں وہاں بکھرے ہوئے تھے۔ چنبیلی ہال کی سیڑھیوں پر دس بارہ کا جمگھٹا خوش گپیوں میں محو تھا۔ کار زن سے گزری تو چند ایک نے جھلک دیکھی اور بولیں...... ''ارے! شلپی، شلپی''...... آفس کے سامنے جب وہ کار سے اترا تو کامن روم کے سامنے کھڑی لڑکیاں چہکیں...... ''شلپی، شلپی۔''

اور اس کے آفس داخل ہونے تک اس کی آمد کی خبر چنبیلی ہال، آنرز بلڈنگ اور مین بلڈنگ کے پانچویں تلے تک پہنچ چکی تھی۔

وہ جب مسز چودھری کے ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہوا تو بستر پر سمعیہ علی خاموشی سے لیٹی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ بینو اور فخر دونوں جھکے اور اسے پکارا۔ اس نے آنکھیں کھولیں، انہیں دیکھا، موٹے موٹے آنسو وہاں چمک گئے تھے۔

یہ تو بہت حوصلے والی لڑکی ہے۔ چاقو کھا کر بھی اس نے ایک قطرہ آنسو کا نہیں ٹپکایا تھا اور اب یہ رو رہی ہے۔ اصل میں ہوم سکنس کا شکار ہے اور بیماری میں تو انسان اور بھی حساس ہو جاتا ہے۔

اس نے ہمدردی سے یہ سب سوچا۔

نیچے اتر کر اس نے مسز چودھری کا شکریہ ادا کیا اور کار سٹارٹ کی۔

آڈیٹوریم میں کھڑی اس کی پارٹی کی چند لڑکیوں کو یہ سب بہت ناگوار گزرا...... ''دیکھو تو! کس شان سے اسے بٹھا کر لے گیا ہے۔''...... ایک دو نے جلے دل سے کہا۔

عظیم پور جانے کی بجائے اس نے کار کا رخ جناح ایونیو کی طرف موڑ دیا تھا۔ پچھلی سیٹ پر وہ، فخر اور بینو کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کے پپوٹے جل رہے تھے اور ناک کے نتھنوں سے آگ نکل رہی تھی جو اسے جلائے جا رہی تھی۔

ماں والے کمرے میں اسے لٹایا گیا۔ خوراک ہر دو گھنٹے بعد دینی تھی۔ وہ کچھ دیر وہاں بیٹھا اور پھر اٹھ گیا۔ بہت سے کام کرنا تھے۔ اسلامک اکیڈمی میں شام میں مجلسِ مذاکرہ منعقد ہونے والی تھی۔ جس میں اسے شامل ہونا تھا۔ پوربانی میں ''برگ'' سے آئے ہوئے اس کے چند جرمن دوست عشائیہ پر مدعو تھے۔ سٹوڈنٹس یونین کا ایک گروپ اس سے ساڑھے دس بجے ملاقات کر رہا تھا۔

اس نے دونوں بھائیوں کو رات بھر جاگنے اور مقررہ وقت پر دوائی دینے کی تاکید کی اور چلا گیا۔

رات ان دونوں نے باری باری جاگ کر گزاری۔ پہلے وقت میں بینو جاگا اور فخر سویا۔ دوسرے وقت میں فخر جاگا اور وہ سویا۔ بلبل تھا ہی نہیں۔ وہ کالج کی طرف سے مومن شاہی کیڈٹ کالج گیا ہوا تھا۔

صبح دس بجے اس نے آ کر دیکھا۔ ماں کے بستر پر وہ نڈھال سی پڑی تھی۔ بخار ابھی تک نہیں اترا تھا۔ اس کے سر میں شدید درد تھا۔ جس کی وجہ سے وہ کبھی کبھی کراہ دیتی۔

اس کی کلائی کو اس نے چھوا۔ اس کی بند آنکھیں کھلی نہیں، بس پپوٹے پھڑپھڑاتے رہے کیونکہ وہ اس کی آواز سن چکی تھی۔

''بخار ابھی تک نہیں اترا۔ تم لوگوں نے دوائی باقاعدگی سے دی؟''

''ہم تو ساری رات جاگتے رہے ہیں۔''...... بینو فوراً بولا۔

''زمان کو صبح اطلاع دینی تھی اور ہاں! ٹمپریچر کتنا ہے؟''......اس نے تیزی سے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔''

''کیوں؟''......اس نے تلخی سے کہا......''بہت مشکل کام تھا کیا؟ فخر کہاں ہے؟''

اور جب وہ فخر کو بلانے کے لیے گیا تو وہ غصے سے بڑبڑا رہا تھا۔ایک تو رات بھر ہم جاگ کر اپنے دیدے پھوڑتے رہے ہیں،اوپر سے ان نواب صاحب نے آ کر رعب ڈالنا شروع کر دیا ہے۔اتنی ہمدردی تھی تو رات یہاں رہنا تھا۔

اور فخر کمرے میں نہیں تھا۔خدا جانے کہاں گیا ہوا تھا۔اسے اور غصہ آیا۔

''یہ اور مصیبت ہے۔اب پل پل بعد وہ مجھ پر بگڑے گا۔وہ ہوتا تو کم از کم اس کے غصے کا آدھا بوجھ تو اٹھاتا۔دیکھو تو! ماں کی بھتیجی کو انہی دنوں مرنا تھا اور جو اسے مرنا تھا تو سومی آپا کو بھی ابھی بیمار ہونا تھا۔

وہ واپس کمرے میں آیا،اس نے تھرمامیٹر کیس سے نکالا اور اسے جھٹک کر پلنگ کے قریب آیا اور جب اس نے اسے منہ کھولنے کے لیے کہا تو اس نے اپنی سرخ تپتی آنکھیں ذرا کھولیں اور پھر بند کر لیں۔مگر اس کا منہ ویسے ہی بند رہا،جس پر بینو ذرا جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

پلیز سومی آپا! منہ کھولیے تا کہ میں آپ کا ٹمپریچر لے سکوں۔ وگرنہ وہ جو دوسرے کمرے میں ڈاکٹر کو فون کر رہا ہے، جب آ کر یہ دیکھے گا کہ میں نے ابھی تک یہ کام نہیں کیا تو میری جان کو آئے گا۔

اور وہ اتنے تیز بخار کے باوجود اس کی اس بات پر مسکرائی تھی اور اس نے اپنا منہ کھول دیا تھا۔

وہ درجہ حرارت دیکھ رہا تھا تو اوپر سے وہ بھی آ گیا۔تیزی سے اس نے تھرمامیٹر اس کے ہاتھ سے پکڑا۔پر اگلے لمحے وہ تشویش ناک انداز میں تھرمامیٹر کی بجائے اسے دیکھ رہا تھا جس کے تپتے گال آگ کی طرح سرخ تھے۔

شام تک وہ وہاں اس کے پاس ٹھہرا۔ اس تمام وقت میں اس نے کوئی پندرہ مرتبہ اس کا ٹمپریچر لیا، دس مرتبہ دونوں چھوٹے بھائیوں پر بگڑا، چار پانچ بار نوکر کو ڈانٹا اور دو بار اس پر بھی غصے ہوا جو چکن سوپ نہیں پی رہی تھی۔

اور شام کو جب وہ باہر گیا تو ان دونوں نے شکر کیا کہ مصیبت سے جان چھٹی۔ بینو چڑ کر بولا...... ''یوں تو لیڈری کا دعویٰ کرتے ہیں اور مزاج دیکھو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ باہر بڑی سے بڑی بات بھی شہد کی طرح پی جاتے ہیں اور گھر میں گھر والوں کا جینا حرام کر دیتے ہیں۔ اللہ جانے! شخصیت میں یہ ڈپلومیسی کیوں ہے؟''

اسی شام ماں گھر آ گئیں اور ان کے سر سے بھی تیمارداری کا بوجھ اُتر گیا۔

وہ بہت پیلی پڑ رہی تھی۔ چار پانچ دن کے بخار نے اسے بالکل اَدھ موا کر دیا تھا۔ ذرا سا چلتی تو ہانپنے لگتی اور ٹانگیں پھولنے لگتیں، اس کے چہرے کی زردی ماں کو بہت پریشان کیے ہوئے تھی۔ دن میں کئی بار وہ اسے اودلٹین دیتیں۔ کبھی کبھی تو وہ جھنجھلا جاتی اور کہتی ...... ''ماں! آپ نے میرے پیٹ کو کیا سمجھ لیا ہے، ابھی ابھی تو میں نے سوپ پیا ہے۔''

اس پر وہ محبت سے کہتیں ...... ''اپنی صورت کو نہیں دیکھتی ہو۔ کیسی زرد ہو رہی ہے۔ کھاؤ گی نہیں تو توانائی کیسے آئے گی؟''

آج صبح انہوں نے اس کے سر میں کچے ناریل کا تیل ڈال کر مالش کی تھی۔ ابھی وہ گرم پانی سے غسل کر کے برآمدے میں آئی تھی۔ اس کے تن پر پپنہ کی کریم رنگی ساڑھی تھی۔ ہم رنگ بلاؤز بہت چھوٹا تھا، خاصا پیٹ نظر آتا تھا۔ وہ ایسے بلاؤز نہیں پہنتی تھی مگر اسے ماں نے سیا تھا اور ماں کو لمبے لمبے بلاؤز سخت ناپسند تھے۔

اس نے ساڑھی کے پلو میں چنٹ ڈال کر اسے پیچھے پھینک دیا اور خود برآمدے میں چھاؤں کے رخ پر بیٹھ گئی۔

آج جہاں آرا، روشن اور آمینہ اسے دیکھنے آئی تھیں۔ کھانا کھا کر تھوڑی دیر پہلے وہ گئی تھیں۔
شام ہو رہی تھی۔ اندر کمرے میں ماں بینو پر خفا ہو رہی تھی کہ اس نے شبلی کا پاجامہ کاہے
کو پہن لیا ہے؟

''ماں! آپ کو اس کی چیزوں کا بہت خیال رہتا ہے۔ ہم سب تو آپ کے لیے بے کار ہیں۔ اب اگر میں نے اسے پہن ہی لیا تھا تو صبر کر لیتیں۔''...... اس کے لہجے میں شدید گلہ تھا۔

''تم انسانوں کی طرح پہنو تو ایک بات بھی ہے۔ دیکھو تو پائنچے کس قدر گندے کر لیے ہیں، پھر بولتی ہوں تو کہتے ہو۔''

سورج دھیرے دھیرے نیچے جا رہا تھا۔ سامنے کے فلیٹ میں مسز احمد تار پر ساڑھی پھیلا رہی تھیں۔ اس پر نظر پڑی تو طبیعت کا پوچھنے لگیں۔ اس نے بس سر کے اشارے سے بتایا کہ اچھی ہوں۔ یوں اس کی نظر اپنے ہاتھوں پر پڑی، وہ بہت زرد ہو رہے تھے۔ ناخن سفید تھے۔ پاؤں کا بھی کچھ یہی حال تھا۔

''اللہ! کیسے عجیب لگ رہے ہیں۔ مانو جیسے اندر خون کا ایک قطرہ بھی نہ ہو۔''

اسے وحشت ہوئی، گھبرا کر وہ اٹھی تا کہ اندر سے ماں کی کیوٹکس لا کر ناخنوں پر لگائے۔...... 'شائد یہی وجہ ہے کہ ماں کو میری زردی بہت کھٹکتی ہے۔'...... اس نے سوچا۔
بینو دھوتی پہن کر پاجامہ الگنی پر لٹکا رہا تھا۔ جب اس نے پوچھا...... ''کیا ہوا بھئی؟''
اور وہ تنک کر بولا...... ''ہونا کیا ہے؟ ماں کو اختلاج ہونے لگا ہے۔ اک ذرا یہ پاجامہ پہن لیا تھا نا۔''

وہ کیوٹکس کی شیشی اٹھا کر باہر آ گئی۔ ناخنوں پر ہلکا پھلکا کوٹ پھیرتے ہوئے وہ مسکرا رہی تھی۔ اس گھر میں بھی ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں۔ مجھے تو اندازہ ہی نہ تھا کہ وہ شبلی اس درجہ متلون مزاج بھی ہو سکتا ہے۔ شامتِ اعمال سے جو کہیں اسے میری ایک دو دن مزید تیمارداری کرنی پڑ جاتی تو جانے اپنے بھائیوں کے ساتھ ساتھ وہ میرا بھی کیا حال کرتا۔ کیسے بگڑا

تھا اس دن، اللہ توبہ! اسے ہنسی آ گئی۔

فخر اس کے لیے چنگوا سے چکن سوپ لایا تھا۔ جب وہ اسے پلانے لگا تو وہ کہیں کہہ بیٹھی۔ ''جی نہیں چاہتا۔'' اس پر وہ تیز آواز میں بولا تھا...... ''تمہارا جی بہت سی چیزوں کو نہیں چاہے گا۔ پر وہ سب تمہیں کھانی پڑیں گی، چلو اسے پیو۔''

اور پھر یوں ہوا کہ سوپ کا پورا پیالہ اسے پلا دیا گیا۔ اس نے نہ نہ کی بھی، پر اس کا کچھ فائدہ نہ ہوا۔ سوپ کو اندر گئے ابھی دو منٹ بھی نہ ہوئے تھے کہ وہ باہر آ گیا۔ یوں کہ وہ جو چوک کے بالکل پاس بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا، اس کا سفید پاجامہ بھرا اور جب اس نے اسے سر سے پکڑا تو اس کا ہاتھ بھی اس میں نہایا تھا۔

اس کی آواز پر خادمہ تولیہ اور پانی لے آئی۔ فرش بھر گیا تھا۔

اور جب اس کے اندر سے مزید کچھ آنے کی امید نہ رہی تو اس نے اسے کلی کروائی اور اس کا منہ تولیے سے صاف کیا۔

وہ بہت شرمندہ ہو رہی تھی پر اسے سکون ملا جب اس نے یہ دیکھا کہ اس کے چہرے پر کراہت یا بیزاری کا ہلکا سا شائبہ تک بھی نہیں ہے۔ وہ اسے لٹا کر خود شائد کپڑے بدلنے چلا گیا تھا۔

جب خادمہ فرش صاف کر رہی تھی، فخر نے آ کر دیکھا اور غصے سے بولا ''مجال ہے جو کسی کی بات سن لیں۔ ٹھونس کر پلانے کا نتیجہ دیکھ لیا اور جو کسی اور سے ایسا ہو جاتا تو پھر اس کی گت بنتے دیکھنی تھی۔''

شفاف آسمان پرندوں سے بھر گیا تھا۔ فلیٹوں کی چمنیوں سے دھواں فضا میں اٹھنا شروع ہو گیا تھا۔ مچھلی کی باس سارے میں پھیل گئی۔

اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ گلابی رنگ کے عکس نے ان کی زردی کو کچھ کم کر دیا تھا۔

اچانک اس نے اپنے کان کھڑے کیے۔ وہ پچھلے برآمدے میں ماں سے باتیں کر رہا تھا...... ''تو یہ بھیرب بازار سے آ گیا ہے۔''

پھر وہ ماں کے ساتھ اس کے پاس آیا۔ وہ ساڑھی کا آنچل شانوں پر لپیٹے، پاؤں بانس کی چھوٹی تپائی پر رکھے تھکی بیٹھی تھی۔ اس نے بغور اسے دیکھ کر ماں سے کہا تھا...... ''یہ بہت کمزور اور زرد ہو رہی ہے۔ کیا دوائی نہیں لے رہی ہے؟''

ماں کے جواب میں وہ بولا تھا...... ''اچھا آج میں اسے لے کر زمان کے پاس جاؤں گا۔'' چائے وہیں آ گئی تھی۔ عین اسی وقت آلو بخاروں اور خوبانیوں کی دو پیٹیاں نوکر نیچے سے لایا جو سمعیہ علی کے بھائی نے ان کے لیے اپنے کسی ملنے والے کے ہاتھ بھجوائی تھیں۔

''بھئی! لاہور والے بہت زیادتی کرتے ہیں۔''...... اس نے کہا اور نوکر سے پوچھا کہ...... ''انہیں کون لایا ہے؟''

اس نے بتایا کہ کوئی جیپ والے صاحب تھے جو مجھے دے کر خود چلے گئے ہیں، ویسے وہ پہلے بھی آ چکے ہیں۔

''ارے تو جانے کیوں دیا؟ عجیب احمق ہو تم۔''...... ماں نے غصے سے کہا۔

''شلپی! تم لاہور خط لکھو کہ وہ ایسی تکلیف نہ کیا کریں۔''

''پھر کیا ہوا ماں! آپ تو یونہی تکلف کرتی ہیں۔''...... وہ بولی۔

''نہیں بیٹی! یہ تو سراسر تکلیف ہے۔''

باہر اندھیرا چھا گیا تو ماں نے آ کر اس سے کہا...... ''بیٹے! تم تیار ہو جاتیں، شلپی تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہتا ہے۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے ماں! میں تو اب بالکل ٹھیک ہوں۔ بس ذرا سی کمزوری ہے، رفتہ رفتہ وہ بھی ٹھیک ہو جائے گی۔''

''نہیں بیٹی! تفصیلی معائنہ ہو جائے گا۔''

''چھوڑیے ماں!''...... وہ الجھی۔

''ارے چھوڑوں کیا لڑکی۔ ڈاکٹر اچھی طرح دیکھ بھال کر دوائیں لکھ دے گا، چلو اٹھو۔''

اور جب وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تو اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

ڈاکٹر زمان اسے دیکھ کر مسکرایا اور بولا...... ''کتنے دن اور دوائیں کھانا چاہتی ہیں؟''

پھر گاڑی جناح ایونیو کے ایک میڈیکل سٹور کے سامنے رکی اور وہ نسخہ لے کر باہر نکلا تو اس نے سوچا...... ''اب تو یہ ان لوگوں پر صریحاً زیادتی ہے۔''

اپنے ہاتھ میں پکڑا دواؤں کا خاصا بڑا پیکٹ اس نے بیک سیٹ پر رکھا اور گاڑی سٹارٹ کی تو وہ بولی...... ''آپ مجھے بہت زیر بار کر رہے ہیں۔ دواؤں کا بل مجھے دے دیجیے۔''

اس نے دیکھا وہ اس کی بات پر زیر لب مسکرایا۔ باہر دیکھتے اور گاڑی کو موڑتے اس نے کہا تھا ''گھبراؤ نہیں، جب تم ہال جاؤ گی تو بل تمہیں پہنچ جائے گا۔''

اور جب وہ ڈھاکا ریس کورس روڈ کو پیچھے چھوڑ کر نیو کیمپس کی سڑک پر آ گئے جس کے ایک طرف نیو مارکیٹ اور دوسری جانب عظیم پور سٹیٹ تھی۔ اس نے قدرے چونک کر دیکھا، گاڑی گھر جانے کی بجائے نیو مارکیٹ کی طرف مڑ گئی تھی۔ پھر گرین روڈ سے ہوتی ہوئی اب سیکنڈ کیپٹل کی شفاف و فراخ سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

رات تاریک تھی۔ آسمان پر ستارے جھلملا رہے تھے۔ بوتل گرین ٹیوٹا کو ڈرائیو کرتا وہ اور قریب بیٹھی سمعیہ علی جو کھڑکی سے آتی ٹھنڈی خوشگوار فضا سے لطف اٹھاتے ہوئے باہر دیکھ رہی تھی۔

گاڑی سیکنڈ کیپٹل کی جھیل کے سامنے رک گئی۔

وہ لطف ضرور اٹھا رہی تھی پر اس کے دل میں جذبات کا مدوجزر بھی تھا۔ اس نے سٹیئرنگ سے ہاتھ اٹھا لیے تھے۔ پشت اپنی جانب کے دروازے سے لگاتے ہوئے وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

اس کا دل دھک کر اٹھا۔ خاموشی ٹوٹی، اس نے کہا تھا...... ''کیا تم مجھے وہ پنجابی گیت سناؤ گی جو تم نے باریسال ماں کو سنایا تھا۔''

''گڈ گاڈ! تو اس نے وہ گیت سنا تھا اور اسے پسند بھی کیا تھا۔''......اسے عجیب سی خوشی کا احساس ہوا۔

دیر تک اس سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔ یہاں کار میں اور باہر مکمل خاموشی تھی۔ سیکنڈ کیپیٹل کی عجیب وغریب طرز تعمیر کی ارغوانی عمارتوں میں کہیں کہیں برقی قمقمے ٹمٹماتے تھے۔ جھیل پر اندھیرا چھایا تھا۔ کسی مینڈک کے ٹرانے کی آواز بھی اس سکوت کو نہیں توڑتی تھی۔ اوپر گہرے سیاہ آسمان پر جگنو کی طرح چمکتے ستارے اچھے لگ رہے تھے۔ رات بہرحال خوبصورت تھی۔

اس کا دل دھڑک رہا تھا اور یہ دھڑکن اتنی تیز تھی کہ وہ بھی اس کی آواز بخوبی سن رہا تھا جو اس سے قدرے فاصلے پر اطمینان سے ٹانگیں پھیلائے بیٹھا، اسے ہلکے ہلکے اندھیرے میں دیکھ رہا تھا۔ اور جب اس نے یہ کہا......''میں حیران ہوں آپ پنجابی گیت سننا چاہتے ہیں۔''

تو اسے بذات خود یہ محسوس ہوا تھا کہ اس کی آواز بدلی ہوئی ہے اور اس میں اعتماد اور یقین نہیں ہے۔

''حیران کیوں ہو تم؟''......وہ خوشدلی سے ہنسا۔ ''فن اور فنکار تو سبھوں کے مشترک ہوتے ہیں۔''

''سبھوں کے ہو سکتے ہیں مگر آپ لوگوں کے نہیں جنہیں بنگلہ قومیت کا ہوکا ہے۔''

اور اس نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ نشست سیدھی کرتے ہوئے چابی گھمائی اور گاڑی چلادی۔ تب اس نے سوچا......''یہ میں نے کچھ اچھا نہیں کیا۔ یہ تو میرا محسن ہے۔ اس کے مجھ پر بہت سے احسان ہیں۔ اس بھرے پُرے ڈھاکا میں اس کا گھر میرے لیے سکون و عافیت کی سب سے بڑی جگہ ہے۔ یہ میں نے کیا کیا؟ یوں ضدیں اور تناؤ مصلحتوں کے دروازے بند کر دیتے ہیں۔''

اس نے رُخ پھیرا اور اسے دیکھا۔ یہاں خاصی روشنی تھی اور اس کا چہرہ بخوبی نظر آتا تھا۔

کینے منگی گھوڑی کینے منگائی کون سوداگر لیایا

شلپی منگی گھوڑی بابا منگائی چاچا سوداگر لیایا

بنوں تاں تیری آں بڑی رعنا

وڈھیاں بھائیاں! دی بھیناں

بنوں تاں تیری آں وڈی گوتی

وڈے دادے دی پوتی

نک چمک دے موتی

(شادی کے لیے گھوڑی کس نے مانگی اور کس نے منگائی ہے اور کون سوداگر لایا ہے۔ شلپی نے گھوڑی مانگی۔ بابا نے منگائی اور چاچا سوداگر لایا ہے۔ تیری دلہن بہت خوبصورت ہے۔ بڑے بھائیوں کی بہن ہے۔ اس کا تعلق اونچی ذات سے ہے اور وہ بڑے دادے کی پوتی ہے اس کی ناک میں موتی چمکتے ہیں۔)

وہ گا رہی تھی۔ گاڑی کی رفتار کم ہوتے ہوتے گلشن کی اس ویران سڑک پر ختم ہوگئی تھی۔ وہ بازوؤں پر سر رکھے گیت سن رہا تھا۔

''تمہاری آواز خوبصورت ہے، اس میں سوز ہے۔'' گانا ختم ہونے کے خاصی دیر بعد اس نے کہا۔

اس نے نذرالاسلام کا بنگلہ گیت بھی گایا۔

بنانی اور گلشن کا چکر کاٹ کر اب وہ ڈھاکا کنٹونمنٹ میں آ گئے۔

پارک کے سامنے گاڑی روک کر اس نے اسے تھوڑی دیر وہاں گھومنے کے لیے کہا۔

وہ اترنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے میجر آغا اور کرنل قریشی کا ڈر تھا۔ پر اس نے اس خوف کا اظہار کرنا مناسب نہ سمجھا اور ساڑھی کا پلو ٹھیک کرتی باہر آ گئی۔

پارک خوب لمبا چوڑا تھا۔ ٹیوبوں کی روشنی میں ہری بھری گھاس، بیلے اور گلاب کے پھول اچھے لگ رہے تھے۔ بچے سی ساپر اچھل کود رہے تھے۔ ان کی مائیں بینچوں پر بیٹھی خوش

گپیوں میں مگن تھیں۔ وہ نسبتاً ویران حصے کی طرف بڑھ گیا۔

اتنا سا چل کر ہی وہ تھک گئی تھی اور جب وہ گھاس پر چکر کاٹ رہا تھا، وہ بینچ پر بیٹھی اسے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ ماں کیا کہتی ہوں گی۔ میرا معائنہ ہی ابھی تک مکمل نہیں ہوا۔

''آؤ نا! تھوڑا سا تم بھی چلو۔'' ......وہ اس کے قریب آ گیا۔

''میں تھک گئی ہوں، یوں بھی یہاں مچھر بہت زیادہ ہیں۔''

اس کے اصرار کرنے پر اس نے صرف دو چکر کاٹے اور واپس اسی جگہ آ کر بیٹھ گئی۔

مچھروں نے کاٹ کاٹ بے حال کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بھی آ گیا۔ اس کے بالکل قریب بیٹھا تو اسے اپنے جسم میں شدید سنسناہٹ کا احساس ہوا۔ کافی دیر خاموشی رہی۔ تب اس نے گھمبیر آواز میں کہا!

''سمعیہ! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

وہ چونکی۔

اس نے پہلی مرتبہ اس کا نام لیا تھا۔

''کہیے!'' ......وہ اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

''میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''مجھ سے شادی؟'' ......اس نے پاگلوں کی طرح بوکھلا کر دہرایا۔ یہ بات بالکل ایسی ہی تھی جیسے کوئی اس سے یہ کہے کہ آج سورج مشرق کی بجائے مغرب سے نکلا تھا۔ کیسی انہونی بات اس نے کہہ دی تھی۔ ناقابل اعتبار، ناقابل یقین۔ کچھ عرصے سے وہ یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ وہ اسے پسندیدہ نظروں سے دیکھنے لگا ہے۔ پر وہ یہ تو کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ وہ جو بنگلہ قومیت کا پرستار ہے، عمر بھر کے بندھن کے لیے درخواست کرے گا بھی تو اس سے جو بنگالی نژاد نہیں۔

اس نے ایک ٹک اپنے سامنے اُگی گھاس کو دیکھا۔ اس کا دھک دھک کرتا دل سکون پذیر ہوا کیونکہ اس کی آنکھوں نے سڑکوں، بازاروں اور گلیوں میں اپنی قوم کا بے گناہ خون بہتا

دیکھ لیا تھا۔ تب وہ جذبات سے عاری آواز میں بولی!

''آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں جس کا تعلق پنجاب سے ہے اور پنجاب جس سے آپ کو نفرت ہے۔''

''تمہارا تعلق اس ملک کے جس حصے سے بھی ہے، اور تم خواہ کسی نسل سے بھی ہو، مَیں نے تمہیں پسند کیا ہے اور تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنانا چاہا ہے۔''

''یہ ممکن نہیں اجتبیٰ الرحمٰن! آپ کے اور میرے درمیان ذہنی اختلافات ہیں۔ آپ کی اور میری راہیں جدا ہیں۔ مجھے افسوس ہے!''

وہ اٹھ گئی اور اس کے ساتھ ہی وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ ساتھ ساتھ چلتے وہ کار تک آئے۔ اس نے اندر بیٹھ کر اس کے لیے دروازہ کھولا۔

گاڑی گھر کے سامنے رکی۔ وہ اتری۔ اس نے ابھی ایک قدم ہی اٹھایا ہو گا جب اس نے پکارا۔

''سمعیہ! یہ اپنی دوائیں لے جاؤ۔''

وہ مڑی۔ کار کی جلتی روشنی میں اس نے اس کے چہرے کو دیکھنے کی ہمت نہ کی۔ بس آنکھوں کو بے مقصد اِدھر اُدھر گردش دیتے ہوئے بولی...... ''یہ میں نہیں لوں گی۔''

''تم کچھ بے وقوف بھی ہو۔''...... وہ اسی پرانے لہجے میں بولا...... ''اسے پکڑو، بیگانوں جیسی باتیں نہیں کرتے۔''

اس کی اس بات پر اس کا ضبط جواب دے گیا۔ آنسو اس کے خساروں پر بہہ نکلے اور وہ رندھی آواز میں بولی۔...... ''آپ تو زخموں پر نمک پاشی کرتے ہیں۔ بیگانے تو آپ بن رہے ہیں۔ اجنبیت کی دیواریں تو آپ کھڑی کر رہے ہیں، خلوص کو نفرت میں آپ بدل رہے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ آؤ ہم تم ایک ہو جائیں۔ ہم تم ایک ہو بھی گئے تو اس سے کیا فرق پڑے گا؟ جو آگ لگ گئی ہے اسے کون بجھائے گا؟ آپ لوگوں نے تو زمین کو ایک خاص قوم اور نسل کے لیے

مخصوص کردینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔اس میں میرے لیے گنجائش کہاں ہے۔''

وہ آنسو بہاتی اندر کی طرف چلی گئی۔دوسرے فلیٹ کے عین درمیان سیڑھیوں پر بیٹھ کر وہ روتی رہی۔گھٹی گھٹی سسکیاں لیتی رہی۔دل کا درد باہر نکالتی رہی، آنسوؤں سے بھری آنکھیں اٹھا کر کبھی کبھی اوپر نیچے بھی دیکھ لیتی کہ کوئی آ تو نہیں رہا ہے۔اور جب وہ کھل کر رو چکی تو اس نے اپنی آنکھوں کو صاف کیا اور اوپر چڑھنے لگی۔ پر اتنا رو چکنے کے بعد بھی اس کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔

اسے تو یہی سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ جسے اپنی قوم اور زبان کی اتنی ممتا ہے، کیسے اسے پروپوز کر بیٹھا ہے جو بنگالی نژاد نہیں۔کیا میری خوبصورتی نے اسے اپیل کیا ہے؟ وہ خود سے پوچھتی۔پر جب وہ غور کرتی تو کہتی۔......''لو! میں کہاں کی ہیلن آف ٹرائے ہوں جو وہ مجھ پر مرمٹا ہے۔اس کی تو اپنی پارٹی میں کئی لڑکیاں بے حد دلکش ہیں جو سو جان سے اس پر فدا بھی ہیں۔''

تب وہ سوچتی، کہیں اس نے مذاق نہ کیا ہو اور یہ خیال اس کی آنکھیں پتھرا دیتا۔ذہن سے چنگاریاں پھوٹتیں۔اس کا دل ڈوب ڈوب جاتا۔وہ کرسی سے اٹھ کر اوندھے منہ بستر پر لیٹ جاتی۔اول دن سے آخر تک اس کا برتاؤ یاد کرتی۔ایک ایک حرکت کا سوچتی اور پھر اپنے آپ سے کہتی۔......''اس نے میرے ساتھ قطعی مذاق نہیں کیا، وہ اپنی اس خواہش کے لیے بہت سنجیدہ ہے اور یہ خیال اس کے لیے وجہ سکون بنتا۔

یوں اس نئے حادثے نے اسے ذہنی طور پر بالکل مفلوج کر دیا تھا۔ہوش وحواس کے خانے کو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دیمک چاٹ گئی ہو۔شام میں جب اس کی روم میٹ لڑکیاں کھانا کھانے کے لیے نیچے چلی جاتیں۔کمرہ خالی ہو جاتا تو ساری بتیاں گل کر کے وہ انہی سوچوں میں ڈوبی رہتی۔جب وہ اوپر آتیں، اور ان کے بٹن دبانے سے گاڑھے اندھیرے میں ڈوبا کمرہ جگمگا اٹھتا، تو وہ حیرت سے اسے دیکھتیں جس کی آنکھیں ایکا ایکی روشنی ہو جانے سے الوؤں کی طرح جھپکنے لگتیں۔تب نیلا کہتی......''سومی! کیا بات ہے۔تم کھانا کھانے نہیں

گئیں؟ تمہارا شریر کیسا ہے؟''

ساتھ ہی وہ اس پر جھک جاتی۔ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتی، کلائی چھوتی۔

''بخار تو نہیں ہے پر تم اتنی ڈھیلی کیوں ہو رہی ہو۔ کیا تکلیف ہے تمہیں؟''

اور وہ کہتی...... ''کچھ بھی نہیں۔ بس یونہی ہر سمے لیٹے رہنے کو جی چاہتا ہے۔''

''تو ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں جاتی ہو؟''

روشنی میں کچھ دیر وہ ساکت لیٹی رہتی۔ اپنی روم میٹز کو دیکھتی جو کمرے میں ایک آدھ چکر کاٹنے کے بعد اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ کر ٹیبل لیمپ جلاتیں اور پڑھنے میں جت جاتیں۔

تب جانے کیا ہوتا، وہ بے چین ہو کر اٹھتی۔ اس کا دل اندر ہی اندر کٹتا۔ سر گھومتا۔ ہڑبڑا کر وہ باہر نکلتی۔ کوریڈور کی ٹھنڈی دیوار پر اپنا رخسار رکھتی۔ تڑپ کر سر پھر اٹھا لیتی۔......

'تیرا بیڑا غرق ہو! کس عذاب میں تو نے مجھے پھنسا دیا ہے۔'...... ایسے میں جہاں آرا اور روشن پر بھی سخت غصہ آتا۔ یونیورسٹی ہنگاموں کی وجہ سے بند تھی اور وہ دونوں گھروں کو لوٹ گئی تھیں۔...... 'کم بختیں! انہیں بھی اپنے گھروں میں انہی دنوں مرنا تھا۔ اب کیسے مزے سے اپنی ماؤں کے گھٹنوں سے لگی بیٹھی ہوں گی اور چٹ پٹے کھانے کھاتیں اور بہن بھائیوں سے گپیں لڑاتی ہوں گی۔ ایک یہاں مَیں ہوں جو اس مصیبت میں پھنسی مر رہی ہوں۔ اب اگر وہ ہوتیں تو پریشانیوں اور الجھنوں کا یہ غبار جو میرے سینے پر یوں چڑھ دوڑا ہے، اس کے کیتھارسس سے میری جان تو ہلکی ہو جاتی۔'

دل بیٹھا جاتا تو وہ سوچتی...... 'اے اللہ! اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ کاہے کو ڈوبتا ہے؟'

تب اسے بھوک کا احساس ہوتا۔ انہی قدموں سے وہ نیچے کے لیے چل دیتی۔ لفٹ کا بٹن دبا کر اس کے آنے کا انتظار کرتی، پھر نیچے آتی جہاں سنسان برآمدوں اور ویران راہداریوں سے اسے خوف سا محسوس ہوتا۔

ڈائننگ روم بھائیں بھائیں کر رہا ہوتا، وہ کچن کی طرف جاتی جہاں دادی لوگ زمین پر

اپنی اپنی چٹائیاں بچھائے سونے کی تیاریاں کر رہی ہوتیں۔ وہ انہیں آواز دیتی تو آگے سے سنتی۔...... ''آپا! تاڑا تاڑی (جلدی جلدی) بھات کیوں نہیں کھاتی ہو؟''

اسے انہیں تکلیف دینے پر افسوس بھی ہوتا۔ پر جب وہ چپکی کھڑی رہتی تو سید پور کی اس دادی کی ممتا ایک دم ہی اُبل پڑتی۔ وہ اسے پکارتی اور پھر اسے بالکل اپنے پاس بٹھا کر بھات، نرامیش اور ماچھ دیتی۔ بھات ٹھنڈا ہوتا، مچھلی ٹھنڈی ہوتی اور نرامیش بھی۔ وہ تھوڑا کھاتی، مسور کی دال پیتی۔ دادی، دوسری دادی سے کہتی۔...... ''گھر سے دور ہے، ماں یاد آتی ہوگی؟''

اور وہ خود سے کہتی!...... ''ماں تو مجھے کیا یاد آنی ہے۔ مجھے تو اب وہ بھی کم یاد آتا ہے جسے میں اگر دن میں دو تین بار نہ دیکھ پاتی تو میرا جی پریشان رہتا تھا۔ اس کم بخت مارے عشق اور پارٹی بازی نے مجھے ہر شے سے بیگانہ کر دیا ہے۔''

اب ایسے میں اسے آسی کی آمد کتنی غنیمت معلوم ہوئی۔ اوکاڑہ کا آسی جو ایجوکیشنل ایڈمنسٹریشن میں ڈاکٹریٹ کر رہا تھا، نے آکر جب اسے یہ بتایا کہ ویسٹ پاکستانی طلبہ کا ایک گروہ سلہٹ ٹی گارڈن جا رہا ہے اور کیا وہ اس میں شامل ہونا پسند کرے گی؟ تو اس نے فوراً آمادگی ظاہر کر دی اور جب وہ شام کو 75 روپے فی کس کے حساب سے فیاض حسین رضوی کے پاس چندہ جمع کروا کے آئی تو سوچ رہی تھی۔

''یہ اچھا ہوا، بہت ممکن ہے کہ میرا دماغ جوان دنوں آؤٹ ہے، ٹھیک ہی ہو جائے۔''

اور دو دنوں بعد ایک صبح ساڑھے سات بجے وہ اپنے چھوٹے سے اٹیچی کیس کے ساتھ سائیکل رکشا میں کملا پور ریلوے سٹیشن پہنچی تو اس نے دیکھا کہ جانے والے گروہ میں تین لڑکیاں اور سات لڑکے تھے۔ دو لڑکیاں میڈیکل کالج اور ایک ہوم سائنس کالج کی۔

چھوٹی پٹڑی پر کھڑی چھوٹے ڈبے کی گاڑی میں بیٹھ کر اس نے آسودگی محسوس کی اور باہر جھانکا۔ ریڑھیوں پر کیلے اور انناس بک رہے تھے۔ کم عمر لڑکے پلاسٹک کے لفافوں میں مونگ پھلی بیچتے ہوئے صدائیں لگا رہے تھے، بادام، بادام۔ نیلے اور سرخ کناروں والی سفید

ساڑھیوں میں دو عورتیں، پلو کو سر پر سنوارتیں گاڑی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ان کے آگے پیچھے درجن بھر بچے تھے۔ ایک نو عمر پالش کرنے والے نے اس کی طرف دیکھا اور کہا!

''جوتا پالش کروائیے گا؟'' ...... اس نے پاؤں پر نظر ڈالی جہاں نازک فیتے والی چپل تھی۔

''نہیں بھئی!'' ...... اس نے افسردگی سے کہا۔

لڑکا آگے بڑھ گیا۔

چیونگم بک رہے تھے۔ بے بی بسکٹوں والے شور مچا رہے تھے۔ ماتھے پر بڑا سا ٹیکا لگائے اور مانگ میں سیندور بھرے ایک ہندو عورت، دوسری گاڑی کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔

گاڑی چل پڑی تھی۔ کملا پور کا اونچے اونچے محرابوں والا ریلوے اسٹیشن، اب نظروں سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ ہریالی اور سبزہ آنکھوں کو بہت بھلا لگ رہا تھا۔

گاڑی بھاگتی رہی، مختلف اسٹیشن آتے رہے۔ ٹین کی چھتوں والے اسٹیشن، جن کے برآمدوں میں لمبی لمبی داڑھیوں والے بوڑھے، چارخانی دھوتیاں پہنے، ٹوٹی پھوٹی بینچوں پر بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے گھونگھٹ کاڑھے سروں پر گٹھڑیاں اور گودیوں میں بچے اٹھائے عورتیں، گاڑی میں سوار ہونے کے لیے ایک دوسرے سے لڑتی تھیں۔

فقیروں کا ایک جمِ غفیر ہاتھ پھیلائے ڈبوں کے آگے اللہ بھات دے، ٹکا دے کی صدا لگاتا گزرا۔ وہ کہنیاں اندر کھڑکی کے پٹ پر رکھے، مسلسل باہر دیکھ رہی تھی جب نورین نے اسے جھنجھوڑا۔ وہ چونکی اور اپنے خیالات میں ڈوبی باہر نکلی۔ فہمیدہ نے کہا! ...... ''سنو! یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟''

فیاض نے پنجابی گیت کی فرمائش کی تھی۔ اس کے دل پر دفعتاً چوٹ سی لگی۔ شبلی اسے اسی شدت سے یاد آیا جس شدت سے وہ اسے، بھولنے کی کوشش میں مصروف تھی۔

''تو ہو جائے پھر، ایک چٹ پٹا سا گیت۔'' ...... مصطفےٰ نے تالی بجائی۔

اس کا دل گھبرانے لگا تھا۔ ...... ''بھئی! مجھے گیت نہیں آتے، آپ ان سے سنیں۔'' ......

اس نے فہمیدہ کی طرف اشارہ کیا۔

''میں کیا میراثن ہوں؟''......اس نے اپنی منی سی ناک چڑھائی۔

''تم نہیں، تو کیا میں ہوں؟''......اس نے اس کی بات سن کر قدرے تلخی سے کہا اور ٹھنڈی ہوا میں، زور سے سانس کھینچا۔

اناس اور کیلوں کے جھنڈ گزر رہے تھے۔ درختوں میں گھری باشائیں، بیلوں سے ڈھنپی نظر آتی تھیں۔ پوکھروں میں کہیں کہیں مرد اور بچے نہا رہے تھے۔ زمین بیشتر خالی پڑی تھی۔ امان کی فصل کاٹی جا چکی تھی، کہیں کہیں کسان کام کر رہا تھا، شاید بورو کا اہتمام کیا جا رہا تھا یا اوس کی فصل بیجی جا رہی تھی۔

ساڑھے گیارہ بجے، جب انہوں نے کھانا کھانا چاہا تو معلوم ہوا کہ ہلشاہ ماچھ کے سوا ،کوئی دوسری چیز نہیں ملے گی۔

برہمن باڑیہ کے اسٹیشن پر، وہ سب اتر پڑے۔ سورماٹی گارڈن کے جنرل منیجر کا سیکرٹری، اپنے دو خادموں کے ساتھ پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ آسی اسے پہچان گیا تھا، یوں ان کے ٹکٹ سری منگل تک کٹے ہوئے تھے اور میڈیکل کی نک چڑھی فہمیدہ کو، آسی پر غصہ آ رہا تھا۔

''لو! جب برہمن باڑیہ اترنا تھا تو سری منگل کے ٹکٹ کاہے کو لینے تھے، مفت میں پیسے ضائع کیے۔''

اور پلیٹ فارم کے چوبی بینچ پر بیٹھے، اس نے تیسری مرتبہ اس کی زبان سے یہی بات سنی تو تلملا کر بولی......''اے بی! کاہے کو اتنا چلا چلی کر رہی ہو؟ دس بارہ آنے ضائع ہو گئے تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑی؟''

''ان کی سنو! فی کس بارہ آنے کا ضیاع، ان کے نزدیک کوئی بات ہی نہیں۔''......اس نے ناک چڑھایا۔

اسے تو آسی غریب پر ترس آ رہا تھا۔ اتنا سویٹ اور گڈو آسی، جواب اتنا چپ

چاپ کھڑا تھا۔

جیپ چیک اپ ہونے کے لیے گئی تھی، دو گھنٹے بعد جب آئی تو وہ اس میں لد گئے۔ شہر میں سے گزرتے ہوئے اس کی نظر اچانک ہی میجر طفیل شہید (نشان حیدر) کی یادگار پر پڑی۔ آسی سے اس نے فوراً کہا...... ''ذرا جیپ تو رکواؤ، میموریل دیکھتے ہیں۔''

یہاں سائیکل رکشے والے گزر رہے تھے، لڑکے بالے شور مچا رہے تھے۔ راہگیروں نے چلتے چلتے، انہیں رک کر دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

اس نے ناریل کے درختوں کو دیکھا۔ دو منزلہ مکانوں پر ایک نظر ڈالی اور جب وہ کتبے کو پڑھ رہی تھی، اس کے دل کی گہرائیوں سے صدا اٹھی۔...... ''تیری عظمت کو میرا اسلام! جس مقصد کے لیے تو نے اپنی جان قربان کی، خدا کرے کہ اس پر کبھی آنچ نہ آئے اور تیری یہ یادگار یونہی قائم رہے۔ (آمین)''

اس کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے تھے جنہیں اس نے رخ پھیر کر، ہاتھوں کی پوروں سے صاف کیا تھا۔

اسے شبلی یاد آیا اور اس کے ساتھ ہی میجر طفیل۔ حب الوطنی، غداری، نفرت، محبت کے یہ سارے جذبات، عجیب طرح گڈمڈ ہو گئے تھے۔

وہ خاموشی سے سرمائی گارڈن کے چائے کے پودوں اور ان میں کام کرتی عورتوں کو دیکھتی رہی اور اس وقت ہوش میں آئی جب جیپ سرسبز پہاڑی پر ایستادہ، خوبصورت بنگلے کی برساتی میں رکی، جہاں ٹی گارڈن کا جنرل منیجر برآمدے کی سیڑھیوں سے نیچے، انہیں خوش آمدید کہنے کو تیار کھڑا تھا۔ بلند و بالا قامت پر، موٹی موٹی آنکھوں والا یہ معمر آدمی، نواب سر سلیم اللہ کا حقیقی بھانجا تھا۔

ڈائننگ ہال کی وسعت اور شان و شوکت دیکھ کر تو وہ دنگ رہ گئی تھی۔ بس یوں لگتا تھا جیسے ابھی راجے مہاراجے، اپنے کروفر کے ساتھ آ کر اِن کرسیوں پر بیٹھ جائیں گے۔

اسے تو اپنا آپ اس کمرے میں، اس کرسی پر اور اپنے سامنے دھرے کھانے کے برتنوں کے ساتھ، بہت اجنبی محسوس ہو رہا تھا۔

اور جب یہ تکلیف دہ مرحلہ ختم ہوا، تو وہ آرام کے لیے کمرے میں جانے کی بجائے، برآمدے میں آ گئی۔

تاحدِ نظر پھیلی اونچی نیچی سرسبز پہاڑیوں پر اگے، چائے کے بوٹوں سے مالا مال ماحول، کس قدر خوبصورت اور رومانی نظر آ رہا تھا۔ یہ منظر اس کی آنکھوں میں جذب ہو رہا تھا۔ آسمان ہلکا ہلکا ابر آلود تھا۔ پھر وہ جیپ میں لدے اور سیر کے لیے نکلے۔ اور جب وہ پودوں کے بیچوں بیچ تصاویر بنوا رہے تھے، میزبان نے اسے بتایا کہ وہ جہاں کھڑی ہے، اس برجی کے پار ہندوستان کی سرزمین ہے۔ کیسی مزے کی بات ہے! اس نے سوچا اور اپنی دونوں ٹانگوں کے درمیان برجی کو حصار میں لیتے ہوئے، اس نے اپنے آپ سے کہا کہ اب میرا وجود انڈیا اور پاکستان میں تقسیم ہو گیا ہے۔

چائے کی بالائی سنہری کونپلوں کو توڑنے میں، خواتین کی مہارت اور مشاقی دونوں متاثر کن تھیں۔ تقریباً 80 ہزار میل کے رقبے پر پھیلے چائے کے باغات کا زیادہ حصہ، انگریزوں کے پاس ہے۔ اس نے یہ بھی جانا کہ لیبر کو، برٹش ٹی گارڈن میں زیادہ سہولتیں حاصل ہیں۔

حضرت شاہ جلال کے مزار کی زیارت کی خواہش بھی، اپنے آپ پوری ہو گئی کہ میزبان نے وہاں جانے کا پروگرام اور ان کے بارے میں تاریخ متعارف کروانے کا مشکل کام بھی، ازخود ہی مرتب کر ڈالا۔

رات کے کھانے کے بعد جب پوربی ہوائیں بوٹوں پر سے پھیل پھیل کر، خوشبوئیں بکھیر رہی تھیں۔ اور وہ سب ہاتھوں میں کپ پکڑے خوابناک سے ماحول کا حصہ بنے اپنی اپنی کرسیوں میں دھنسے ہلکے ہلکے چائے کے گھونٹ بھر رہے تھے۔ میزبان نے تاریخ ان پر کھول دی تھی۔

اس خطے کو حلقہ بگوشِ اسلام کرنے میں حضرت شاہ جلال کا نمایاں کردار ہے۔ سلہٹ کا

ہندو راجہ گور گو بند ظالم اور سفاک تھا۔ اس کی سفا کی نے ایک صالح مسلمان برہان الدین کے اکلوتے بیٹے کو صرف اس جرم میں قتل کروا دیا کہ اس نے بچے کے عقیقے پر گائے ذبح کی۔

شیخ برہان الدین کی علاؤ الدین خلجی کے دربار میں دردمندانہ اپیل پر شاہ کو اپنا بھتیجا سکندر غازی بھیجنا پڑا۔

مقامی علماء اور مجاہدوں کے گروہ کی قیادت حضرت شاہ جلال کر رہے تھے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ہندوؤں نے ان کا راستہ پتھر کی سل رکھ کر روکنا چاہا۔ انہوں نے سل کو ہٹنے کا حکم دیا اور یوں اس کا نام سلہٹ پڑا۔

وہ اگلے دن کوئی گیارہ بجے سلہٹ پہنچے۔ ایک صاحبِ دین، صاحبِ علم اور خدا کے برگزیدہ بندے کے مزار پر جو رونق اور گہما گہمی ہو سکتی ہے، وہ اپنے تمام تر لوازمات کے ساتھ یہاں موجود تھی۔ مزار تک جانے کا راستہ دورویہ دکانوں اور ان میں بکتے پھول بتاشوں، سبز چادروں، مجاوروں اور خلقِ خدا کے چلنے پھرنے سے اٹا پڑا تھا۔ نفل اور دعائیں۔ پھیلی ہتھیلیوں پر، پور بو پاکستان پھیلتا اور سکڑتا رہا۔

''میرے اللہ! میرا وطن''...... الفاظ ساتھ چھوڑ گئے اور وہ نم آنکھوں سے باہر آ گئی۔

دریائے سرما کے سامنے سرکٹ ہاؤس میں دوپہر کا کھانا اور پھر سلہٹ شہر کی سیر۔ واپسی رات کو ہوئی۔

پھولوں سے بھرے کنج میں چائے پیتے، ٹی گارڈن کی اونچی نیچی پہاڑیوں پر گھومتے، کلب میں سکاٹش، آئرش، جرمن، امریکن، برٹش اور ویسٹ پاکستانیوں سے باتیں کرتے۔ بوب ہوپ کے گیت سنتے اور پنگ پونگ کھیلتے بھی وہ اپنے ذہن کو تلخ تفکرات سے آزاد نہ کر سکی تھی۔

فینچو گنج میں دریا کے کنارے کنارے پیگوڈا ایسے مکان میں کھڑی جب وہ فضا پر نظر ڈالتی تو اسے اختر شیرانی یاد آتا، صوفی تبسم کے وطن کے نغمے یاد آتے۔ تب وہ بے حد مغموم اور مدھم آواز میں...... ''اے وطن پیارے وطن، پاک وطن۔ پاک وطن''...... گاتی۔ یہ شاہ جلال کا

مقدس شہر ہے۔ یہ میرے وطن کا حسن ہے، تو اس کی عظمت اور حسن کو یونہی قائم رکھنا۔ وہ جذبات سے بوجھل آواز میں اس سے مخاطب ہوتی جس کے جلوے اسے یہاں ہر سو نظر آتے۔

اور ٹی گارڈن میں اپنے قیام کی آخری شام جب وہ سب صاحب خانہ کے پاس بیٹھے ان سے باتیں کر رہے تھے۔ لڑکے ماؤ اور لینن کے فلسفوں کی حمایت میں دھواں دھار بول رہے تھے۔ میزبان نے اس سے پوچھا تھا۔...... ''آپ کس نظریہ حیات کو مانتی ہیں؟''

اور وہ جو سرخ روغنی جگمگاتے برآمدے میں انواع واقسام کے پھولوں کو دیکھنے میں محو تھی۔ انتہائی بے نیازی سے بولی تھی۔

''میں کسی بھی قسم کے احساس کمتری میں مبتلا نہیں۔ اسی لیے مجھے ماؤ اور مارکس کے نظریات سے قطعی دلچسپی نہیں۔ میں اس فلسفۂ حیات پر ایمان رکھتی ہوں جو ہر لحاظ سے مکمل اور جامع ہے اور چودہ سو سال گزر جانے پر بھی اپنی اسی افادیت سے زندہ ہے۔''

فیاض حسین ...... جو ''ایشیا سرخ ہے'' ...... کا نعرہ بہت زور و شور سے لگاتا تھا، اس کی بات سُن کر رعونت سے بولا۔...... ''لو! تمہارا مطلب ہے کہ ہم احساس کمتری میں مبتلا ہیں۔''

''اس میں بھی کوئی شک ہے۔'' ......اس نے بے رخی سے کہا۔

بات یقیناً آگے بڑھ جاتی پر میزبان جو ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا، بولا ...... ''تم لوگ فرسٹریشن کا شکار ہو کیونکہ تمہیں ایک واضح نصب العین کسی نے نہیں بتایا۔ تمہیں یہ معلوم نہیں کہ یہ ملک کس لیے حاصل کیا گیا تھا۔ اب ایسے میں اگر تم اپنی نجات کا ذریعہ ماؤ اور لینن کو سمجھتے ہو تو اس میں تمہارا تو کچھ قصور نہیں۔''

وہ دفتری کاموں میں الجھا ہوا تھا جب اسے وہ خط ملا۔ اس نے سرسری نگاہ اس پر ڈالی اور لفافے کو چاک کیا۔ الفاظ پر نظریں دوڑاتے ہی اس کا رنگ بدلا اور پیشانی پر لکیریں نمودار ہوئیں۔ وہ دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا رہا اور پھر اسے ردی کی ٹوکری میں پھینکنے کی بجائے اس نے اُسے اپنے کُرتے کی جیب میں ڈال لیا۔

بقیہ کام اس نے نپٹایا ضرور پر اس لگن اور شوق سے نہیں۔ وہ پریشان سا تھا اور جب وہ دوپہر کا کھانا کھا کر آرام کے لیے دفتر سے ملحقہ کمرے میں گیا، اس نے خط کو جیب سے نکالا اور پھر پڑھا۔

میں شادی کے لیے تیار ہوں، اگر آپ وطن دشمن سرگرمیاں ترک کر دیں۔

سمعیہ علی

اور اس بار نہ تو اس کا رنگ بدلا اور نہ ہی تیوریاں چڑھیں بلکہ وہ مسکرایا اور یہ مسکراہٹ کافی حد تک طنزیہ تھی۔

اس نے کروٹ بدلی اور سونے کے لیے آنکھیں موند لیں۔

تب اس نے کافی کے پیالے کو ہونٹوں سے لگایا۔ گھونٹ بھرا اور رائٹنگ پیڈ دراز سے نکالا۔ باہر رات تاریک تھی۔ میز پر ٹیبل لیمپ کی زرد روشنی بکھری ہوئی تھی جس میں نہاتا ہوا وہ جھکا اور اُس نے لکھا۔

ایلیفینٹ روڈ

دھان منڈی

13 اپریل 1970ء

عزیزہ سمعیہ علی

تمہیں میرا پیار!

مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری اتنی کڑی شرط کی تعمیل سے معذور ہوں۔ تم نے وطن دشمن سرگرمیوں کو ترک کرنے کے لیے کہا ہے۔ سمعیہ! میں پوچھ سکتا ہوں کہ ان سے تمہاری کیا مراد ہے؟ مجھے امید ہے تمہیں ان سے پوری آگاہی ہوگی۔ میں تم پر یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ حب الوطنی کبھی خلاؤں میں نہیں پروان چڑھی۔ قوم اور ملک سے محبت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب افراد کے کندھوں پر ذمہ داریاں ڈالی جائیں اور انہیں ان سے عہدہ برآ ہونے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

تم سیاسیات کی طالبہ ہو۔ اگر 1962ء کا آئین تمہاری نظروں سے گزرے تو غیر جانبدار ہو کر اس کا مطالعہ کرنا۔ یقیناً تم پر ثابت ہوگا کہ ساڑھے سات کروڑ کی اس بنگالی قوم کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

تم بتاؤ! کوئی خوددار قوم اس صورت حال کو برداشت کرتی؟ یقیناً نہیں لہٰذا ایشیا اور افریقہ کے بعض ممالک کی طرح ہم لوگ بھی مذہب کی بجائے علاقائیت کی طرف جھک گئے ہیں اور اس کا نتیجہ جو بھی ہوگا جلد سامنے آجائے گا۔

تمہاری دل آزاری کا مجھے دلی افسوس ہے پر میں واضح لفظوں میں کہنا پسند کروں گا کہ ہم

لوگ غلام ہیں اور غلامی کے اس طوق کو گلے سے اتارنے کا عزم رکھتے ہیں۔ ایسے میں وطن دشمن سرگرمیوں کی اصطلاح بالکل بیکار ہے، مجھے اپنی ان سرگرمیوں پر نہ افسوس ہے، نہ شرمندگی۔

اب رہا یہ سوال کہ میں نے تمہیں پروپوز کیوں کیا؟ ممکن ہے تم سمجھو کہ تمہاری خوبصورتی نے مجھے اپیل کیا ہے۔ گو اس میں شک نہیں کہ تمہارا معصوم حسن لوگوں کو فوراً متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پر میرے سلسلے میں ایسی کوئی بات نہیں۔ تو پھر وہ کون سی وجہ تھی جس نے مجھے تمہارے سامنے یہ درخواست کرنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اس پر غور کیا اور اس کی تہہ تک پہنچنے سے قاصر رہا۔ بس میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ ایک دن مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میرے خلاف سرگرمی سے کام کرتی وہ لڑکی جو میرے گھر کے افراد کی آنکھ کا تارا ہے، خود مجھے بہت عزیز ہو چکی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ میرے اور تمہارے راستے متوازی ہیں۔ ان دو راستوں کے درمیان فاصلے بڑھ تو سکتے ہیں کم نہیں ہو سکتے۔ پر پھر بھی میں نے تم سے وہ بات کہہ دی جس کی تمہیں توقع نہ تھی اور تمہارا جواب بھی وہی ہے جس کی مجھے امید تھی۔

سمعیہ علی! بنگال ہماری آرزوؤں اور امنگوں کا مدفن بن چکا ہے۔ جیون کے لیے بھات پانی اور ہوا کی ضرورت نہیں۔ انسان بہت کچھ اور بھی چاہتا ہے۔ میں اگر تمہیں یہ مشورہ دوں کہ اپنے اُن لاکھوں ہم وطنوں کی طرح جو اونچی اونچی کرسیوں پر بیٹھ کر کہتے ہیں۔ بنگال ارے لعنت بھیجو اس بھوکے ننگے پر، ہمارا ناک میں دم کر دیا ہے اور یہ بنگالی! سدا کے کاہل اور سازشی۔ سوچنا شروع کر دو گی تو مجھے امید ہے کہ تمہارا یہ ہر دم ڈوبتا دل تقویت پا جائے گا۔ انسانی جذبات کا دھارا بدلنے کے لیے سوچوں کو ہی بدلنے کی ضرورت ہے۔

اچھا! اب اجازت۔

والسلام

اجتبیٰ الرحمان

''جیوتی۔''......اس نے تڑپ کر کہا......''بھگوان کے لیے اب خاموش ہو جاؤ۔''

اس نارنجی ساڑھی والی نے دیکھا تھا کہ اس کا رنگ ہمیشہ سے زیادہ سیاہ نظر آرہا ہے اور آنکھوں میں گہرا یاس ہے۔

اس نے ہمدردی سے اسے دیکھا اور بولی۔......''چھوڑو بھی اجیت! ایسی غدار لڑکی کے لیے مرے جاتے ہو۔ جس نے نہ قوم دیکھی نہ دھرم۔''

پر وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔......''ایسا تو نہ کہو۔ میں نے اسے اپنا جیون سمجھا تھا۔ وہ میرے من کی شانتی تھی۔''

اور اس لڑکی نے نفرت سے سوچا۔......''ڈوب مرے! کہتا ہے من کی شانتی تھی اور شانتی اس کی چھاتی پیٹتی اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔''

وہ اٹھا اور بوجھل قدموں سے ہال چلا گیا۔ شام تک وہ اپنے کمرے میں گھونٹ گھونٹ جن پیتا رہا اور اسی پورٹر کا I have got you under my skin گاتا رہا۔

وہ جگن ناتھ ہال کے اُس خاص کمرے میں بیٹھا ان سب لڑکوں پر خونخوار نظریں دوڑاتا

ہوا چیخ رہا تھا جو سروں کو نیچے ڈالے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔

''اگر تم نے محسوس کیا تھا اور اپنے ان خدشات کا اظہار بھی منوہر سے کیا تھا تو میں پوچھتا ہوں کہ مجھے اس سے لاعلم کیوں رکھا گیا؟''

تب دیو نے آہستگی سے کہا۔...... ''میں نے اسے محض اپنے واہمے پر محمول کیا تھا کیونکہ رنیش دت کی بیٹی سے کسی بھی ایسے امر کی توقع نہ تھی۔''

اس نے اپنا ہاتھ میز پر پھیلایا اور نارنجی ساڑھی والی کی طرف متوجہ ہوا۔

اس نے سرخ روپہلی ساڑھی پہنی اور میک اپ کیا۔ جب وہ اپنی شفاف پیشانی پر بندیا لگا رہی تھی، اس میجر کی بڑی بہن جو خود بھی کسی فلائٹ لیفٹیننٹ کی بیوی ہے، نے اس کا چہرہ محبت سے اوپر اٹھایا اور بولی۔

''عاصمہ! تم نے راستے بدل لیے ہیں، اب طریقے بھی بدل ڈالو۔''

اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں اور کُم کُم کا وہ خوبصورت ٹیکہ جسے وہ ماتھے پر لگانے جا رہی تھی، اس نے پھینک دیا۔

اس میجر کی ماں اور دونوں بہنوئی، اروما کی طرف سے شامل ہوئے۔ اس کی ماں کی خواہش پر اس کا حق مہر ایک لاکھ روپے بندھا۔ جب نکاح کی رسم ادا ہو گئی تو اس کی بوڑھی ماں نے جو پھولدار گھیر والی شلوار پہنے ہوئے تھی اور جس کے کانوں میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک چاندنی کی چھوٹی چھوٹی ڈنڈیاں جھول رہی تھیں، اس کے شانوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنی زبان میں کہا تھا۔...... ''تمہیں میری بوڑھی ہڈیوں میں محبت اور سکون ملے گا۔ میں نے وہ سب کچھ تیرے قدموں میں ڈال دیا ہے جو میری عمر بھر کی پونجی ہے، اس لیے کہ تجھے عدم تحفظ کا احساس نہ ہو۔

اور پھر وہ آفیسرز میس سے نکل کر تیج گاؤں پہنچی جہاں سفید اور سبز پروں والا ٹرائیڈنٹ اسے خود میں سمانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکلے جب اس نے الوداعی

نظریں اپنے گردوپیش پر ڈالیں۔ شاید اسے اپنی ماں یاد آئی تھی یا اپنا بھائی۔

اور اس سے دو قدم آگے چلنے والی اسلامی چھاترو شنگھو کی سرگرم کارکن نے جب اسے پلٹ کر دیکھا تو مضطرب ہو کر اس نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا تھا۔ ..... ''اروما! یہ آنسو کیسے؟ پنجاب میں تمہیں اپنائیت اور محبت ملے گی۔''

اور وہ جو آنکھوں میں چنگاریاں لیے اس داستان کی تفصیلات نہایت غور سے سن رہا تھا، تند آواز میں بولا ...... ''یہ اس سے کب سے متعارف تھی۔ پران! تم کیا جھک مارتے رہے ہو۔''

پران کو بھی غصہ آیا۔ بگڑا اور بولا ...... ''اجیت دادا! وہ کچھ بھی کرتی، اس کی نیت پر شبہہ نہیں کیا جا سکتا تھا اور یوں بھی میں نے تو اسے اس کے ساتھ کبھی دیکھا ہی نہیں۔''

''واقعہ یہ ہے کہ نیلما گھمبیر آواز میں بولی۔ ''ارومادت ایک شام ڈھاکا ریڈیو سٹیشن نمبر ایک سے پروگرام کر کے نکلی تو یہ پنجابی لڑکی بھی اسی وقت فورسز پروگرام کی چینل نمبر دو سے اناؤنسمنٹ سے فارغ ہو کر گیٹ سے باہر آئی۔ ایک وجیہہ نوجوان کے ساتھ ارومادت کو بیٹھے دیکھا تو چونکی اور خود سے بولی۔ ''یہ یقیناً پنجابی یا پٹھان ہے۔'' وہ اروما کو بھی اچھی طرح پہچانتی تھی۔ سننے میں آیا ہے کہ اس نے ہال پہنچ کر فوراً ہماری لڑکیوں سے بات کی جنہوں نے اعتراف کیا کہ اکثر اسے ایک حسین نوجوان کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔

اگلے دن اس نے ارسلان سے پتہ کروالیا کہ وہ میجر ہے۔ تب وہ آفیسرز میس پہنچی اور اس نوجوان کو خبردار کیا۔ پر اس نے اسے تسلی دی اور صورت حال سے آگاہ کیا۔

''یہ باتیں اب کیسے معلوم ہوئیں؟''

''ہماری لڑکیوں سے'' ...... نیلما نے مختصر جواب دیا۔

''میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ وہ پنجابی لڑکی جو بنگالیوں کے انداز میں ساڑھی پہنتی ہے، دوستانہ مسکراہٹیں ہر طرف بکھیرتی ہے، کھٹا کھٹ بنگلہ بولتی ہے، گھمبیر مسائل پر ٹھوس اور مدلل گفتگو کرتی ہے، اس کا علاج اگر وقت پر نہ کیا گیا تو وہ سب کے لیے ایک سنگین مسئلہ بن جائے گی۔''

اور اپسو کے اس پروانڈیا پارٹی کے لیڈر نے دھیان سے منوہر کو دیکھا جس نے بہت سنجیدگی سے یہ بات کہی تھی۔

''سنگین مسئلہ بن جائے گی نہیں، بن گئی ہے۔'' ...... ظہیر نے کہا۔تم نے دیکھا نہیں، اسلامی چھاترو شنگھو کو محض اس کی وجہ سے تقویت حاصل ہوگئی ہے۔اس نے ہماری پارٹی کے کئی مسلمان لڑکوں سے تفصیلی باتیں کی ہیں۔ وہ مذہب کا شوشہ چھوڑتی ہے اور مسائل کا تجزیہ بے حد خوبی سے کرتی ہے۔

اروما کے حادثے نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی ہے۔ میں اسے ٹھکانے لگانا چاہتا ہوں۔سرجیت نے کہا۔

''یہ اتنا آسان نہیں، مارشل لاء کا زمانہ ہے اور پھر وہ فوجیوں کے خاندان سے ہے۔ یوں بھی شلپی کا خاندان اس کا مقامی سرپرست ہے۔''

''بند کرو بکواس!'' ...... وہ منوہر پر دھاڑا...... ''ہم اسے اغوا کریں گے، رہا شلپی کا سوال تو اس کی پارٹی کے شرپسندوں کو اکسایا جاسکتا ہے۔''

آگے بڑھا تھا جب اسے اپنے بھائی کی نیم پلیٹ نظر آگئی۔

رک کر اس نے اپنے دھڑکتے دل پر قابو پایا اور آہستگی سے دروازے کو اندر کی جانب ہلکا سا دھکا دیا۔ کمرے میں خاموشی اور سکون تھا۔ میز کے عین سامنے وہ کہنیاں اس پر رکھے شاید گہری سوچوں میں کھویا ہوا تھا۔

وہ جب بیٹھ گیا، تب وہ چونکا۔ اس نے گہری نظر اپنے بھائی پر ڈالی اور شیشے پر پڑے کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے لگا۔

بوجھل سکوت سے اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کون سی ایسی بات ہے جس کے لیے اسے یوں بلایا گیا ہے اور اس کا بھائی اس درجہ پریشان نظر آ رہا ہے۔

دیر بعد اس نے چہرہ اوپر کیا اور بھاری آواز میں بولا۔ بُلبل! میں نے تمہیں نہایت اہم کام کے لیے بلایا ہے۔

''کہیے!''

''سمعیہ کل رات آٹھ بجے کے قریب میر پور میں ایک اہم میٹنگ کے لیے جا رہی ہے، جس طرح بھی ممکن ہو اسے وہاں جانے سے روکو۔''

اس کی بات ابھی جاری ہی تھی جب بُلبل اسے کاٹتے ہوئے بولا۔ ''شبلی بھیا! اپوزیشن کو دبانا کسی طرح بھی مستحسن نہیں۔ نظریات کے پرچار کا حق ہر انسان کو ہونا چاہیے، آپ لوگ تو بہت جلد اسلامی چھاترو شنگھو کی سرگرمیوں سے خوفزدہ ہو گئے ہیں۔''

''تم سمجھے نہیں بلبل! سمعیہ کو خطرہ ہے۔ تمہیں میں نے اس لیے بلایا ہے کہ وہ تمہارے کافی قریب ہے اور تم کل با آسانی اسے اِدھر اُدھر کر سکتے ہو۔ اس نے نرمی سے بولتے ہوئے اپنی بات کو جاری رکھا۔ اپسو کے مین گروپ جسے سرجیت گائیڈ کرتا ہے نے کلکتہ سے کمانڈو بلائے ہیں تاکہ اسلامی چھاترو شنگھو کی اس لڑکی کو اغوا کر لیا جائے جس نے طوفان مچایا ہوا ہے۔ غالباً تمہیں ارومادت اور اپسو کے پانچ لڑکوں کا قصہ معلوم ہو جنہوں نے اپنی پارٹی چھوڑ کر

اسلامی چھاتر وشنگھو کی رکنیت اختیار کرلی ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ ظہیر کہتا ہے کہ ہم خود پھانسی لگ جائیں گے پر اسے نہیں چھوڑیں گے۔''

اور کرسی پر بیٹھے بیٹھے اسے یوں لگا جیسے زمیں ایکا ایکی بہت تیزی سے گھوم گئی ہو۔

زمین کو ضرور گھومنا چاہیے تھا، اس لیے کہ عظیم پور کے مختصر فلیٹ میں بسنے والے خاندان کے کسی بھی فرد نے اس کے لیے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ وہ غیر قوم کی ایک لڑکی ہے اور اس کے ساتھ ان کا خونی تعلق نہیں۔ دس ماہ کی مدت میں وہ تو ان کے جان و جگر میں سما چکی تھی۔

اب ایسے میں وہ یہ کیسے سن سکتے تھے کہ نکسل باڑی تحریک کے غنڈے مغربی بنگال سے اسے اغوا کرنے آئے ہیں۔

اس نے اپنے سائیں سائیں کرتے کانوں، گھومتے سر اور اُڑتے حواس پر قابو پایا اور بولا۔...... ''وہ ہماری بہن ہے، ہماری موجودگی میں غنڈے خواہ مغربی بنگال کے ہوں یا مشرقی بنگال کے اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔''

''پاگل مت بنو بُلبل! تم چوبیس گھنٹے اس کی حفاظت نہیں کر سکتے، وہ ایک لڑکی ہے جس کی آبرو اس کی زندگی سے زیادہ قیمتی ہے۔''

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''...... وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

''یہ کہ اُسے ایک دو دن کے اندر اندر اس بات پر آمادہ کرو کہ وہ مغربی پاکستان واپس چلی جائے۔''

شبلی بھیا! اس نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اتنی سی بات کے لیے اس قدر لمبے چوڑے افسانے کی کیا ضرورت تھی؟''

''بلبل! مجھ پر اعتماد کرو۔ وہ خطرے میں ہے۔ میری اپنی پارٹی کے بہت سے لڑکے اور لڑکیاں ظہیر اور سرجیت کے اس منصوبے میں شامل ہو گئے ہیں۔ گزشتہ سترہ اٹھارہ دن سے میرے آدمی اس کی حفاظت کر رہے ہیں، یوں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں۔ پر صورت حال اب

قابو سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔ میں نے ماں سے بھی کہا تھا کہ وہ اسے سمجھائیں کہ اسے محتاط رہنا چاہیے پر معلوم ہوتا ہے اسے اپنی جان سے دشمنی ہے۔''

وہ رکا اور دیر بعد اداس لہجے میں بولا۔...... ''اس کا ڈھاکا سے چلے جانا میرے لیے قیامت ہوگا۔ پر میں اسے برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

اپنے بھائی کے آخری جملے پر وہ چونکا اور بہت کچھ سمجھ گیا۔

''ٹھیک ہے!''......اس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

اس نے گیلا تولیہ سٹینڈ پر پھیلایا اور بستر پر پڑے ''پاکستان آبزرور'' پر نگاہ ڈالی۔ پندرہ اپریل کی صبح تھی۔ اس کی روم میٹ نیلا پینٹ کیے ہوئے گریٹنگ کارڈ کو جلدی جلدی لفافوں میں ڈال رہی تھی۔ اس نے کام روک کر اسے دیکھا اور بشاش لہجے میں بولی...... ''سومی! نیا بنگلہ سال مبارک ہو۔'' جواباً اس نے وہی الفاظ اس کے لیے دہرائے۔

اخبار کی پہلی سرخی اس ٹارنیڈو کی تھی جو ڈھاکا کے نواحی علاقوں میں 120 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آیا اور جس نے چار ہزار افراد کو اپنا لقمہ بنا ڈالا تھا۔ اس نے خبر پڑھی۔

''نئے سال کا پہلا مبارک دن۔''

وہ بستر پر بیٹھ گئی۔ لڑکیاں برآمدے میں نئے سال کی ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہی تھیں۔ وہ یاس بھری آواز میں اپنے آپ سے بولی تھی۔

''کوئی کس کس کا ماتم کرے اور کس کس کی بے حسی کو روئے۔ یہاں ہندوؤں اور انگریزوں سے ناطے دن بدن عروج پر ہیں۔ ایک، یکم بیساکھ کو نیا بنگالی سال کہتا ہے اور دوسرا، جو خود کو اپر کلاس میں شمار کرتا ہے، 31 دسمبر کی شب نئے سال کے انتظار میں کلبوں اور ہوٹلوں میں

گزارتا ہے۔ یہ کون ہیں اور ان کا اپنا سال کون سا ہے؟ یہ انہیں نہیں معلوم اور یہ جاننے کی انہیں تمنا بھی نہیں۔''

اسے اپنے حلق میں کانٹے چبھتے محسوس ہوئے تھے۔ ہیٹر پر رکھی کیتلی میں پانی سوں سوں کرنے لگا تھا۔ اس نے چائے ڈالی جب جہاں آرا نے آواز دی...... ''اخبار تمہارے پاس ہے؟''

''ہاں اندر آؤ نا۔''

اس نے اخبار اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔ معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا اور آہستگی سے کہا...... ''نیا بنگالی سال، چار ہزار افراد ہلاک۔''

''تم ڈھاکہ کلب جا رہی ہو؟''...... اس نے پوچھا۔

''ہاں تم بھی چلو۔ تنبولا کھیل آنا۔''

''دیکھوں گی۔''...... اس نے کہا اور اخبار ہاتھ میں پکڑے باہر چلی گئی۔

اس نے اپنے بالوں کو چھوا۔ وہ ابھی تک گیلے تھے اور ان میں کولون کی مہک تھی۔ اس نے اپنے آپ سے کہا...... ''میں کپڑے بدلتی ہوں، اتنے میں یہ سوکھ جائیں گے تو انہیں باندھ لوں گی۔''

جب وہ سٹول پر بیٹھی بالوں میں برش کر رہی تھی، شفاف آئینے میں اس نے اپنا بغور جائزہ لیا تھا اور خود محسوس کیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں تیز چمک ہے، رخسار گلابی اور چہرے پر تازگی اور نکھار ہے۔ گزشتہ دنوں والی پژمردگی کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔

اپسو گروپ کے پانچ اور این۔ ایس۔ ایف میں سے تین لڑکوں کی اس کی پارٹی میں شمولیت ایک ایسی خوش آئند بات تھی جس نے اس کے عزم و حوصلے اور جوش و جذبے کو نئی زندگی دی تھی۔ سارے تفکرات اس نے ایک طرف پھینک دیے اور تندہی سے دوبارہ کام میں جت گئی تھی۔

گو یہ ضرور تھا کہ اس کی مشکلات میں یک دم اضافہ ہو گیا تھا، وہ جو سارا دن دندناتی

پھرتی، اب قدرے محتاط ہوگئی تھی۔ پندرہ دن کے اندر اندر اس پر دو بار حملہ ہوا۔ اس کی پارٹی کے لڑکے لڑکیوں نے کہا کہ وہ آرمی سے مدد مانگے پر اس نے یکسر انکار کر دیا۔......

''ہرگز نہیں!'' وہ عزم سے بولی۔ ''زندگی، موت، عزت اور ذلت سبھی اس کی طرف سے ہیں۔ میری یہ حقیری سی جان اگر وطن اور دین پر قربان ہو جائے تو اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو سکتی ہے۔ ارسلان! ہمیں حب الوطنی کے دیئے جلانے ہیں اور اس کے لیے ہمارا خون چاہیے۔''

ہاں یہ ضرور تھا کہ اس نے اب پستول اپنے پاس رکھنا شروع کر دیا تھا جو اسے اس کی پارٹی کی طرف سے دیا گیا تھا۔

وہ ان دنوں اکثر ڈھاکا کلب میں دیکھی جا رہی تھی۔ یوں وہ پارٹی پالیٹکس سے قبل بھی کبھی کبھی حمیدہ شریف کی بہن اور بہنوئی کے ساتھ یہاں ہوزری کھیلنے آتی تھی۔ پر تب اور اب میں بہت فرق تھا۔ اس وقت اس کے سامنے ایک واضح نصب العین تھا۔ دراصل اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ اس کی شخصیت میں حُسن اور دلکشی ہے۔ وہ شیریں لب ولہجہ میں بات کرتی ہے جو بنگلہ زبان کی نسوانی غنائیت سے اور بھی خوبصورت لگتا ہے۔ اس کی گفتگو ٹھوس اور مدلل ہوتی ہے جسے سمجھ دار لوگ سننا پسند کرتے ہیں۔

اور یہی وجہ تھی کہ وہ ڈھاکہ کلب کی اپر کلاس سوسائٹی میں اپنے مشن کی تکمیل کے لیے بہت خاموشی سے سرگرم عمل تھی۔

وہ جب سلیقے سے بال گوندھ چکی، اس نے نفیس کڑھت کی آبی رنگ کی ساڑھی پہن لی اور نیچے جانے کے لیے برآمدے میں آئی تو اسے آئینہ ملی جو باہر سے آ رہی تھی جس نے بتایا کہ نیچے بُلبل اس کا انتظار کر رہا ہے۔

کرشنو چوڑا کے پاس اس نے بُلبل کو کھڑے دیکھا تو وہ حیران رہ گئی۔ اس کا چہرا اترا ہوا تھا اور آنکھوں میں تھکاوٹ نمایاں تھی۔

اس نے گھبرا کر کہا۔...... ''گھر پر تو خیریت ہے نا بُلبل؟''

''ہاں سب اچھے ہیں۔'' اس نے مختصراً کہا۔

''پر تم کیسے ہو رہے ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟''

وہ افسردہ سی ہنسی ہنسا اور بولا۔...... ''سو فیصد ٹھیک ہوں۔ بس ذرا دیر تک پڑھتا رہا تھا، نیند پوری نہ ہو سکی۔ پر آپ کہیں جا رہی ہیں کیا؟''

''ذرا ڈھاکا کلب تک جانے کا خیال ہے۔ کیوں؟''

''میں آپ کو لینے آیا تھا۔ میرے ایک دوست کی بہن آپ سے ملاقات کی بہت مشتاق ہیں۔''

''تو چلو!''......وہ اس ہاتھ پکڑ کر گیٹ کی طرف بڑھی۔

اور جب وہ دونوں سائیکل رکشے میں بیٹھے شانتی نگر جا رہے تھے۔ بُلبل کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا۔

اور کنال کے رقبے میں پھیلی اچھی دیدہ زیب کوٹھی میں جب وہ اتری تو یہاں ہو کا عالم تھا۔ وہ کمرے میں آئی تو وہ کسی اجڑے گھر کا ڈرائینگ روم نظر آتا تھا۔ ایک صوفہ، چند کرسیاں اور چھوٹی سی میز پر ٹیلی فون پڑا تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ انجانے خطرے کو سونگھا اور تیز آواز میں بولی۔

''بُلبل! کہاں لے آئے ہو مجھے؟''

اور صوفے پر بیٹھے بُلبل نے دکھ سے اسے دیکھا اور کہا۔......

''آپ کو بُلبل پر اعتماد نہیں کیا؟''

''اعتماد نہ ہوتا تو یوں چلی آتی؟ اس کا لہجہ ابھی بھی تیز اور نوکیلا تھا...... ''سومی آپا!'' بُلبل نے اسے شانوں سے پکڑ کر بٹھایا۔ ''سکون سے بیٹھیے میں آپ کو بہت ضروری کام سے یہاں لایا ہوں۔ غلط بیانی کے لیے معافی چاہتا ہوں پر میرا مقصد وقت سے قبل آپ کو پریشان کرنا نہیں تھا۔''

اور وہ وسوسوں اور اندیشوں میں گھری اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

اس کی نظر سامنے دیوار پر پڑی۔ لمبی داڑھی والا ناتواں بوڑھا اپنی باشا کے سامنے بیٹھا قریب پڑی پٹ سن کی گانٹھ کو دیکھ رہا تھا۔ لاغر سی عورت پانچ بچوں کے ساتھ باشا سے نکلتی دکھائی دے رہی تھی۔ دور سورج ڈوب رہا تھا۔ زین العابدین کا آبی شاہکار۔

بُلبل کی کمزور آواز اسے باشا اور بوڑھے کے پاس سے کھینچ لائی۔

''آپ آج میرپور میٹنگ پر جا رہی ہیں؟''

وہ چونکی۔ حیرت سے اس نے بُلبل کو دیکھا۔ کچھ دیر سوچا اور بولی۔...... ''کھُل کر بات کرو۔''

''اپسو کا پروگرام آج رات آپ کو اغوا کرنے کا ہے۔''

اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ خون کی گردش بھی رکتی محسوس ہوئی۔

دیر بعد اس نے بُلبل کی طرف دیکھا جو ساکت بیٹھا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ کھڑی ہو گئی۔ اضطراری حالت میں اس نے کمرے میں دو چکر لگائے۔ میز پر پڑی تھرموس کو کھولا۔ پانی گلاس میں انڈیلا۔ گھونٹ گھونٹ پیا۔ اس کا اونچے اونچے چیخ چیخ کر رونے والا دل کچھ سکون پذیر ہوا تو وہ بولی ''یہ مجھے اغوا کرنے آئیں گے تو دس کا خون گنوا کر ہی مجھے لے جا سکیں گے۔ میرے ہاتھ فولادی ہیں اور میرا عزم آہنی ہے۔ پر بُلبل! یہ تو مجھے بتاؤ کہ تم اپنے بھائی کی پارٹی کو کیوں چھپا گئے ہو جو میرے خون کی پیاسی ہو رہی ہے؟''

''ان کی پارٹی کے چند شر پسند بہت ممکن ہے آپ کے خلاف ہوں۔ پر سومی آپا! یہ تو آپ کو معلوم نہیں کہ اسی پارٹی کے اٹھارہ لڑکوں نے چوبیس گھنٹوں میں سے سولہ گھنٹے آپ کی حفاظت میں گزارے ہیں۔''

''یہ غلط ہے۔ فضول بکواس ہے۔ اپنی حفاظت میں نے خود اور میری پارٹی کے لوگوں نے کی ہے۔''

''میری بات پر اعتماد کیجیے سومی آپا! شبلی بھیا بہت پریشان ہیں، حالات دن بدن نازک ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ جو میں آپ کو یہاں لایا ہوں تو انہی کے ایما پر۔ طویل غور و خوض کے بعد ہم نے سوچا ہے کہ آپ کو مغربی پاکستان بھجوا دیا جائے۔''

''ہوش میں ہو تم بُلبل؟''...... وہ چیخی۔ شیشے کا وہ گلاس جو اس نے ہاتھوں میں پکڑا ہوا تھا، فرش پر گرا اور چور چور ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ایک کے بعد ایک رنگ آ رہا تھا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس نے ایک نظر شیشے کی ٹوٹی کرچیوں اور دوسری بُلبل پر ڈالی جو خود بھی بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔

خوشی کا وہ احساس جو اس کے دل میں اپنی حفاظت پر اٹھارہ آدمیوں کے مامور کرنے کا سن کر پیدا ہوا تھا، آناً فاناً ہی ختم ہو گیا۔ نفرت کا طوفان اس کے دل سے اٹھا اور اسے ہلاتا چلا گیا۔

''بُلبل! میں شبلی کے مقاصد اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ اسے کسی نے یہ حق نہیں دیا کہ وہ مجھے مغربی پاکستان بھجوانے کا سوچے۔ میں اپنے افعال کی خود ذمہ دار ہوں۔''

''آپ جذباتی ہو رہی ہیں سومی آپا! آپ ہماری بہن ہیں، ہماری عزت ہیں۔ ہماری ذمہ داری ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ ہم اس ذمہ داری سے آنکھیں بند کریں، حالات جس نہج پر جا رہے ہیں اس نے ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔''

بُلبل کی جذبات میں ڈوبی یہ باتیں اس نے سنیں تو سارا ضبط دم توڑ گیا، وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اس کی اپنی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ روتی رہی اور وہ اسے چپ کرواتا رہا۔ پر جانے کب کا رکا ہوا لاوہ تھا جو اب بہہ رہا تھا۔

وہ روتی رہی اور باہر وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ اس کی تیز ہچکیاں سسکیوں میں بدلیں۔ ہیرے جیسی چمک والی آنکھیں سرخ اور ان کے پپوٹے متورم ہوئے۔ اسے یہ بالکل معلوم نہیں ہوا کہ بُلبل نے کسی کو فون کیا تو کیا کہا۔ وہ کب یہاں سے گیا اور یہ کہ وہ اس وقت کمرے میں تنہا ہے۔

اس کا دل بوجھل تھا۔ دماغ بوجھل تھا، تھوڑی دیر بعد تلخ خیالات کی ایک تیز لہر اس کے سینے سے اٹھتی اور صوفے کی بیک پر رکھے اس کے چہرے پر بند آنکھیں سسکی کے ساتھ آنسو بہا دیتیں۔

''تو نے آزادی ہمیں دی اور اب تُو چھین رہا ہے۔ کیا ہم اس کے قابل نہ تھے؟''

اب وہ اس قابل کہاں تھی کہ تاریخ کے اوراق پر سیاہی پھیر دیتی یا انہیں پھاڑ ڈالتی۔ یہاں تو اقتدار کی تڑپ تھی۔ کرسیوں کی ہوس تھی۔ اسے بنانے اور سنوارنے کا تو کسی کو ہوش نہ تھا۔ اب اس سے محبت بھی انہیں ہی تھی جو نہایت متوسط اور غریب تھے جنہوں نے اسے اپنے لیے گوشہ عافیت سمجھا تھا۔

اور یہ گوشۂ عافیت ان کے لیے جہنم بنتا جا رہا تھا۔ خود غرضیوں نے تباہ کر ڈالا تھا۔

اب ایسے میں آنسوؤں کو تو دھڑا دھڑ بہنا ہی تھا۔

اس نے گردن اٹھائی اور سیدھا ہونے کی کوشش کی۔

دیر بعد اسے بُلبل کا خیال آیا۔ اس نے بائیں جانب دیکھا۔ صوفہ خالی تھا اور کمرہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اسے رنج بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔

گھڑی دیکھی تو حیران رہ گئی۔ اتنا وقت گزر گیا تھا۔ کھڑی ہوئی تو بھوک کا احساس ہوا۔ دروازہ دیکھا بند تھا۔ کھولنے کی کوشش کی۔ اسے غالباً باہر سے لاک کیا ہوا تھا۔ تن بدن میں آگ لگ گئی۔ پلٹی اور غصے سے بولی۔......'اپنے بارے میں کسی بھی فیصلے کا حق صرف مجھے ہے اور میں یہ کسی کو بھی دینے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔ ذمہ داری اگر یوں ان کے سر پر سوار ہوگئی ہے تو میں ان سب کو اس سے سبکدوش کر دوں گی۔'

اس نے شدید غصے کے عالم میں اپنے آپ سے یہ سب کمرے میں ٹہلتے ٹہلتے کہا تھا۔ پر جب اس نے جذبات سے ہٹ کر یہ سوچا کہ کیا میں ایسی کوئی بات ماں بابا سے کر سکتی ہوں تو اس کا دل آپ ہی آپ کٹنے لگا تھا۔ یہ تو ممکن نہیں، ایسا تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ انہوں نے اپنا پیار میرے اوپر فراخ دلی سے لٹایا ہے۔ یہ تو اس پیار کی توہین ہے، اس محبت کی تذلیل ہے۔

اور اس کی جلتی آنکھوں میں اور جلن ہوئی۔

وہ باتھ روم میں گئی۔ آئینہ پر نظر پڑی۔ آنکھیں بوٹی ہو رہی تھیں۔

پائپ کھولا، پانی کے چھینٹے آنکھوں پر مارے۔ دس منٹ تک وہ ایسا کرتی رہی، تب اس نے ساکت کھڑے ہو کر آنکھیں بند کیں۔ آگ نکلتی محسوس ہوئی اور جب اس نے دوبارہ انہیں کھولا تو اس نے دیکھا جہاں اس کی پیشانی اور رخساروں پر باہر کے موتی چمک رہے ہیں وہیں پلکوں کے کناروں پر اندر سے نکلے ہوئے موتی بھی لرز رہے ہیں۔

ایک کراہ کے ساتھ وہ کمرے میں پھر آ گئی۔ کونے کی میز پر ہوٹ کیس اور تھرموس رکھا

نظر آیا۔ وہ قریب گئی، کھولا تو خوشبو ہوا میں اڑی۔ چائے گرم اور خوش رنگ تھی۔...... ''نظر بندی کے انتظامات مکمل ہیں اور اچھی طرح سوچ سمجھ کر کیے گئے ہیں۔''

اس نے کہا اور نڈھال سی واپس آ کر پھر صوفے پر بیٹھ گئی۔ کبھی بیٹھتی، کبھی لیٹتی، سوچ سوچ کر کھولتی اور اپنا خون پیتی۔

تب اس نے فون اٹھایا، نمبر گھمائے اور ریسیور کان سے لگایا۔...... ''شلپی!''...... دوسری طرف سے آواز آئی اور بس وہ یہ سنتے ہی برس پڑی جو دل میں آیا، بولتی چلی گئی اور جب دوسری جانب سے کوئی جواب نہ ملا تو وہ چلائی۔

''بولتے کیوں نہیں؟ جواب کیوں نہیں دیتے؟''...... پر جواب کون دیتا، جب کہ اس نے تو اس کی آواز پہچانتے ہی ریسیور کریڈل پر رکھ دیا تھا کیونکہ وہ اس وقت ایک اہم میٹنگ میں مصروف تھا۔

وہ چیخی اور چنگھاڑی۔ اس نے فون اٹھا کر زمین پر مارا، میز کو ٹھوکر لگائی، ہوٹ کیس زمین پر گر پڑا۔ تھرموس کو پوری طاقت سے فرش پر پھینکا۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا۔...... ''یہ میری حفاظت کے انتظامات ہیں یا مجھے راستے سے ہٹانے کے حربے۔''

اور جب وہ سوا نو بجے کے قریب دروازہ کھول کر اندر آیا، اس نے دیکھا کہ وہ کھلی آنکھوں کے ساتھ نیم دراز لیٹی تھی۔ فرش پر فون کا ڈھانچہ، تھرموس اور ہوٹ کیس کے ڈبے اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ اس نے ایک نظر ان سب کو دیکھا اور دوسری نظر اس پر ڈالی جو ایک ٹک اسے گھور رہی تھی۔ اس نے فوراً دوسری طرف دیکھا کیونکہ اسے ان آنکھوں میں واضح نفرت کے آثار نظر آئے تھے۔

وہ کچھ دیر کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ وہاں مکمل خاموشی تھی۔ اس کے تیوروں سے بہت کچھ سمجھ گیا تھا۔ یوں وہ اس کے غصے کو حق بجانب سمجھتا تھا پر یہاں تو سوال اس کی زندگی اور آبرو کا تھا۔ اس لیے ناراضی کی پرواہ فضول تھی۔ تب اس نے مدھم مگر صاف آواز میں کہا۔ ''سمعیہ مجھے

افسوس ہے مگر......''

اور وہ اپنی جگہ سے اچھلی، یوں جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو اور کرخت آواز میں اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔...... ''اگر مگر کا سوال نہیں۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ مجھے یہاں کس لیے لایا گیا ہے؟''

''بلبل سے تمہیں معلوم نہیں ہوا؟''......اس نے تحمل سے دریافت کیا۔

''اس فیصلے کا یہ حق کس نے آپ کو دیا تھا؟''

اس نے بوکھلا کر اسے دیکھا۔ دکھ اور پریشانی سے سوچا۔...... ''ایسا صرف تم ہی کہہ سکتی ہو۔ اس لیے کہ وہ باتیں جو سمجھنے کی ہوتی ہیں انہیں سمجھانا بیکار ہے۔ یہ درست ہے کہ یہاں نظریاتی اختلافات ہیں۔ خیالات میں بُعد ہے پر یہ عقلی و منطقی استدلال جذبوں کے سامنے تو کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔ تم مجھے ملنے والی چیز نہیں، پھر بھی میں نے تمہیں پسند کیا اور چاہا ہے، اب اس سلسلے میں تو میں بھی مجبور ہوں کہ تمہارے بارے میں کچھ سنوں اور تمہیں بچانے کے لیے کچھ نہ کروں۔''

وہ کمرے میں چکر کاٹتا رہا۔ پھر ٹھہرا۔ سر جھکائے کچھ دیر گہری سوچ میں ڈوبا اور پھر اس نے کہا۔...... ''میں معذرت خواہ ہوں سومی!''

''صرف معذرت خواہ؟ اجتبیٰ الرحمان! آپ مجھے اتنا بچہ نہ سمجھیے۔ میں آپ کی چالوں کو پہچانتی ہوں۔''

''کیا پہچانتی ہو تم؟''......وہ اس بار کسی قدر غصے سے بولا تھا۔

''یہی کہ آپ غدار ہیں۔ وطن دشمن ہیں اور مجھے اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے یہ سب کر رہے ہیں کیونکہ اپسو اور نیپ کے ساتھ ساتھ سٹوڈنٹس لیگ کو بھی ہماری پارٹی سے خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔''

اس نے سکون سے یہ سارے اعتراض سنے اور قہر برساتی اس کی آنکھوں کو دیکھا اور

شائستگی سے بولا...... ''خطابات کے لیے تمہارا شکریہ! پر کیا تم اپنے بارے میں بتانا پسند کرو گی کہ تم خود کیا ہو؟''

''میں؟''......وہ ہکلائی......''میں؟''

وہ اس کے قریب آیا۔ اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کے موٹے سیاہی مائل ہونٹوں پر زہر خند ہنسی پیدا ہوئی اور اس نے طنز سے کہا...... ''پریشان ہو گئی ہو؟ معلوم نہیں تو لو سنو! میں بتاتا ہوں، تم غاصب ہو۔''

''یہ غلط ہے، بکواس ہے۔ تم جیسے لوگوں کا غلط پروپیگنڈہ ہے۔''......وہ چلائی۔

وہ بائیں ٹانگ کو آہستہ آہستہ ہلاتا رہا، کچھ دیر خاموشی رہی، پھر اس نے کہا۔

''مجھے مغربی پاکستان بھجوانے کا کون سوچ رہا ہے؟''

''مَیں!''......اس نے مختصراً کہا۔

''کیوں؟''

''بلبل وضاحت کر چکا ہے۔''

''میں پوچھتی ہوں آپ میرے بارے میں اتنے فکر مند کیوں ہے؟ خطرہ اگر ہے تو مجھے ہے۔ محفوظ اگر نہیں تو وہ میری ذات ہے۔ آپ سے کس نے کہا تھا کہ مجھے یوں قید کر دیں؟''

اسے اس کا کوئی احسان اس وقت یاد نہ تھا۔ اس کا لہجہ تلخ تھا اور اس میں ناقابل برداشت چبھن تھی۔

پر اس نے اسے سہا اور آہستگی سے بولا۔

''تم حقائق بھولنے کی عادی معلوم ہوتی ہو۔ میرا خیال ہے کہ میرا باپ تمہارا لوکل گارجین ہے اور تم ہماری ذمہ داری ہو۔''

''میری ذمہ داری کا تو اس قدر شدید احساس ہے اور ملک کی ذمہ داری؟''......اس نے ایک اور تیر پھینکا۔

''اس کی ذمہ داری کے ہمیں قابل نہیں سمجھا گیا۔''

''قابل تو تھے پر یہ کہو کہ شرپسندی نے چھین لینے نہ دیا۔''

اس بار بھی وہ خاموش رہا۔ بوجھل سا سکوت طاری رہا تب اس نے میز پر رکھے ٹفن کو ہاتھ بڑھا کر اٹھایا جسے وہ اپنے ساتھ لایا تھا اور بولا۔...... ''تم بھوکی ہو، آؤ بھات کھاؤ۔''

''مجھے نہیں کھانا۔ میں واپس ہال جانا چاہتی ہوں۔''

اس نے پلیٹ میں کھانا نکالا۔ اس کے قریب گیا اور بولا۔...... ''بیوقوف نہیں بنتے، اٹھو۔''

اور جب اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا تو اسے اپنے جسم میں شدید سنسناہٹ کا احساس ہوا۔ اس نے ایک پل کے لیے اس کی طرف دیکھا۔ خاموش آنکھوں میں محبت بھی تھی اور خلوص بھی۔ اسے دوبارہ دیکھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ شکستہ سی آواز میں اس نے کہا۔...... ''میرا ہاتھ چھوڑیے۔''

وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے شانوں پر ہمیشہ بکھرنے والے بال چھوٹی سی چوٹی میں جکڑے ہوئے ہیں۔

ایک لمحہ کے لیے اسے خیال آیا۔ یہ کیا اس طرح میری توجہ منعطف کرنا چاہتا ہے، اس نے پھر اس کی طرف دیکھا۔ پر وہ ٹھوڑی کو ہتھیلی پر رکھے اپنے سامنے دیوار پر آویزاں تصویر دیکھ رہا تھا۔ سفید بُراق کرتے کے اوپر کے دو بٹن کھلے تھے جس میں سے اس کی چھاتی کا سیاہ جنگل بخوبی نظر آتا تھا۔

''سومی! اس کی آواز اسے کہیں دور سے آتی معلوم ہوئی۔...... ''تم نے مجھے اتنے عرصے میں شاید کچھ سمجھا ہی ہو۔ بہر حال اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہیں اپنے راستے سے ہٹانے کی چالیں چل رہا ہوں تو یہ محض تمہاری خام خیالی ہے۔ سیاست میں مَیں اتنے بھونڈے طریقے کا ہرگز قائل نہیں۔ تمہیں فی الواقع باہر شدید خطرہ ہے۔''...... اس کا لہجہ بہت دھیما تھا اور آواز میں

ٹھہراؤ تھا۔

اور اس لڑکی کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے تھے۔ ان آنسوؤں میں بے بسی تھی اور جب اس نے یہ کہا!...... ''شلپی! ملک سلامت رہے۔ زندگی کا کیا ہے؟ یہ ختم ہوتی ہے تو ہو، آبرو لٹتی ہے تو لٹے۔ میں نے تو سوچ لیا ہے۔ اسے سمجھ لیا ہے کہ عزت اور ذلت سبھی اسی کی طرف سے ہیں، وہی انہیں چھینتا ہے اور وہی بخشتا ہے۔''

تو اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کا غصہ یکسر ختم ہو گیا ہے۔...... ''اور رہا مجھے واپس بجھوانے کا سوال۔ اس نے قدرے توقف کے بعد کہا ''تو میں اس کا حق کسی کو نہیں دوں گی۔''

اور وہ کہنی پٹی پر ٹکائے، اب صرف یہ سوچ رہا تھا۔...... ''میں اس جنونی لڑکی کو جو کنویں میں گرنا چاہتی ہے کیونکر سمجھاؤں۔''

ساڑھے گیارہ بجے وہ اسے گھر لے جا رہا تھا۔ وہ اس معاملے کو اب ماں اور بابا کے سپرد کر دینا چاہتا تھا۔

گھر میں سب سو رہے تھے، صرف بُلبل جاگ رہا تھا، جس نے کار کی آواز سن کر فوراً دروازہ کھولا تھا۔ بُلبل شرمسار سا تھا۔

پر سمعیہ کے دل میں اس کے لیے ذرا برابر بھی میل نہ تھا۔ اُن تینوں میں سے بُلبل اسے یوں بھی بہت پیارا تھا۔

اگلی صبح جب وہ ابھی سو رہی تھی، یہ معاملہ ماں اور بابا کے سامنے رکھا گیا۔ ماں تو سنتے ہی بھڑک اٹھیں۔ فخر اور بینو نے بھی اپسو کو لعن طعن کیا۔ بابا دکھ سے بولے۔...... ''یہ ہیں منفی سیاست کے کرشمے۔''

''ان باتوں کو چھوڑیے۔ اس وقت اس مسئلہ کا فوری حل سوچنا ہے۔ شلپی بھیا اس کے بھائی کو بلوانا چاہتے ہیں۔''

اور ماں کا کلیجہ پھٹا۔ انہوں نے تو یہ بھلا ہی دیا تھا کہ اسے ایک دن یہاں سے جانا بھی

ہی خطرناک بات تھی تو تم اسے گھر لا سکتے تھے۔ کل جو اسے بے دردی سے تڑپایا گیا ہے تو اس میں کیا مصلحت تھی؟ اب اگر میں یہ کہوں کہ تمہارا مقصد اسے اذیت دینا تھا تو تمہیں غصہ لگے گا۔ پر یہ حقیقت ہے اور مجھے اس پر دکھ ہے جو کچھ تم نے کیا۔''

اور حقیقتاً اس نے اپنی ماں کو ان باتوں کا بہت برا منایا تھا۔ بھات کو ادھورا ہی چھوڑ کر وہ اٹھتے ہوئے خاصی تلخی سے بولا۔..... ''آپ نہ تو کچھ سمجھتی ہیں اور نہ ہی سوچتی۔ بس اعتراض کرنے سے مقصد ہے۔ آپ اسے کل گھر نہیں رکھ سکتی تھیں۔''

''بکواس کرتا ہے'' ..... یہ وہ خود سے بولی تھیں۔..... ''خود تو میرے کہنے میں نہیں رہا اور اسے بھی ایسا ہی سمجھتا ہے۔ لو بھلا میں کہہ دیتی اور وہ نہ رکتی۔''

صبح سے شام ضرور ہوئی پر اس شام کو لانے کے لیے وہ جس سولی پر چڑھی، اس نے اس کی بوٹی بوٹی دھنک کر رکھ دی تھی۔ ماں نے اسے سویرے ہی بتا دیا تھا کہ بابا اسے باہر جانے کو منع کر گئے ہیں۔ وہ خود معاملے کی چھان پھٹک کریں گے۔ ایک کراہ کے ساتھ اس نے سوچا تھا۔..... ''ایسا کب تک چلے گا؟''

برآمدے میں کھڑی وہ سامنے سڑک پر لوگوں کو آتے جاتے دیکھتی رہی۔ فضا میں اڑتے جیٹ فائیٹروں اور پی۔ آئی۔ اے کے فوکر طیاروں کو حسرت سے تکتی رہی۔ اس کے سینے سے گاہے گاہے ہوک سی اٹھتی۔ اس کے لب کانپتے، اس کی آنکھیں گیلی ہوتیں اور بے حد رقت بھری آواز میں وہ خود سے کہتی۔..... ''یہ یونہی اڑتے رہیں خدایا! ان کی عظمتوں کے پرتو یونہی نظر آتے رہیں۔''

پچھلے برآمدے میں مختلف فلیٹوں میں کام کرتی عورتیں نظر پڑتیں، وہ سوچتی کہ معلوم نہیں ان کے خیالات کیا ہیں؟ کیا انہیں بھی یہ احساس ہے کہ ہم نے انہیں لوٹ لیا ہے اور ہم غاصب ہیں؟

اور پھر وہ اپنے کمرے میں لوٹ آتی۔ بستر پر لیٹ جاتی۔ تب اسے روانگی کی رو ہنگیائی

نسل کی اس مسلمان لڑکی کی باتیں یاد آتیں جو ڈھاکا میڈیکل کالج میں اسے ملی تھی۔ جس کی افسردہ آنکھوں اور سفید ہونٹوں نے بار بار اس سے یہ سوال کیا تھا۔...... ''مسلمان کا وطنیت کا تصور اتنا گھٹیا کیوں ہوگیا ہے؟ ''مایو' میرا دیس تھا۔ میرا وطن تھا۔ میرے دادا پردادا کی ہڈیاں وہیں بنیں اور وہیں سڑیں۔ پر برما کی اشتراکی حکومت کی سختیوں نے ہمیں دیس بدر ہونے پر مجبور کردیا۔ ہم نے تو سوچا تھا کہ ہم دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے دامن میں پناہ گزین ہو گئے ہیں۔ پر یہاں آکر ہمیں احساس ہوا ہے ہم نے غلط جگہ چنی ہے۔ تم بتاؤ ہم کہاں جائیں؟ مسلمان کے لیے کون سی جگہ رہ گئی ہے؟

''واقعی اس نے سوچا۔ انسان نے مذہب اور تہذیب کا پیرہن تو یونہی پہن لیا۔ یہ تو ازلی خودغرض ہے۔ اس کی خودغرضی اور حرص نے دھرتی کو بلاوجہ ہی ٹکڑوں ٹکڑوں میں بانٹ لیا ہے، پر یہ ہے کہ اسے پھر بھی چین نصیب نہیں۔''

اس کا دماغ سوچوں سے نڈھال ہوگیا تھا۔ وہ اٹھی اور کچن میں آ گئی۔ ماں مسز احمد کے ہاں گئی تھیں۔ خالق کام کر رہا تھا۔ سکینہ دو ماہ ہوئے کام چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ وہ خالق سے باتیں کرنے لگی، وہ بھی وہی رونا رو رہا تھا کہ ہمیں مغربی پاکستان نے لوٹ لیا ہے، کھا لیا ہے۔ وہ حیرت سے گُنگ اسے دیکھتی رہی۔ معصوم ذہنوں کو کس طرح مسموم بنایا جا رہا ہے۔ وہ کچھ نہ بولی، پر اس نے شدت سے چاہا کہ اگر اس کے پاس طاقت ہوتی تو وہ یحیٰی خان کو دھکا دے کر کسی نالی میں پھینکتی اور خود ایسے لادینی اور فاشٹ عناصر کی سرکوبی کے لیے دین کے گھوڑے پر چڑھ دوڑتی۔

اور اپنی اس خواہش پر وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس دی۔

مغرب کی نماز پڑھ کر جب وہ باہر آئی، بابا آچکے تھے۔ اپنے پاس بٹھا کر انہوں نے محبت سے اسے بتایا کہ وہ اس کی پارٹی کے چند سرکردہ لیڈر رہنماؤں سے مل کر آ رہے ہیں۔ صورتحال مخدوش ہے اور اسے ابھی چند دن گھر سے باہر نہیں نکلنا۔

اس نے خاموشی سے سر جھکائے ان کے فیصلے کو سنا۔

رات کھانے کی میز پر اس نے ماں کو کچھ زیادہ ہی پریشان دیکھا۔ بلبل بھی اداس تھا، فخر اور بینو بھی چپ چپ سے تھے۔ اسے خیال آیا۔ کیا یہ سب میری وجہ سے ہے؟ میں اس گھر کی خوشیوں میں حائل ہو رہی ہوں اور بھات کے جو چند نوالے حلق سے اترنے تھے وہ بھی نہ اترے۔ وہ بس پانی ہی پیتی رہی۔

اور جب وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ ان کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے جنہیں دیکھ کر وہ بولے تھے...... ''غوشی! حوصلہ کرو اسے تو ایک دن جانا ہی تھا، وہ کوئی تمہاری چیز تھی۔''

''پر میں اسے ایسے تو کبھی نہ بھیجتی۔''

اور تیج گاؤں کے ہوائی اڈے پر گیلری میں کھڑے اجتبیٰ الرحمان کو عجیب سی گھبراہٹ ہوئی تھی۔ اس کا دل اس سے تیزی سے دھڑک رہا تھا اور نامعلوم سی خلش کا اسے شدید احساس ہوا تھا جب اس نے اس لڑکی کے اکلوتے بھائی کو بوئنگ 707 میں سے نکلتے دیکھا۔

پر وہ مسکرایا تھا اور جب وہ اس سے گرم جوشی سے مصافحہ کر رہا تھا، اسے خود محسوس ہوا تھا کہ اس کے ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔

وہ اسے لیے پی۔ آئی۔ اے کے ریفریشمنٹ روم میں آ گیا جہاں گرم گرم خوشبودار چائے پیتے ہوئے اس نے آہستہ آہستہ اسے تمام حالات سنائے۔

اور وہ گندمی رنگت والا نوجوان جو بنگال آنے کا ہمیشہ سے متمنی تھا، اس وقت اس دیس کی سڑکوں پر اڑا جا رہا تھا۔ پر اس نے باہر کے کسی بھی نظارے کو رغبت سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کا دماغ الجھا ہوا تھا اور وہ بے حد پریشان تھا۔

اور ماں نے جب اس سے یہ کہا...... ''اٹھو بیٹی! تمہارا بھائی آیا ہے۔''...... تو وہ جو کچھ سوتی اور کچھ جاگتی تھی، ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی...... ''کون سا بھائی؟''...... اس نے حیرت سے پوچھا۔

''تمہارا اپنا بھائی بیٹی!''

اس نے چپل پہنی۔ ساڑھی کا آنچل درست کیا۔ اک ذرا دیر کو رکی، اس کا بے حد لاڈلا چہیتا بھائی، جو اس دنیا کی طرف سے آیا تھا جسے وہ بھول بیٹھی تھی۔

اس نے اپنے بازو پھیلائے جن میں وہ سمائی ضرور پر دل کا سارا درد دل ہی میں رہا۔ نہ وہ چیخی اور نہ ہی اس کی کوئی سسکی نکلی۔

دن کا بقیہ حصہ اور رات قیامت کی تھی۔ وہ یکسر نڈھال ہو کر بستر پر پڑ گئی تھی۔ ماں بولائی بولائی پھر رہی تھیں۔ شام ہو گئی تھی۔ اس کا بھائی، بابا اور فخر کے ساتھ باہر گیا ہوا تھا۔ ماں باورچی خانے میں کھانے پکانے میں لگی ہوئی تھیں۔ جب وہ گھر آیا اور اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے لائٹ آن کی اور سوئچ پر ہاتھ رکھے ساکت کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ زندگی میں پہلی بار اپنی محرومی کا شدید احساس ہوا۔ حسرتوں کا دھواں اس کے سینے سے آنکھوں میں پہنچ گیا۔ حسن ہمیشہ ہی میرے آگے پیچھے رہا پر رغبت ہی نہ ہوئی اور جو ہوئی تو اس سے جو مل ہی نہیں سکتی اور جسے اب دیکھنا بھی شاید ممکن نہ رہے۔

پر سمعیہ علی! میں تمہیں کبھی یہ نہ بتاؤں گا کہ تم میرے لیے کیا بن چکی ہو۔ تمہاری اس چاہت میں میں نے وہ بھی سوچا جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں یقیناً اس جگہ سے اپنا ناطہ قائم رکھنا چاہتا ہوں، جہاں تم بستی ہو پر میں دو دھاری تلوار کی زد میں ہوں جس سے بچنا اب ممکن نہیں۔

وہ اس کے قریب آیا، اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ یہاں شکست تھی، ہار تھی، ویرانی تھی۔ وہ اس کا طنطنہ، شوخی اور غصہ، سبھی ختم تھے۔ اس نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ رکھا اور بولا...... ''سمعیہ! ڈاکٹر غزالی کو بابا کے کہنے پر بلایا گیا ہے۔''

اس نے خاموشی سے بس دیکھا۔ اس کے ہونٹ بدستور بند رہے۔

''سمعیہ کچھ بولو، کچھ کہو۔''

اس آواز میں درد تھا، تڑپ تھی۔ پر اس میں پھر بھی حرارت پیدا نہ ہوئی۔ وہ ٹکر ٹکر اسے دیکھتی رہی۔

تب وہ جھکا۔ اس کی گرم سانسیں اس کے چہرے سے ٹکرائیں، اس کی آنکھوں کا سارا جنون اس کی آنکھوں میں منتقل ہوا تو اس نے ڈوبتی آواز میں کہا تھا۔

''کیا کہوں؟ کہنے کو تو بہت کچھ ہے، تم سنو گے؟''

''ہاں! ضرور سنوں گا۔''

تمہارے ساتھ بہاروں کے کچھ دن گزرے۔ برستی برکھاؤں کا حسن بھی تمہاری معیت میں دیکھا۔ چمکتی صبحوں میں تم میرے ساتھ تھے اور ٹھٹھرتی شاموں میں بھی میں نے تمہیں اپنے قریب پایا۔ تم اور میں جو ایک جسم کے دو حصے ہیں۔ اجتبیٰ الرحمان بتاؤ! بہار کے کسی خوشگوار جھونکے، برکھا رُت کی کسی چمکیلی گھٹا یا کسی سہانی شام کی سنہری کرن نے مجھے اگر تنہا دیکھا تو کیا کہیں گی کہ تم اس قابل نہ تھے کہ ساتھ رہتے یا مجھ میں یہ اہلیت نہ تھی کہ تمہیں اپنے سے جدا نہ کرتی اور اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکلے جو اس کی ساڑھی پر گرے اور اس میں جذب ہو گئے۔

تب وہ ایک کے بعد ایک سیڑھیاں اترتی گئی اور جب وہ سب اتر آئی۔ اس نے پلٹ کر انہیں دیکھنے کی کوشش نہ کی۔ ڈھاکا یونیورسٹی، رقیہ ہال، ٹی۔ ایس۔ سی سنٹر، رمنا ریس کورس، انٹر کانٹی نینٹل، ریڈیو اسٹیشن، وہ ان سب جگہوں کو پیچھے چھوڑ آئی تھی۔

اور یہ! ایروڈرم تھا۔ اس نے رُخ پھیرا، گرد و پیش کو ایک نظر دیکھا۔ یہ سب میرا تھا، پر ان سے میرا یہ تعلق آج ختم ہوا۔ یہاں صرف تنکے رہ گئے ہیں جن سے امیدیں وابستہ رکھنی حماقت ہے۔ نوشتۂ دیوار صاف اور خوشخط ہے اور اسے بخوبی پڑھا جا سکتا ہے۔''

اس نے ان سب کو دیکھا۔ وہ سب جو اجنبی تھے، پر جنہوں نے اپنی محبت میں اُسے شریک کیا تھا۔

اس کی آنکھیں پتھر کی ہو گئی تھیں اور دیکھنے والوں کو ان میں دنیا لٹتی نظر آ رہی تھی۔ وہ

ماں اور بابا کے قدموں میں جھکی، اس نے انہیں چھوا۔ ماں کی آنکھوں سے آنسو نہ تھمتے تھے۔ بابا بھی دل گرفتہ سے تھے۔ وہ بینو کی طرف بڑھی، اس کی پیشانی پر اس نے پیار کیا۔ فخر اور بُلبل کے شانوں پر اس نے بوسے دیے۔ پر اس کے ہونٹ سلے رہے اور آنکھیں خشک۔

وہ ایک پل کے لیے شلپی کے سامنے ٹھہری۔ پھر مڑی، اپنے بھائی کا بازو پکڑے وہ رن وے پر چلتی گئی۔

اور جب اس نے سیٹ پر بیٹھ کر سر کو بیک سے ٹکایا، اسے اپنے سینے میں شدید تکلیف کا احساس ہوا تھا۔

''میری روح زخمی ہے، ذہن بیمار اور جسم شکستہ ہو چکا ہے۔''

اور وہ ڈوبتی چلی گئی۔ اس کی کھلی آنکھوں سے چمک دھیرے دھیرے ختم ہو گئی اور جسم ٹھنڈا پڑتا گیا۔

اور اس کا اکلوتا چہیتا بھائی اس کی حالت سے یکسر بے خبر، حفاظتی پیٹی اس کے گرد کسنے میں محو تھا۔

اور کار چلاتے ہوئے اس نے یکدم زور سے بریکیں لگائیں۔ دروازہ کھول کر وہ باہر نکلا اور پچھلی سیٹ پر بیٹھے اپنے بھائی، جس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، سے بولا۔ فخر آگے جاؤ اور گاڑی چلاؤ۔

ایک طویل عرصے کے بعد اس نے اپنی ماں کے شانے پر سر رکھا تھا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی، جب اس نے کہا تھا...... ''ماں! دیکھو تو ذرا باہر۔ ڈھاکا تو اُجڑا اُجڑا لگتا ہے۔''

- سلمٰی اعوان اپنے ناول ''تنہا'' میں جس فنی مہارت کے ساتھ قومی لحاظ سے ایک نہایت اہم موضوع سے جس حُسن و خوبی سے نمٹی ہیں اُس کی مثال ہمارے نثری ادب میں بمشکل دستیاب ہے۔ (احمد ندیم قاسمی)

- مَیں اور بانو اس عظیم ناول کے دل سے قائل ہیں۔ سانحۂ مشرقی پاکستان پر ڈھیر سارا مُلکی اور غیر مُلکی مواد پڑھ چکنے کے بعد اگر آپ تحیر کے عالم میں ہیں تو تھوڑا سا وقت نکال کر ''تنہا'' ضرور پڑھیئے۔ آپ پر ساری صورتِ حال واضح ہو جائے گی۔ (اشفاق احمد)

- مَیں اعتراف کرتی ہوں کہ سلمٰی کا ناول ''تنہا'' پڑھ کر میرا جی چاہا کہ کاش میں بھی جذبوں کے آویزش کا ایسا خوبصورت ناول لکھ سکتی۔ (بانو قُدسیہ)

- سلمٰی اعوان شاید پہلی ناول نگار ہیں جنہوں نے سانحۂ مشرقی پاکستان کو تاریخی سیاق سے دریافت کیا۔ (ڈاکٹر انور سدید)

- سلمٰی اعوان کا ناول ''تنہا'' تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ (بشریٰ رحمٰن)

- اِس ناول میں ایک پیغام ہے۔ (فرخندہ لودھی)

- ''تنہا'' سیاسی شعور کا احساس دلاتا ہے۔ سلمٰی اعوان نے سچائی کے ساتھ تلخ حقیقتوں کو بیان کیا ہے۔ (سائرہ ہاشمی)

- مجھے پاکستانی ادیبوں سے بڑی شکایت ہے کہ انہوں نے مشرقی پاکستان پر بہت کم لکھا۔ ''تنہا'' ملی تو خوشی ہوئی، پڑھی تو حیرت ہوئی۔ ایک خاتون نے کمال جرأت سے حقیقتوں کو عریاں کر دیا ہے۔ (صدیق سالک)

- ''تنہا'' میں جو تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ وہ بہت اہم ہے۔ (الطاف حسن قریشی)

- ناول ''تنہا'' المیۂ مشرقی پاکستان کی ایک تاریخی دستاویز ہے۔ (اسرار زیدی)

- سلمٰی اعوان کا ناول ''تنہا'' رُوح کو تڑپا دینے والا ناول ہے۔ (بیگم ممتاز شفیع)